

تذکرہ معاصرین

جلد اول

مالک رام

مکتبہ جانتی دہلی

اشتراک

پیشکش کنندہ: مولانا ابوالکلام آزاد

تذکرہ معاصرین

جلداول

مالک رام

مکتبہ جانی دہلی

اشتراک

بقومی نصاب کے فروع اور جزئیات پر

Tazkira-e-Munasereen

by
Malik Ram

Rs.136/-



صدر دفتر

011-26987295 ☎

مکتبہ جامعہ لٹریچر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

011-23260668 ☎

مکتبہ جامعہ لٹریچر، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006

022-23774857 ☎

مکتبہ جامعہ لٹریچر، پرس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003

0571-2706142 ☎

مکتبہ جامعہ لٹریچر، بیچنور علی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002

011-26987295 ☎

مکتبہ جامعہ لٹریچر، بھوپال گروٹھ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

قیمت: 136/- روپے

تقدیر: 1100

مختصات: 2011

سلسلہ مطبوعات: 1541

ISBN : 978-81-7587-688-3

ناشر: ڈاکٹر قادی خان، جامعہ نگر، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، اردو کونسل، نئی دہلی۔ 110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: ستمبر 2011ء، سسٹم: 715-716، اردو کونسل، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110035

اس کتاب کی پمپل میں GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

کارکنین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لیٹنڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاعرانہ روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۳۳ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد درگرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی ساتھ ہوا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر بھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی ہیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”درسی کتب“ اور ”معیاری میر“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ دوسرے چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ قفل پھٹا ہوا گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھل چکی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب ہلکے نایاب ہوتی چارہاں قصص شائع ہو چکی ہیں۔ ذریعہ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو سمندر سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لیٹنڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عمل اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آجندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

نجیب جنگ، ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لیٹنڈ

تعارف

بعض احباب کے تعاون سے ۱۹۶۶ء کے اوائل میں دہلی میں علمی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے پہلے مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ کبھی کبھی مل بیٹھیں، جب کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر تبادلہ خیالات کیا جاسکے۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ مجلس اپنا رسالہ بھی شائع کرے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق تاہی اتھری، ۱۹۶۷ء میں جاری کیا گیا؛ اس کی ترتیب میرے سپرد ہوئی۔ ابھی ایک ہی شمارہ شائع ہوا تھا کہ لکھنؤ میں میرزا جعفر علی خاں اثر کا انتقال ہو گیا۔ میر ان کے برسوں کے تعلقات تھے، جیسا کہ ان کے ان کے مختصر حالات تحریر میں شائع کر دوں۔ ابھی اودھ کر ہی رہا تھا کہ رفیق مارہروی کے بھی انتقال کی خبر موصول ہوئی؛ یہ بھی میرے طے دے گئے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ اچھا، ان کے بھی ہیں۔ بد قسمتی سے وہ تاہی ختم ہوتے ہوئے چار پانچ صاحب دماغ مفارقت دے گئے؛ اور میں نے ۱۹۶۷ء کی دوسری تاہی کے شمارے میں ان سب کے مختصر حالات شائع کر دیے۔ یوں گویا تحریر میں دفیات کے مستقل باب کا اضافہ ہو گیا۔

یہ فیصلہ کسی بڑی ہی بڑی گھڑی میں ہوا تھا۔ وہ دن، اور آج کا دن؛ اس کے بعد شاید ہی کوئی تاہی ایسی گذری ہو، جس میں کسی نہ کسی مرحوم کے حالات مجھے نہ لکھنا پڑے ہوں۔ جب خیال کرتا ہوں کہ ان پانچ برس میں ستر سے زیادہ اہل علم قلم ہم سے جدا ہو گئے

ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جو جاتا ہو، اپنی جگہ کچھ اس طرح سے خالی کر جاتا ہے کہ پھر کوئی اسے کا حقہ پر نہیں کر سکتا۔ کہنے کو تغالبِ خستہ کے بغیر کوئی کام بند نہیں۔ اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ موت ابنِ آدم کی میراث ہے؛ جو پیدا ہوا ہے، اسے ایک ذایک دن ضرور مرنا ہے۔ آج وہ کل ہماری بادی ہے۔ لیکن ہم میں سے کس کی خواہش نہیں ہوتی کہ کاش تغالبِ کوئی دن اور زندہ رہتے، تاکہ نہ صرف ہم خود ان سے مستفید ہو سکے، بلکہ وہ اپنے علم و فضل، گفتار و کردار سے نئی نسل کو بھی روشنی دکھاتے، جس سے ہماری ذہنی اور اخلاقی اقدار اور زندگی کا تسلسل قائم رہتا۔ اس سے نہ صرف ان کی جذباتی اور روش کے صدمے کی شدت کم ہو جاتی، بلکہ یہ اطمینان بھی رہتا کہ جس کام کے لیے وہ نیسے، اور جو راہ انہوں نے دکھائی، اس کام کے کرنے والے اور اس راہ پر چلنے والے اب بھی موجود ہیں۔

میں نے حتی الوسع حالات کی صحت سے متعلق اطمینان کر لیا ہے۔ میری اپنی یادداشت تو ہے ہی کیونکہ خوش قسمتی سے اس دور کے بہت سے اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ کم و بیش یادداشتیں بھی رکھی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے بالعموم مرحومین کے پسپا نہ گان اور دوست احباب سے بھی استمداد کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ بے عیب اور غلطی سے ہر اذات تو صرف خدا کی ہے، اس لیے کمالاً صحت کا دعویٰ غلط ہو گا۔ لیکن اس طرح سے جتنا کچھ جمع کر سکا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس میں سقم کے راہ پاجا کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔

اردو میں تذکرہ نوہ کسی کی روایت بہت پرانی ہے۔ شروع میں ان تذکروں کی حیثیت بیاض سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ تذکرہ نگار کی بیشتر توجہ اشعار کے جمع کرنے پر رہتی تھا۔ انشا اور وہ بھی ایک آدھ سطر میں لکھ دیے جاتے تھے۔ جو جوں و ذلت گزر رہا گیا، حالانکہ مختصر تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن قدیم تذکروں کی وہی مختصر یادداشتیں آج تاریخ اور

کا خام مواد ثابت ہو رہا ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کہیں قدمانے یہ تذکرے مرتب نہ کیے ہوتے، تو تاریخ ادب کی تکمیل کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔

ادھر بہت دن سے کوئی قابلِ قدر تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ معاصرین کے حالات سے خاص کر بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ میرے علم میں ان کے متعدد حالات کہیں جمع نہیں ہو رہے ہیں۔ اس طرح جو خلا پیدا ہو رہا ہے، اس کے اثرات آج تو نہیں، زیادہ گزرتے کے ساتھ عسوس ہو گئے، جب مؤرخ ادب اس دور کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کریگا۔ اس وقت اسے ان اصحاب کے حالات جمع کرنے میں جو وقت پیش آئیگی، اس کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ اساتذہ متقدمین دسترسطین سے متعلق کتنی معلومات اور تفصیلات ہیں، جن کی کھوج میں آج ہم سرگرداں ہیں۔ اگر حسن اتفاق سے کہیں سے کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے، تو ہمیں کتنی مسرت ہوتی ہے، اور دریافت کرنے والے کو کتنا فخر۔ جو اسانیاں ہیں میسر ہیں، وہ بعد کے مؤرخ کی دسترس سے باہر ہونگی۔ اس سے بھی جاری ذمے داری بڑھ گئی ہے۔

اسی خیال سے میں نے مروجین کے حالات، جہاں تک ہو سکا، پوری تھخیل سے قلمبند کر دیے ہیں۔ ممکن ہے، کسی صاحب کے نزدیک بعض تفصیلات غیر ضروری ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والا مؤرخ ان کی قدر کو گنا اور اس سے اس کا کام بہت آسان ہو جائیگا۔ دنیات میں شائع شدہ حالات کے کتابی شکل میں نقل کرنے کا فیصلہ ہوا، تو میں نے ان پر نظر ثانی کی۔ جہاں کہیں کوئی کھانا نظر آیا، اُسے پر کرنے کی کوشش کی۔ جن اصحاب کی نظر سے یہ مضمون "تحریر" میں گذر چکے ہیں، وہ بھی مقابلہ کرنے پر بہت فرق پائیگی، انہیں کئی مقامات پر اضافہ ملے گا، اجمال کی جگہ تفصیل نظر آئیگی۔ دو ایک نام کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ جن کے حالات پہلے لکھنے سے رہ گئے تھے، نیز میں نے خیال کیا کہ ان میں جو شاعر حضرات تھے، اگر ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کر دیا جائے، تو اس سے

استغفار ہے اور دلچسپی کا دائرہ وسیع تر ہو جائیگا۔ یہ بجائے خود بہت محنت طلب کام تھا۔
بارے یہ بھی ہو گیا۔ فالرٹھ۔

میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے مختلف شعرا کے حالات اور دوا دین چٹیا
کرنے میں مدد فرمائی۔

مالک رام

نئی دہلی

۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

فہرست

بترتیب حروف تہجی

۲۸۰	باسط اوہینی، نیاز محمد خان	۱۹۳	آر بری، آر قمریان
۳۱۰	بشیر احمد (میاں)	۲۷۱	آغا گلش، طقیل احمد
۱۳۲	بنجود، عباس علی خان	۳۸	آفتاب پانی پتی، انوپ چند
۲۵۱	بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ	۲۸	اثر لکھنوی، بعض علی خان
۹۲	پردیز شادی، محمد اکرام حسین	۹۵	احمد شجاع، حکیم
۱۹۲	ساج لاہوری، امتیاز علی	۳۱۳	اختر تھری، اختر علی
۳۲۷	شکین قریشی، محمد حسین	۲۰	انگرفیروز پوری، نند کشور
۱۸۱	جامی حیدر آبادی، خود شیدا احمد	۲۶۳	اسرار احمد آناد
		۳۷۳	افقر مورانی، دارش، تید محمد حسین
		۱۲۳	الم منظر نگری، محمد اسحاق
		۸۰	امین حزی، محمد سیح پال
		۱۵۸	انتظام اللہ شہابی، مفتی

۳۲۸	حبیب اشرف دہلوی، حبیب احمد	۱۰۹	شاد، نریش کمار
۲۳۶	حق حرم برٹھی، توفیق الحق	۲۸۳	شامل چھوڑی، اختر اسم الدین
۲۵۲	غیر مجبوری، ابوالخیر	۲۳۸	شامل قادری، محمد شامل
۲۷۵	دیابر دہلوی، ارائن داس ٹنڈن	۲۵	شاہد احمد دہلوی
۹۷	فاکر حسین، فاکٹر	۷۲	شفا گوایاری، محمد حسن
۲۵۵	راز بگلوی، سید شریف الحسن	۱۹۹	شکیل بدایونی، شکیل احمد
۱۵۳	راز ہانڈ پوری، محمد صادق	۵۳	صولت ٹوٹی، محمود الحسن عرب
۲۲	رفیق مارہروی، رفیق احمد	۲۱۸	ضیاء القادری، بدایونی، محمد یعقوب
۲۹۷	روح صدیقی، شاہد عزیز	۲۵۷	طالب کشمیری، ندلال کول
۱۷۰	رئیس احمد جعفری	۲۸۹	عابد لاہوری، عابد علی
۳۷۰	سامی، مہادیو پرشاد	۳۹۲	عارف عباسی، بیادوی، محمد عثمان
۳۲	سددشن (مہاشہ)، بدی ناتھ	۱۸۸	عبدالشکور
۳۳	سراج کھنوی، سراج الحسن	۳۱۳	عبد القادر سروری
۲۳۸	سلیمان اریب، محمد	۲۰۵	عتیق جعفری، عتیق احمد
۲۸۲	سید عبداللطیف	۳۹	علی بہادر خان (حافظ)
۳۰۷	تیدین، خواجہ غلام السیدین	۱۹۱	علی عباس حسینی

تذکرہ مسامرین

۸۹	محمد قسطنطینی خان شیرانی	۱۳۳	غزالیب شادانی، وجاہت حسین
۲۵۷	مصطفیٰ زیدی، مصطفیٰ حسین		
۳۹۷	منظر مدنی، ششاد حسین	۵۹	فرحت دلہوی، پریم شکر
۲۰۸	منتہد لکھنوی، بشیشور پرشاد	۷۰	فقیر سید وحید الدین
۳۹۸	مہر، غلام رسول	۱۷	فلک لاہوری، لالہ چند
۲۹۹	باشاد کانپوری، مری دھرم پرادھم	۳۱۹	قیس بناری، شیو مودت لال
۱۱۷	باطل محمد گلاوٹھوی، تیدا ابوالحسن		
۱۳۱	ناظر اکوڑی، شیر احمد طوی	۲۱۸	ناچس لکھنوی، میرزا محمد اقبال
۸۵	نجیب اشرف مدوی	۱۶۸	محمد اجل خان، پردیس
۳۵	نذر تاجا حیدر	۳۳	محمد حبیب، پردیس
		۵۱	محمد مہد ابائی
۱۷۵	واقف مراد آبادی، بیوقوف الحسن	۱۳۷	محمد محمد دم محمد الدین، ابوسعید

وکیل اشرف، وکیل اسماعیل خان ۳۰۷

فہرست بترتیب تاریخ وفات

نام / تخلص	مقام وفات	تاریخ وفات	صفحہ
فلک، لال لال چند	دلی	۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء	۱۷
اعلیٰ فیروز پوری، نند کشور	فیروز پور	۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء	۲۰
شاہد احمد دلہوی	کمرہ	شب ۲۶/۷ مئی ۱۹۶۷ء	۲۵
اثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان	لکھنؤ	۶ جون ۱۹۶۷ء	۲۸
نزد تجا حیدر	بمبئی	۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء	۳۵
علی بہادر خان، حافظ	دلی	شب ۶/۵ نومبر ۱۹۶۷ء	۳۹
مہاشیر سدرشن، بدایا تھ	بمبئی	۱۴ دسمبر ۱۹۶۷ء	۴۲
سراج لکھنوی، سراج الحسن	لکھنؤ	۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء	۴۳
آفتاب پانی پتی، انوپ چند	پانی پت	۹ فروری ۱۹۶۸ء	۴۸

مذکرہ سامعین

۵۱	۶۱۹۶۸	۲۳	فروری	دلی	محمد عبدالباقی
۵۳	۶۱۹۶۸	۲۹	مارچ	ٹونک	صولت ٹونگی، محمود الحسن عرب
۵۹	۶۱۹۶۸	۲۰	اپریل	میرٹھ	فرحت دلہوی، پریم شنکر
۶۲	۶۱۹۶۸	۵	مئی	سکلتہ	پرویز شاہدی، محمد اکرام حسین
۷۰	۶۱۹۶۸	۲۰	جولائی	کمرچی	فیض تہجد، وحید الدین
۷۲	۶۱۹۶۸	۲۳	جولائی	بھوپال	شفا گوایاری، تہ محمد حسن
۸۰	۶۱۹۶۸	۱۳	اگست	سیالکوٹ	امین حسین، خواجہ محمد مسیح پال
۸۵	۶۱۹۶۸	۵	ستمبر	بمبئی	نجیب اشرف ندوی (دیتہ)
۸۹	۱۹۶۸	۶	دسمبر	علی گڑھ	محمد مقدس خان شروانی

۹۵	۶۱۹۶۹	۳	جنوری	لاہور	حکیم احمد شجاع
۹۷	۶۱۹۶۹	۳	مئی	نئی دلی	ڈاکٹر فاکر حسین
۱۰۹	۶۱۹۶۹	شب ۲۱/۲۰	مئی	نئی دلی	شاد زمیں کمار
۱۱۷	۶۱۹۶۹	شب ۲۶/۲۵	مئی	ناگپور	ناظم محلہ ڈٹھوی، تہ عبدالحسن
۱۲۳	۶۱۹۶۹	۲۸	مئی	منظفر نگر	الہ مظفر محسینی، محمد اسحق
۱۳۱	۶۱۹۶۹	۱۷	جولائی	کھنٹو	ناظر کاکوروی، بشیر احمد طوی
۱۳۳	۶۱۹۶۹	۲۹	جولائی	ڈھاکا	عندلیب شادانی، وجاہت حسین
۱۳۴	۶۱۹۶۹	۶	اگست	سکلتہ	بینخورد، عباس علی خان
۱۳۷	۶۱۹۶۹	۲۵	اگست	دلی	ابوسعید محمد مقدم محی الدین
۱۵۳	۶۱۹۶۹	۲۵	اگست	چاندپور	راز چاندپوری، محمد صادق
۱۵۸	۶۱۹۶۹	۸	ستمبر	کمرچی	انتظام اشد شہبانی، ہفتی

سفر کرمہ ساری

۱۶۱	۱۹۶۹ء	۲۷ ستمبر	لکھنؤ	علی عباس حسینی دیند
۱۶۳	۱۹۶۹ء	۲ اکتوبر	اسکفرڈ	آرہری آر تھر جان (پروفیسر)
۱۶۸	۱۹۶۹ء	۱۸ اکتوبر	نئی دہلی	محمد امل خان، پروفیسر
۱۷۰	۱۹۶۹ء	۲۸ اکتوبر	لاہور	رئیس احمد جعفری
۱۷۵	۱۹۶۹ء	شب ۱۵/۱۶ دسمبر	دہلی	واقعہ مراد آبادی، سید یعقوب حسن

۱۸۱	۱۹۷۰ء	۸ مارچ	حیدرآباد	جائی حیدر آبادی، خورشید احمد
۱۸۸	۱۹۷۰ء	۱۸ مارچ	بریلی	عبدالشکور پروفیسر
۱۹۲	۱۹۷۰ء	۱۹ اپریل	لاہور	ساج، سید امتیاز علی
۱۹۹	۱۹۷۰ء	۲۰ اپریل	بمبئی	فکھل بدایونی، فکھل احمد
۲۰۸	۱۹۷۰ء	۲۳ مئی	دہلی	منور لکھنوی، بشیر شہزاد
۲۱۸	۱۹۷۰ء	۱۵ اگست	کراچی	ضیاء القادری بدایونی، محمد یعقوب
۲۲۸	۱۹۷۰ء	۲۶ اگست	لکھنؤ	ماہی لکھنوی، میرزا محمد اقبال
۲۳۸	۱۹۷۰ء	۷ ستمبر	حیدرآباد	سلیمان اربیب حیدر آبادی
۲۳۹	۱۹۷۰ء	۲۰ ستمبر	میرٹھ	مئی حزمین میرٹھی، توفیق الحق
۲۵۱	۱۹۷۰ء	۲ اکتوبر	بیکانیر	بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ
۲۵۷	۱۹۷۰ء	شب ۱۲/۱۳ اکتوبر	کراچی	مصطفیٰ زیدی، مصطفیٰ حسین
۲۶۳	۱۹۷۰ء	۲۰ نومبر	ڈیرہ دکن	اسرار احمد آزاد
۲۶۶	۱۹۷۰ء	۵ دسمبر	کانپور	ناشاہ کانپوری، سری دھرم پشادگم
۲۷۱	۱۹۷۰ء	۱۶ دسمبر	بمبئی	آغا خٹن کاشمیری، طفیل احمد
۲۷۵	۱۹۷۰ء	۱۶ دسمبر	بریلی	ویا بریلوی، نارائن داس ٹنڈن

تذکرہ سامریں

باسمہ اوستی، نیاز محمد خان | ادوین | ۱۷ دسمبر | ۱۹۷۰ء | ۲۸۰

۲۸۳	۱۹۷۱ء	۱۸ جنوری	جسپند	شاغل جسپوری، احترام الدین احمد شانی
۲۸۹	۱۹۷۱ء	۲۰ جنوری	لاہور	عابد لاہوری، سید عابد علی
۲۹۷	۱۹۷۱ء	۲ جنوری	شاہجہاںپور	روش صدیقی، شاہ عزیز
۳۰۵	۱۹۷۱ء	شب ۲۷/۲۸ جنوری	کراچی	عتیق جعفری، سید عتیق احمد
۳۰۷	۱۹۷۱ء	۹ فروری	کلکتہ	دکیل اختر، دکیل احمد اختر خان
۳۱۰	۱۹۷۱ء	۲ مارچ	لاہور	میان بشیر احمد
۳۱۳	۱۹۷۱ء	۱۱ مارچ	سرشگر	عبد القادر سردری، پروفسر
۳۱۹	۱۹۷۱ء	۲ اپریل	بنارس	قیس بناری، منشی شیو مورت لال
۳۲۳	۱۹۷۱ء	۲۱ اپریل	لکھنؤ	اختر تلہری، تیدا اختر علی
۳۲۸	۱۹۷۱ء	۱۵ جون	لاہور	حبیب اشعر و لوی، حکیم حبیب احمد
۳۳۱	۱۹۷۱ء	۲۳ جون	علی گڑھ	محمد حبیب، پروفسر
۳۳۷	۱۹۷۱ء	۲۳ جون	آگرہ	تسکین قریشی، محمد حسین
۳۳۸	۱۹۷۱ء	۱۹ جولائی	پنجواہ	شاغل قادری، سید محمد شاغل
۳۵۲	۱۹۷۱ء	۱۷ جولائی	بہارہ	غیر سمجھدی، ابوالخیر
۳۵۵	۱۹۷۱ء	۱۰ اگست	بلگرام	راز بلگرامی، سید شریف الحسن
۳۵۷	۱۹۷۱ء	۱۳ ستمبر	سرشگر	طالب شمیری، پنڈت نند لال کول
۳۶۲	۱۹۷۱ء	۲۶ ستمبر	میرٹھ	عادت عباسی، محمد عثمان بیادی
۳۶۷	۱۹۷۱ء	۲ اکتوبر	کراچی	منظر صدیقی، شمس الدین
۳۷۰	۱۹۷۱ء	۲ اکتوبر	جلیپور	سامی، بہادر پورشار

سند کردی معاصرین

۲۷۳	۶۱۹۷۱	۲	نمبر	لکهنؤ	افترمودانی داری، سید محمد حسین
۳۸۲	۶۱۹۷۱	۳	نمبر	سید آباد	سید عبداللطیف، ڈاکٹر
۳۹۸	۶۱۹۷۱	۱۶	نمبر	لاہور	مہر، مولانا غلام رسول
۴۰۰	۶۱۹۷۱	۱۹	نمبر	نئی دہلی	سیدین، خواجہ غلام السیدین

فلک، لالہ لال چند

۱۳ جنوری ۱۸۸۷ء کو اپنے آبائی وطن یعنی ضلع گوہر نوالہ (پنجاب) پاکستان کے مشہور قصبے حافظ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کی لاہور میں غلے اور اناج کی دکان تھی۔ چنانچہ ان کا بچپن اور تعلیمی زمانہ یہیں گزرا۔ ۱۹۰۳ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کسب معاش کے لیے ملازمت اختیار کی اور چیف انجینئر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز افسرانے دیسی ماتحتوں سے بہت درشتی اور فرعونیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے آئے دن اس طرح کے ناخوشگوار حالات دیکھے، تو ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس پر وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور پھر ساری عمر سرکاری نوکری کے نزدیک نہیں گئے۔

کانگریس کی سیاسی تحریک اب روز بروز تیز تر ہو رہی تھی۔ لالہ چند فلک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پُر جوش تقریریں اور خطیں پڑھنے لگے۔ نوبت قید و بند تک پہنچی۔ جون، ۱۹۱۷ء میں بھرم بناوٹ ۲۰ سال کے لیے

- مذکورہ معاشرہ

کالے پانی (جزیرہ انڈیمان) کی سزا ہوئی جو بعد کو ۴۴ سال کی قید میں تبدیل کر دی گئی۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں دستور کی اصلاحات کا نفاذ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے، اسی میں انھیں بھی رہائی ملی۔ لیکن ان کا تشویشاں نہیں تھا کہ تعزیر و تعذیب کی ترشی اُسے اتار دیتی، ان کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شعر پر اصلاح فحش و دھار کا پرشاد افق نکھنوی سے ملی۔ اسی زمانے میں ان کی قوی نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے، جامِ فلک، پیامِ فلک، کلامِ فلک۔ مہابھارت بھی بطور ناول نشر میں نکھی نکھی۔ ان کا یہ مصرع ضربِ انشل بن چکا ہے۔

تو بھی بدل، فلک، کہ زمانہ بدل گیا

اس بزرگ قوم پرست شاعر کا ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ ۸۰ سال کی عمر پائی۔

افسوس، کوشش کے باوجود ان کے کلام کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا۔ مندرجہ ذیل چند شعری کوششوں سے تیار کر سکا ہوں۔ ان کا کلام آپ مبتی اور دلی جذبات کا آئینہ ہے۔

آگ میں پڑ کر بھی سونے کی دھمک جاتی نہیں

کاٹ دینے سے بھی ہیرے کی چمک جاتی نہیں

سِل پہ گھس دینے سے بھی جاتی نہیں چندن کی بُ

پھول کی، سستی میں مل کر بھی، ہلک جاتی نہیں

دخ میں آسا نہیں نیلوں کی پیشانی پہ بک

دھوپ کی تیزی میں سبزے کی ہلک جاتی نہیں

سندھ کا معاصرین

جا نہیں سکتی کہڑوں میں بھی شیروں کی دھاڑ
دستِ گلچسپ میں بھی غنچوں کی چٹک جاتی نہیں
صاحبِ رحمت نہیں دبتا مخالف سے کبھی
زور سے آندھنی کے آتش کی بھڑک جاتی نہیں
نعرہ زن رہتا ہے آفات و حوادث میں دلیر
بادلوں میں گھر کے بجلی کی کرہک جاتی نہیں
لمک کی الفت کا جذبہ دل سے مٹ سکتا نہیں
قوم کی خدمت کی خواہش اے فلک جاتی نہیں
دل سے بھگیں نہ کر کبھی وطن کی آفت
میری سٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئیگی
میں اٹھا لو نکا بڑے شوق سے اس گھر کا
خاک ڈالنے کے لیے بادِ صبا آئیگی
اندگانی میں تو ملنے سے بھکتی ہے فلک
خلق کو یاد مری بعدِ فنا آئیگی
وطن کی پھانسی جس دل میں گڑی ہو خوشی سے وہ اٹھاتا ہر کڑی ہے
عن کا ابراہ ہے رحمت کا بادل گھٹا آفت کی، سادہ کی جھڑی ہے

انگلہ فیروز پوری، تندر کشور

۲۶ اگست ۱۹۰۱ء کو فیروز پور کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ جگن ناتھ کا شہر کے سربراہ اور وہ اصحاب میں شمار تھا۔ انھی ۲۲ برس کے تھے کہ انگریزی حکومت نے انہیں آئری مجسٹریٹ بنا دیا۔ وہ کوئی ۴۰ سال اس عہدے پر فائز رہے۔ لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی تصنیف ”بھگوت گیتا کی شرح“ مطبوعہ موجود ہے۔

انگلہ صاحب نے بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد پانے کے بعد فیروز پور میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

والد لالہ جگن ناتھ کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہو گیا، اور گھر کی ذمہ داری انگلہ صاحب پر آ پڑی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ بھی آئری مجسٹریٹ بنے اور آزادی (۱۹۴۷ء) تک پوری دیانتداری اور تندہی سے اس کے فرائض سرانجام کرتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنی ذاتی وکالت بھی ترک کر دی تھی، تاکہ دونوں میں کسی جگہ ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ شہر کے رفاہ عامہ کے کاموں سے بھی گھری دم بھری تھی۔ انہیں امداد قیدیوں کے اعسزادی سکتا تھی۔ نیز مقامی اسکول کی مجلسِ نظہ کے نائب صدر تھے۔

آخری چند سال میں اپنا کاروبار کر لیا تھا۔ فیروز پور کا سینما ہاں، شملہ، اکیر
نامی انجین کی ملکیت تھا۔ ۳۰ اپریل، ۱۹۶۷ء کو فیروز پور ہی میں رحلت کی۔
طالبعلی کے زمانے ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جب بھید گئی
شعر کہنے لگے، تو خواجہ عبدالرؤف عشرت کسنوی سے اصلاح لینے لگے۔ اس
طرح انگریز کا سلسلہ تلمذ خدائے سخن میر تقی میر پر مشتمل ہوتا ہے۔

انہوں نے کسی زمانے میں گیتا کا منظوم ترجمہ شروع کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ
درس حیات کے عنوان سے چھپا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ آخری ایام میں انہوں
لے مکمل کر لیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا سودہ کہاں ہے۔ یہ چھپ جانا چاہیے
تاکہ محفوظ ہو جائے۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تمام عمر رے دل کے زخم بھرنے کے	مرے نصیب وہ بگڑے کہ پھر سنوڑ کے
ترے بغیر سہا یا نہ کوئی آنکھوں میں	ہزار نقش اتارے مگر اتر نہ سکے
تھاری یاد میں کچھ بھی رہا نہ یاد ہیں	کہاں کہاں تھیں ٹھونڈا یہ یاد کرنے کے
عبث ہیں دوسرے جن میں اے بلبل	لگا وہ آگ کہ گلچیں بھی گل کتر نہ سکے
شرف ملا نہ جنھیں تیری باریابی کا	گزار کے بھی ترے کوچے سے وہ گزرنے کے
شبہ پہنچ تو دی ہے معتودوں نے مری	مگر وہ دردمخت کا رنگ بھرنے کے

دھج غم میں دل زار غرق ہوا خگر
یہ وہ سفینہ ہی جو ڈوب کر ابھرنے کے

صد حیف اسے تو نے جد اچھوڑ دیا ہے	جس نے بھی کچھ تیرے سوا چھوڑ دیا ہو
دیکر رہے مفلک کو عنایت کی نظر بھی	تم نے تو نقطہ تیرا دیا چھوڑ دیا ہو
اللہ کے ساتھی! وہ تری شوخ نگاہی	داعظانے بھی مضمون خدا چھوڑ دیا ہو

-مذکورہ معاصرین

اے تارکِ دنیا! تجھے جنت کی ہوس کیوں
چھوڑا ازا سے تو نے، تو کیا چھوڑ دیا ہے
ہس ترکِ ثنا کی کوئی حد کبھی ہے انکرا
کیوں حلقہٴ اربابِ وفا چھوڑ دیا ہے؟

رباعیات

مظلوم ہیں ہر طرح خطا دار افسوس! اب صاحبِ قدرت ہیں ستارِ افسوس!
منظور ہے ہر کسی کو طاعتِ ذر کی مفلس کا نہیں کوئی بھی غوار، افسوس!

لڑتے ہیں ہم دگر برادر، افسوس! ملان کا پھر گیا ہے سراپا افسوس!
خوشیوں کی نگاہ سے تمللاتے ہیں غیروں کی وہ کھار ہے ہیں ٹھوکر افسوس!

چھٹ گئی آہ! وطن پرستی افسوس! ہو گئی آہ! ذلیل ہستی، افسوس!
ہر گھر میں بپا ہے ایک بزمِ ماتم ویرانہ سی ہو گئی ہر بستی، افسوس!

رفیق مارہروی، رفیق احمد

آحسن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے، ۲۲ مئی ۱۹۶۷ء کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے بدایوں اسپتال میں انتقال ہوا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۱۶ء کو مارہرہ میں پیدا ہوئے تھے، گویا وہ برس کی عمر مائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رفیق ان کا تخلص تھا، حال آنکہ یہ صحیح نہیں ہے؛ وہ محض اپنا نام اس طرح لکھتے تھے، نہ تخلص تھا، نہ کبھی انھوں نے شعر کہا۔ نثر میں البتہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب اسلام اور نظریۂ شرافت تھی۔ چونکہ ان کے والد احسن مرحوم داغ کے محبوب شاگردوں میں تھے، اس لیے ان کے خاندان میں داغ سے متعلق بہت مواد تھا۔ اسی کا ثمرہ رفیق مرحوم کی دو کتابیں زبان داغ اور زنجیر داغ تھیں۔ وہ داغ کی سوانح عمری بھی مرتب کر رہے تھے؛ خدہ معلوم، یہ کس مرحلے پر تھی۔ ان کی ایک کتاب ”ہندوؤں میں اہوتی“ اگرچہ اخلاط اور عدم توازن سے خالی نہیں، تاہم قابلِ قدر ہے۔ اپنے والد احسن مرحوم کے کلام کا انتخاب جلوۂ احسن کے عنوان سے شائع کیا اور اس کے

شروع میں ان کی اچھی بسوٹ سوانح عمری شامل کر دی تھی۔ تعلیم دسویں درجے تک تھی۔ وہ ساری عمر معقول ملازم رہے۔ کنبہ بھی بڑا تھا، اس لیے کبھی ذرا کام نہ دیکھا۔ یکم مئی کو بیٹے میں گرفتار ہو گئے۔ دو روز ہسپتال میں رہ کر داما گنج میں اپنے مکان پر آئے۔ لیکن حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بدایوں میں سول سرجن کا علاج ہو۔ اسی دوران میں ویامپیس کے پرانے مرض نے غلبہ پایا جب کوئی افادہ نہ ہوا تو ۲۴ مئی کو ہسپتال میں داخل کیے گئے۔ اسی شام اللہ کو پیار سے ہو گئے۔

شاہد احمد دہلوی

مترجم قرآن شمس العلام مولوی نذیر احمد دہلوی (ف ۱۹۱۲ء) کے پوتے اور دو آغا دارالحکومت دہلی کے مولف مولوی بشیر الدین احمد (ف ۱۹۲۷ء) کے بیٹے شاہد احمد دہلوی کا، ۱۹۶۷ء کی ۱۹ دسمبر کی درمیانی شب میں پونے بارہ بجے بیمارستان قلب کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۰۶ء کو اپنے خاندانی مکان دہلی میں پیدا ہوئے تھے، گویا ۶۱ سال کی عمر پائی۔ خدا مغفرت کرے۔

ان کے والد مولوی بشیر الدین احمد ان کے بچپن کے زمانے میں ریاست حیدرآباد (دکن) میں تادم تھے، اس لیے شاہد صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد پہلے علی گڑھ اور پھر دہلی آئے۔ دسویں درجے کی سند انھوں نے عربیہ اسکول سے لی تھی۔ اس کے بعد لاہور جا کر فورمین کالج میں داخلہ لیا۔ ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا، لیکن ایف ایس سی کرنے کے بعد جب یہ سیدکلی کالج میں پہنچے، تو یہاں مردہ لاشوں کی چیر بھاڑ سے طبیعت شکن کٹر ہوئی کہ بھاگ نکلیے۔ بالآخر سان سیفئس کالج کوئی سے انگریزی ادبیات میں

ساتی بھی دوبارہ جاری کر دیا۔ لیکن زمانہ بہت ناموافق رہا، اسے جاری رکھنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن نہیں کرنا پڑے، ان حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہاری نہیں مانے۔ جس استقلال سے وہ آخری دم تک جُتے رہے، بیان کا قابلِ تعریف و تقلید کا نام ہے۔ یہاں انھوں نے اُحمرت پر مضمون لکھے، ریڈیو کی ملازمت کی، جہاں وہ ایس احمد کے نام سے موسیقی کے پروگرام کے نگران اور ہدایت کار تھے۔ اور اس طرح جو کچھ کمایا، اسے ساتی کے تنور میں جھونکے، رہے پاکستان میں ان کا بہت بڑا کارنامہ۔ ”پاکستان رائٹرز گلڈ“ کی تاسیس تھی، جسے انھوں نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں سات اور ادیب دوستوں کے ساتھ مل کر قائم کیا، انھیں دلی کی محسالی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے کم و بیش پچاس کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ ان میں دلی کی بیٹا، گنجینہ گوہر اور فاؤسٹ بہت مشہور ہیں۔

۱۹۶۶ء میں وہ بیمار ہو گئے، ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا، اور بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ چلنے پھرنے لگے تھے، اور ان کی صحت بھی تدریج عود کرنے لگی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلسل محنت اور مکر و بات کی یورش نے ان کی تندرستی کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۶۷ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہے اور بظاہر محتیا ہو کر گھر آ گئے۔ لیکن یہ سنبھالا ثابت ہوا۔ ۱۷ مئی کو وہ دن بھر چھے رہے۔ شب میں کچھ جھپٹی کا اظہار کیا، نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔ یکایک کھانسی کا دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر بلا یا گیا، لیکن ان کے چپخٹے سے پہلے وہ جان بحق ہو چکے تھے۔ ان کی وفات سے ایک اردو کا شیدائی، دلی کی تہذیب اور وضع و عمارت و شرافت کا نمونہ ہم سے جدا ہو گیا۔ حق منہضت کرے۔

آثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان

حضرت آثر بہت دن سے بیمار چلے آتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے وہ زیادہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ اب وہ برسوں کے نہیں، سقوں اور دنوں کے بہان ہیں۔ چنانچہ وقت موعود آن پہنچا، نادر مغل کے دن ۶ جون ۱۹۶۴ء صبح کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آثر صاحب کا خاندان ایرانی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ میرزا محمد شفیع اصفہان سے آگرے آئے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ طبیب تھے۔ آگرے میں ان کی خداقت نے ایسی شہرت حاصل کی کہ نواب وزیر شجاع الدولہ نے انھیں فیض آباد طلب کر لیا، مناسب قدر و منزلت ہوئی اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے میرزا محمد سمیع ذرہ تخلص (ف۔ ۱۳۵۸ھ) کو بلا چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ وہی حکیم محمد سمیع ذرہ ہیں، جن کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔

گر باگدشت دایں دل زارِ حیاں سر باگدشت دایں دل زارِ حیاں
 القصد سہرا گرم و سردِ عالم بر باگدشت دایں دل زارِ حیاں
 خان علامہ افضل حسین خان (ف ۱۸۸۱ء) بھی اسی خاندان سے تھے۔
 حکیم محمد سمیع ڈوہ کے بیٹے حکیم میرزا علی خان جو والد ہی کے ساتھ کر بلا گئے تھے
 ان کے انتقال کے بعد کھٹو چلے آئے، یہاں انھیں شاہی مدرسہ حکیم الملک
 خطاب ملا اور بڑا عروج پایا۔ انھیں کی اولاد میں اثر مرحوم کے والد بزرگوار
 حکیم میرزا افضل حسین خان تھے۔

اگر اپنے خاندانی مکان کٹرہ البتہ اب خاں (کھٹو) میں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو
 پیدا ہوئے، سنہ میں رواجی چاندی کا چھپ نہیں، سونے کا چھپ لیے ہوئے بڑے
 ہوئے حالات کے اقتضا سے خاندان کی روایات کے برخلاف ان کی تعلیم
 مغربی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں بی اے کی سند لی؛ ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر
 بنادے گئے اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں
 ڈپٹی کمشنر اور دکن اور دوسرے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۳۵ء میں
 کلکٹری پر منتقل ہوئے، ۱۹۴۴ء میں پنشن کے بعد اولڈ کشمیر میں ویرمال اور
 پھر وہیں چندے وزیر اعظم بھی رہے۔ خدماتِ جلیلہ کے لیے حکومت کی
 طرف سے ۱۹۳۶ء میں خطاب خان بہادر اور ۱۹۳۹ء میں ایم بی ای، ملا۔
 ۱۹۴۳ء میں زیارات مقامات مقدسہ کی غرض سے عراق کا سفر کیا۔

۶ جون ۱۹۶۷ء کو وقتِ صبح رہ گراے عالم جاودانی ہوئے۔ اسی شام جنازہ
 اٹھا اور کر بلا سے خدائیش (مال کوتوہ) میں دفن ہوئے۔

شاعری کا شوق ادائیں سے تھا اور اس میں میرزا محمد ہادی عربیہ کھٹوی (ف ۱۹۵۰ء)
 سے متاثر رہا۔ عربیہ کے بعض دوسرے شاگردوں کے انشوناک ردیے کے بائیں

اثر آفرینک استاد کے احسانات کے معترف رہے۔ کثرۃً ابوترباب کی سکونت سے ان کا خاندان اپنی زبانِ اندانی کے باعث "لغات کثرہ" کے عرف سے مشہور تھا۔ اثر کو بھی زبان و بیان اور فن شعر میں غیر معمولی جہارت اور قدرت حاصل تھی جس کی شہادت ان کی تالیف "فرہنگ اثر" سے بھی ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے نور اللغات کی تعمیری تنقید اور اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب پر انھیں یورپی حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ حکومت ہند نے انھیں خطاب "پدم شری" سے نوازا تھا۔

ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "چھان بین" اور "اثر کے تنقیدی مضامین" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ غالب کے کچھ اشعار کے مطالب "مطالب غائبہ" کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ایسے سے متعلق بھی ایک مجموعہ مضامین "ایس کی مرثیہ نگاری" کے نام سے ہو۔ ان کی غزلیات کے چار مجموعے شائع ہوئے: اثرستان، بہارستان، بہاراں، نوہاراں، ایک جلد (عروسِ فطرت) میں نکلیں ہیں۔ ایک اور مجموعہ "لالہ دگل" کے نام سے بھی چھپ چکا ہے۔ لکھنوی ہوتے ہوئے بھی وہ تیر کے عاشق تھے، انھوں نے اس کے کلیات کا ایک نمائندہ انتخاب بھی مزا میر کے نام سے کیا، جو دو حصوں میں چھپ چکا ہے۔ دوسری زبانوں کے نظموں کے تراجم اور مختارات کا ایک مجموعہ (درنگ بست) بھی ان سے یادگار ہے۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ "نغمۂ خداوندی" کے نام سے کیا تھا۔ دو ڈرامے۔ "دنگاری بیگم" (منظوم)، اور "ہلاک فریب" بھی چھپ چکے ہیں۔ پہلا فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے۔ دوسرا پشتانی مصنف سگند کرانسی کے ڈرامے کا آزاد ترجمہ

غرض شعر و ادب اور علم و فن میں ان کی تحریریں وسیع اور پائیدار حیثیت

کی مالک اور ہماری ادنیٰ تار و پاز کا قابلِ تقدیر حصہ ہیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہوا

کتنے ہی شکوے زباں پر آئے، اگر وہ گئے

کچھ نہ کہتے بن پڑا، اگر دن جھکا کر رہ گئے

کیسی تکیس، بیقراری میں اضافہ ہو گیا

باتھوہ نزدیک دل کے لائے، لا کر رہ گئے

اور جو کچھ ہو، یہ اندھیر نہ جوتے پائے

یاس امید کا بیڑا نہ ڈوبنے پائے

تسل کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں

غمو شمی، پھر تبسم، پھر خطاب آہستہ آہستہ

جستِ ادراہ کرتی ہے یوہنی محبوب کے دل کی

کہ جیسے نشہ کرتی ہو شراب آہستہ آہستہ

جانوں نے اثر کے پھر ہنگامہ کیا، برپا

منہ پھر کے پھر کہ دو دیوانے کو کیا کہنے

تری گفتگو جو سن لے، تو ہو موجِ موز و قصاں

وہ ہے کیفِ خامشی میں کہ ہو غرقِ مے ترتم

کیا جانے، کس نے اسے یہ بات سکھا دی

جب تم کو پکارا ہے، مرے دل نے صدا دی

محبت اور اظہارِ محبت یہی قزبات ہے، دیوانے پن میں

دل کا ہے رونا، ٹھیل نہیں ہو، منہ کو کیجا آئے دو

تھمتے ہی تھمتے، اشک تھینکے، ناصح کو سمجھانے دو

کہتے ہی کہتے حال بگڑنے لگا۔ ایسی نہیں جلدی کیا ہے؟

دل تو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو

شکوہ کیا اندازہ الفت، طنز سمجھ کر روٹھے ہو

ہم بھی ہیں نادم اپنی خطا پر، آؤ تم بھی جانے دو
صوتِ منزل کیا نظر آنے، ثبت ہیں دل پر نقشِ خودی

عقل ہے دشمنِ نفس ہے، رہزن، ٹھوکریں کچھ نہ کھانے دو
دل کو اثر کے لٹ لیا ہے، شہو خنگِ اک کافر نے

کوئی نہ اس کو روکنے سے روکو، آگ لگی ہو بجھانے دو

ظہورِ عشقِ حقیقت طرا ز تھی ورنہ یہ دلکشی کہیں دارِ درس میں آئی ہو

کھوٹے ہوئے سے دہنا دن کو، روتے پھر نارائوں کو

جو ہیں حائل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو

بات یہ اور ہے شوق کے ہاتھوں خونِ دل عاشق ہو جا

کام نہیں کچھ خورِ مزیزی سے اترے خالی ہاتھوں کو

کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی ہسر و وفا

تلخ اگر سن سکتے نہیں، تو کیوں پھیڑوان باتوں کو

ہو نہ ہو اسب اپنی ہمتی، لاکھ کر داسکارا اثر !

نفید آنکھوں کی اڑاتے ہو، کہ کہ کے فسادِ آفتوں کو

دل کو ہلاکِ شوق تھا، اب ہے حن کی دنیا، کیا کہنا !

جو شہِ طرب ہو، ترکِ طلب میں، ترکِ طلب کا کیا کہنا

آئینہ دارِ عشرتِ دریا، قطرہ بھی مثلِ دریا ہے

کیسی جدائی، چل کہاں کا، ایک ہے نقشا کیا کہنا

حیف اثر کا کھویا سار جہاں، اور کبھی جو بات بھی کی
طنز سے تیرا سنس کر کناہ آپ کی سننا کیا کہنا!
 آغازِ محبت کی لذت، انجام میں پاتا مشکل ہے
 جب دل کو موسے رستے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے
 ہم نے دورِ وکے رات کافی ہے آٹھوں پر یہ رنگ تب آیا
 حیف تھیں فرصت ہی نہیں ہو، ورنہ کیا کیا حسرت تھی
 حال ہمارا سن لیتے، اور اپنا حال سناتے تم
 جان کو روگ ہیں دنیا بھر کے ہم تو پھٹائے محبت کر کے
 سوئے مستقبل رواں ہو شہرِ دہلی پر حال کے
 بھول جائی کسی کو، لاش کہنہ اک دفن میں ہے
 زینہ، بام کا سیالی کا، ہیں یہ ناکامیاں
 سخی سے باز آنہ ہر گز جان جب تک تن میں ہے
 اپنی ہستی محو کر دے گشتِ زاد و جہد میں
 بارِ ورنہ ہوتا نہیں وہ دانہ، جو خرمن میں ہے
 دل میں جہت ہو اگر، اور استوار ی حزم میں
 موم سے بھی پھر اثر ا بڑھ کر گدا آہن میں ہے
 کسی کا ہاں، یہ کہنا اثر سے وقتِ وداع
 جو ہو سکے، تو ہیں دل سے تم بھلا دینا
 حال بھی اپنا سننا دیکھا تھیں اک عودِ دل تو ٹھہر جانے
 دیکھو نہ آنکھ پھر کے کسی کی طرف بھی
 تم کو خبر نہیں، جو تمہاری نظر میں ہے

نہیں مشروط ابتدا کی، نہیں قید انتہا کی
ہے لطیف قصۂ غم، اسے پھیر دو جہاں سے
 برق شرمندہ اُدھر، میں ہوں پشیمان دھر
چار تنکوں کے سوا، خاک نشین میں نہیں
 ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں
ورنہ آلودہ جبینِ مہندگی ہو جاسیگی
 جوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریکِ جنوں
جیسے چھینے لیے جاتا ہے گریباں کوئی
 اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتبار
یوفا! یہ تیرے وعدے میں عجب تاخیر ہے
 اک بات بھلا پوچھیں، کس طرح مناؤ گے؟
جیسے کوئی روٹھا ہے، اور تم کو منا ہے
 دیکھنا ظرف کہ بادِ صفت ہزاراں مستی
راڈ میخانے کا عفو کا ہے میخانے میں
 آکے زرا میری قسم آزما تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو
ہنگامِ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے
 اک موجِ تھی جو اٹھ کر پھر لگئی دریا میں

نذر سجاد حیدر

نذر سجاد حیدر جنہیں کسی نے اردو کی جبین آستین کہا ہے، ۱۱ اتر پر ویش کے ایک قدیم زمیندار گھرانے کی نام یوا تھیں۔ ان کے پردادا میر معصوم علی (مصنف اشک معصوم) سلطنت اودھ میں تانم اور بچکلہ دار تھے۔ ۱۸۵۵ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے پنجاب کا نظم و نسق چلانے کے لیے جن اصحاب کا یوپی سے انتخاب کیا تھا، ان میں میر معصوم علی کے صاحبزادے خان بہادر میر قائم علی بھی تھے۔ انھوں نے پنجاب کے قانون اور اضنی کی تشکیل اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیا۔ میر قائم علی کے پوتے اور میر منظر علی کے بیٹے خان بہادر میر نذر الباقر تینوں فوج کے رسد (سپلائی) کے محکمے میں ایجنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں تعینات رہے۔ یہیں ان کے ۱۸۹۴ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے نذر زہرا بیگم رکھا۔ یہ لڑکی اپنے خاندانی ماحول کے اثرات کے تحت بہت جلد لکھنے پڑھنے کی حرف مائل ہو گئی، اور اس کے مضمون بنت نذر الباقر کے قلمی نام سے

سید متا دہلی مرحوم کے ماہ ۲۰ رسالے تہذیب نسواں میں چھپنے لگے۔ ۸۰ ۱۹۰۸ء
میں جب اس کی طرز شکل سے ۴ سال کی ہو گئی، اس کا پہلا نمبر اول، اختر النساء،
دادالاشاعت لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

تہذیب نسواں کے علاوہ ان کے مضمون، تچوں کے مفتہ دار پھول اور
دوسرے رسائل میں بھی شائع ہو رہے تھے۔ ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ مضمون
کی دھوم مچ گئی۔ شدہ شدہ اس کی اطلاع ادب بگم بھوپال تک پہنچی،
اور انھوں نے انھیں اپنا سکتر مقرر کرنے کی دعوت دی؛ لیکن میرزا دانی
نے اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود بیٹی کو یہ ملازمت قبول کرنے کی اجازت
نہ دی۔ میرزا دانی اقرعوتوں کے روایتی پردے کے قائل نہیں تھے؛ لہذا
ان کے گھر میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی بھول
کو بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا، وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے
کہ لڑکیاں شرم دیا کو بالائے طاق رکھ کر جہاں چاہیں اکیلی پھرتی رہیں۔

۱۹۱۳ء میں نذرانہ ہر ابگم کی شادی سید تاجاد حیدر یلدرم سے ہو گئی، جو داد
ادب میں رومانی افسانے اور مضمون نگاری کے مانیوں میں سے ہیں۔ یلدرم
انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بہت دن تک قسطنطنیہ اور بغداد میں مقیم
رہے تھے اور وہاں سے واپسی پر امیر کابل کے نائب پولیٹیکل ایجنٹ مقرر
ہو کر مسوری میں رہنے لگے تھے۔ جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی تو
۱۹۲۰ء میں اس کے پیرسٹرا (مبجل) مقرر ہوئے۔ شادی کے بعد نذرانہ
بگم نے اپنا تعلیمی نام نذرانہ بقرجل کو نذر تاجاد حیدر رکھ لیا۔ انھوں نے ہر
طرح یلدرم کا ہاتھ بٹایا۔ یونیورسٹی فنڈ میں چندہ جمع کرنے کی تحریک میں
بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؛ بلکہ وہ اس کی یو۔ پی کی صوبائی شاخ کی سکتر بھی

وہیں۔ پھر کھدو پر چار میں پوری گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اسلامی ملکوں کی سیات بھی کی تھی۔ اس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ انہوں نے آخر النساء بیگم کے علاوہ اور بھی متعدد نادول لکھے، جن میں سے حرمیں نصیب آؤ، مظلوماں، انجہ، جانبار، ثریا، مذہب اور عشق وغیرہ نے خاصی شہرت حاصل کی۔

انہیں ۲۰۔ ۲۵ برس سے فشار دم (دہائی بلڈ پریشر) کا عارضہ تھا؛ ۱۹۶۱ء میں علاج کے لیے لندن بھی گئی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ آخر ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ممبئی میں انتقال ہو گیا۔ اثنا عشری آرام گاہ ارحمت آباد ممبئی میں دفن ہوئیں۔

اس سلسلے میں دو ایک اور باتوں کا ذکر دل چاہی کا باعث ہو گا۔
مذہب و سجاد حیدر کے دادا میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے۔ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد (عرف میاں نتھو) ان کے گھر پر بیٹھ کر کپڑے سینے اور رنوال کا کام کیا کرتے تھے۔ اقبال اپنی طالب علمی کے زمانے میں میر مظہر علی کے تینوں بیٹوں کے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ اقبال نے اپنے خطوں میں مذہب و سجاد حیدر کو آزادادی کے لقب سے خطاب کیا ہے۔

اردو کے ایک مصنف میر افضل علی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب ”تخیلات“ آج سے ۵۰۔ ۵۵ برس پہلے اچھی خاصی شہور رہی ہے۔ وہ کسی زمانے میں پنجاب میں انکم ٹیکس کے ٹیکسے میں ملازم تھے۔ اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ نسبتاً جوان عمری میں ان کا ۱۹۲۷ء میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت وہ غالباً لاہور میں انکم ٹیکس کشنر تھے۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے

ہمدی تھے۔ تو خیر، میر فضل علی، مرحومہ نذر سجاد حیدر کے ماموں زاد دادا،
 چھوٹی زاد بھائی تھے، ان کی والدہ اکبری بیگم ان کی چھوٹی تھیں میر فضل علی
 کی شادی ثروت آرا بیگم یعنی نذر سجاد حیدر کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔
 خود اکبری بیگم کا مشہور ناول "گودڑ کا لال" غالباً ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا
 تھا۔

قرۃ العین حیدر جنھیں سال (۱۹۶۷ء) افانوں کے مجموعے "پت بھر کی آواز" پر
 ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا ہے، نذر سجاد حیدر کی صاحبزادی ہیں۔

علی بہادر خان، حافظ

ان کا خاندان مراد آباد کا رہنے والا تھا۔ علی بہادر خان ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا ان کی بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا، جب کہ ہنو زان کی تعلیم شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے ان کی تربیت کا بار بڑی مردانگی سے اٹھایا اور انھیں اعلیٰ تعلیم دلانی۔ ان کا تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ دسویں درجے میں صوبے بھر کے اعلیٰ دس طلبہ میں تھے؛ وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے؛ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر نواک حسین مرحوم ان کے معاصر تھے۔ یہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی ایس سی کی امتحان شدہ۔ ایم ایس سی میں تعلیم پا رہے تھے کہ ملک میں قومی تحریک اور عدم تعاون کے ہنگامے میں کانج کو خیر باد کہہ دیا، اور کانگریس اور خلافت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اب انھوں نے صحافت کی طرف رخ کیا۔ سماج، جہلپور اور مدینہ مجنوں اور نصرت، بمبئی کی ادارت سے وابستہ رہے، اور اس میں اپنی کامیابی حاصل

کی کمر مرکزی جمعیت خلافت کے اخبار خلافت بمبئی کی ادارت ان کے سپرد کر دی گئی۔ اس عہدے پر چار برس تک کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا بیٹے دار "اتحاد" اور خواتین کے لیے "معین نواں" جاری کیے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ "ہلال" جاری کیا، جو آج تک زندہ ہے۔ اسی دوران میں قید و بند کے ابتلا سے بھی دو چار ہونا پڑا۔

وسیع معلومات کے مالک تھے اور متعدد ذرائع جانتے تھے۔ قلم میں زور تھا اس لیے ان کی تحریر سے وثوق اور وقار کا اظہار ہوتا تھا۔ صحافتی سرگرمیوں کے علاوہ بعض کتابیں بھی ان سے یاد گار ہیں۔ مثلاً محمود غزنوی، حکومت الہیہ، پردہ اور اسلام، ترکی زبان وغیرہ۔ بعض انگریزی کتابیں اور مختصر رسالے بھی شائع ہوئے؛ انگریزی میں بعض پرچے بھی چھاپے۔ وفات سے پہلے اردو بیٹے دار "دور جدید" کے ایڈیٹر تھے۔

حکیم قلب کے بند ہو جانے سے ۶/۵ نومبر ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب دہلی میں انتقال کیا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور جسدِ خاک فیروز شاہ کوٹلہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ تخلص ہلال تھا۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھیے:

ستم سے کھیلنے والے، جفا سے کھیلنے والے

جفا تو کیا، مسلمان ہیں تضا سے کھیلنے والے
مسلمان خاک و خون میں جان پر کھیلے ہیں دشمن
خبر بھی ہو تجھے، رقص و غنا سے کھیلنے والے!

جہادِ زندگی ہے کس قدر مجموعہٴ افسردہ

بقا کا لطف، پاتے ہیں، فنا سے کھیلنے والے

مذکورہ معاصرین

تعجب کیا، بنا نہیں بھیلوں میں ہسٹیاں اپنا
چمن میں جلوہ برق و قاسم سے کھیلنے والے
کبھی تو خاک و خوں میں جان پر کھیلے، تو ہم جاہلی
خدا کے نام پر اکبر و ریا سے کھیلنے والے
وہی منزل پہ بڑھتے ہیں، وہی ساحل کو پاتے ہیں
سفینے جو ہیں گرواب بلا سے کھیلنے والے
شکت ہو ربابِ زندگی، توئی ہوئی مضاربِ گد
توہیں کیا، ہم ہیں سازِ بے نواس کھیلنے والے
ہلاں! ان کوٹے کا لطف جھینے اور مرنے کا
جہاد حق میں جو ہوں گے قصائے کھیلنے والے

ہاشمہ سدرشن، بدری ناتھ

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری نے بہت لوگوں کو متاثر کیا، لیکن غالباً ہاشمہ سدرشن اور اعظم کریوی کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ اعظم کریوی کو ہم سے جدا ہوئے بہت دیر ہوئے۔ ہاشمہ سدرشن کا بھی ۱۶ دسمبر، ۱۹۶۷ء کو ہری کوشن میں ہسپتال، بمبئی میں انتقال ہو گیا۔

ہاشمہ سدرشن کا اصلی نام بدری ناتھ تھا۔ وہ ۱۸۹۶ء میں ضلع سیال کوٹ کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ شروع سے طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل تھی۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا پہلا افسانہ چھپا ہے، وہ جنوز آکھویں درجے کے طالب علم تھے۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد انھوں نے دو چیزوں کو اپنا ادھنا بچھونا بنا لیا۔ آریہ سماج تحریک اور افسانہ نویس، اور بعد کو یہ شوق محض افسانہ نویس تک محدود ہو گیا۔ اس کی تکمیل اور تکمیل کے لیے انھوں نے ماہنامہ چندن جاری کیا تھا جس میں صرف افسانے چھپتے تھے۔ ان کی شہرت میں اب۔۔۔ ان افراد ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ فلیکس کپسین والوں نے

پہلے ان کی خدمات حاصل کر لیں، یہاں وہ چار سو مشاہیرہ پاتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فلم کے لیے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں وہ چند بھارت کشش پکچرز (کلکتہ)، اور نیو تھیٹر (کلکتہ) سے وابستہ رہے۔ آخر الذکر کی فلم دھوپ چھاؤں کی کہانی کے علاوہ گانے بھی انہیں نے لکھے تھے۔ اس کے گیت: دنیا رنگ رنگیلی بابا، اور تیری گھڑی میں لاگا چور بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی بھی انہیں اپنی مجلسوں میں شاکرتے تھے۔ ہرولڈ لیزنگٹون کا رہگل کا ایک گیت: ”اب میں کیا کروں، رکت جاؤں بہت مشہور ہے؛ یہ بھی سدھن نے لکھا تھا۔ انہوں نے تقریباً ۴۵ فلموں کی کہانیاں، گیت اور مکالمے لکھے۔ ان میں دھوپ چھاؤں، پتھروں کا سوداگر، دشمن، گراموفون سنگر، پردیسی، سکندر، پڑوسی، چندر سیکھا وغیرہ بہت کامیاب رہیں۔

جہاں سدھن نے اپنی تصنیفی زندگی اردو سے شروع کی تھی، لیکن بعد کو وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے تھے، اور رفتہ رفتہ صرف ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن اردو افسانے کے ارتقا میں ان کا حصہ فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں ان کے کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہوئے، سدا بہار پھول، چندن، بہارِ سحر اور سونہ سنگھار۔ اس کے علاوہ انہوں نے مشہور بنگالی ناول نویں بنکم چندر چٹرجی کے ناول ’سازِ یاسے‘ اور ’زہرِ یاس‘ کے نام سے اردو زبان میں منتقل کیے تھے۔ ایک اور ناول ’عمودت کی محبت‘ بھی بنگالی سے ترجمہ کیا تھا۔ بے گناہ مجرم، بعض بنگالی اور فرانسیسی ناولوں پر مبنی تھا۔ ہندی میں ان کی تقریباً بیس کتابیں ہیں۔

سراج لکھنوی، سراج الحسن

سراج الحسن سراج کہنے کو تو لکھنوی شاعر تھے۔ لیکن ہے یہ کہ ان کے ہاں لکھنؤ کی خارجیت سے زیادہ دلی کی داخلیت ملتی ہے۔ انھوں نے پیارے صاحب زشید اور ان کے بھائی باقر رضا حمید۔ دونوں سے اصلاح لی اور خود استاد کا درجہ حاصل کیا۔ لکھنؤ میں ان کے بہت شاگرد ہیں۔

سراج کا خاندان قدیمی کٹرہ مانپکھورکا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد شیخ نور الحسن نقل مکان کر کے لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ یہیں ۱۸۹۵ء میں سراج پیدا ہوئے۔ انگریزی میں دسویں درجے تک تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں پائی۔ اور اس کے بعد محکمہ امداد و باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) میں ملازم ہو گئے۔ ساری عمر اسی محکمے میں گزری اور یہیں سے ۱۹۴۶ء میں پنشن پائی۔ کنبہ خاصا بڑا تھا۔ تنخواہ بھی قلیل رہی، ادیشن تو خواہر سب کر قلیل تر ہوتا ہی چاہیے تھے۔ اس لیے عسیر الحالی میں بسر ہوتی آکھی خوش سالی کا منہ دیکھنا لغیب نہ ہوا۔

انہوں نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کا یہ مشہور شعرا نہیں کا ہوا

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک زرد آہ کو زحمت ہوگی

کلام میں غزلیات کا انتخاب قطعاً آوازہ کے عنوان سے ۱۹۶۰ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ بہت سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کس زمانے میں وہ لکھنؤ کی ادبی انجمن معراج الادب سے وابستہ رہے، بلکہ اس کے ایک سکرٹری تھے؛ صد حکیم آشفتم تھے۔ لیکن بعد کو جب اس کے ادائیکن میں باہم شدید اختلاف پیدا ہوئے، تو معراج اس سے الگ ہو گئے اور بہار لکھنؤ کی قائم کردہ انجمن بہار ادب میں شامل ہو گئے۔ وہ مدتوں اس کے بھی سرگرم رکن رہے جبکہ غائوش اور مرغیاں مرغ طبعیت پائی تھی، جذبات کی رد میں نہیں جاتے تھے۔ جس دانے میں پورا لکھنؤ یا اس نچانہ کے خلاف تھا اور کسی کی جرات نہیں تھی کہ عزیز اور ان کے دوستوں کو تادمین کر کے لچانہ کے حق میں کلمہ خیر کہے، معراج نے لچانہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

تندرستی کبھی تسلی بخش نہیں رہی، فشار دم کے دائمی مریض تھے۔ بالآخر اسی سے ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء صبح ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہوئے۔ عیشیائے قبرستان میں آنحوی آرام گاہ بنی۔

اب کچھ شعر دیکھیے، جو ان کے مجموعہ کلام شعلہ آواز سے ماخوذ ہیں:

مری فنا بھی ہو تکمیلِ آرزو سے حیات کہ خاک تو ہوں، مگر خاک کسے یاد ہوگی
ہو خوابِ عدم، زلف سیاہ نام نہیں ہو اس شام کے بعد اور کوئی شام نہیں ہو
روشنی کرتا ہوں کم، شمع جلاتا ہوں کبھی چاہتا ہوں کہ شام شام سحر ہو جائے
نصیحتیں ہی ناصح! مے مرا نکھوں پر جو خود کسی کو ضرورت ہو دل نکالنے کی

نذر کہ صحرین

جنا بھی کہتے ہیں احسان بھی جتاتے ہیں کہ جیسے ہم کو غرض ہر قسم اٹھانے کی
وہ سنگ راہ سہی سنگ تارں نہ ہیں صلاحیت بھی تو ہو، قسمت آدھانے کی
کیا کہوں، حضرت نامح ! انہیں حاضر ہے دماغ

پھر کسی دن نہ چلے آئے، سمجھانے کو؟
اب آگے دیکھیے نقد یہ کیا دکھاتی ہے
قفس تک آ کے تو پہنچا گئی بہار بچے
پردوں سے منہ کو چھپائے قفس میں بیٹھا ہوں

یہ شرم ہے کہ نہ پہچان لے بہار بچے
لشیں غشتر، متیاد و شمن، پھول بیگانے
قفس کے رہنے والو! کج ہی کل میں کھڑا ہوں
چہرہ اداس، آنکھوں میں آنسو، لبوں پہ آہ

سب رنگ پھیکے پڑ گئے، دل ٹوٹنے کے بعد
اب بچے نامرادِ ذیست کہ کے پکارتے ہیں لوگ
سب نے سمجھ لیا ہے یہ جیسے مرا خدا نہیں
تجھ سے بہت ملا بچے، تو نے بہت دیا مجھے
اب تجھے مانگتا ہوں میں، اب کوئی حوصلہ نہیں

باتیں بھی پروفا کی بہت دل فریب ہیں
کچھ رنگ بھی بھرا ہے مرے اعتبار نے
ہر پکڑی پر کھینچ دی جیسے تری شبیہ
کٹا حسیں فریب دیا ہے بہار نے

نذکرہ صبرین

یہ مقام عشق ہے کونسا، یہ ہی کیسی صبر کی منزلیں

نہ تڑپ ہو دل میں اندر وہ ہے، نہ سکون پہ نہ قرار ہے

یہ خدا تو ہے وہی دکھ بھری، مرے کان جس سے یہ آشنا

ذرا چپ رہو، مجھے سننے دو، یہ تو میرے دل کی کار ہے

حقیقت میں بندہ بھی بننا نہ آیا سمجھتے تھے دل میں، خدا ہو گئے ہم

قیامت تھا تجھ سے ٹکا ہوں کا ملنا زمانے سے نا آشنا ہو گئے ہم

خوشادہ دور کہ جب مرکزِ نگاہ تھے ہم

پڑا وقت، تو اب کوئی رُشنا س نہیں

ہوا ہے رفتہ رفتہ یوں کسی کا سب درانا

بجائے کشتی دہلیزوں سے ٹکرایا ہو سراپنا

یوں پہ خفگی، نظر میں حسرت، جوابات نقل تر جہانِ دل تھی

اسی کھلف میں رہ گئے ہم، وہ حال پو پھیں تو ہم بتائیں

علم کا خوگر ہو کہ یہ چیز ہے رہنے والی دل کو مونس نہ کر عیش کے ساناؤں سے

آفتاب پانی پتی، الپ چند

۱۱۳ اپریل ۱۸۹۶ء کو بیاکھی کے موسی تیلوہار کے دن پانی پت کے ایک کھاتے پیتے جن خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کی تو یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں چکیت اور سرور کی قومی شاعری کا غلبہ ہر طرف بلند ہو رہا تھا۔ اس سے انھیں بھی شعر گوئی کی طرف توجہ ہوئی۔ اتفاق سے انھیں ایام میں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی روزنامہ زمیندار (ہجور) کی ملازمت ترک کر کے اپنے وطن واپس آ گئے۔ آفتاب نے ان سے اصلاح کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ یہ سلسلہ سلیم کی وفات (۱۹۲۷ء) تک جاری رہا۔

آفتاب کو غزل سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی، انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں، اور وہ بھی بیشتر قوی اور سیاسی۔ ان کے منظومات کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں: جلوۂ آفتاب، آفتاب وطن، جذبات وطن، جذبات کی دنیا، حب وطن۔ شمشیر وطن۔ زبان سلیس اور بیان جذبات سے ملبوس منظومات کے علاوہ انھوں نے لیکن ڈرامے بھی تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے من مومن،

شریستی و بنیادی، منہ دستانی سورا، اور پھتری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی قومی و ادبی خدمات کے پیش نظر حکومت ہریانہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو انہیں راج کوی کا اعزاز عطا کیا تھا۔

۹ فروری ۱۹۶۸ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے پانی پت ہی میں انتقال ہو گیا۔ یہاں چند شعرا ان کے مجھ سے جذبات کی دنیا (دلی ۱۹۵۹) سے انتخاب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔

کتنے کو کت گئے ہیں ایام زندگی کے
رد و کے شب گزار ہی دن بھر ہے پریشا
لے ہنشین! مجھ سے کیا حال پوچھا کر
سمجھا تھا باغِ عالم کو راحتوں کی جا ہو
امید تھی کہ جن سے آرام ہو گا حاصل
اشکوں سے اور آہوں سے تازہ کر رہا ہوں
ہوش و حواس جب سے کھوئے ہیں نوحہ
کس کو ہوئی مستی اسے آفتابِ راحت
پڑ بادۂ الم سے ہیں جامِ زندگی کے

کبھی روتا ہے پہروں، اور کبھی فریاد کرتا ہے

حقیقت میں یہ ایک تصویرِ غم یوں بھی ہوا دیوں بھی
نگاہِ مہرِ دایں، یا چلائیں ظلم کے خنجر

دلِ مظلوم پر ان کا کرم یوں بھی ہوا دیوں بھی
کروں فریاد اگر ہو حکم، در نہ گھٹ کے مرجائوں

محبت میں سر تسلیم خم یوں بھی ہوا دیوں بھی

نفس میں بند کر دے ، یا مجھے آزاد رہنے دے
 مری تقدیر میں سوزِ المایوں بھی ہے اور یوں بھی
 رہوں خاموش ، تو مشکل ؛ کروں فریاد ، تو مشکل
 مرے نازوں پہلے دل پر ستم یوں بھی ہوا دیوں بھی
 مزاجِ جب ہو کہ قیصر میرا ، تو خود پاک کر ڈالے
 مجھے مزاجِ ترے سر کی ستم یوں بھی ہوا دیوں بھی
 کبھی فرقت کا کھٹکا ہے ، کبھی خیروں کی لغت کا
 مریضِ عشق کا آنکھوں میں دم یوں بھی ہوا دیوں بھی
 ذرا حسرتِ مفلس میں ہے ، نہ دولت میں خوشی دیکھی
 سروں پر فکر کی تیغِ دودم یوں بھی ہوا دیوں بھی
 کبھی یہ نظم لکھتا ہے ، کبھی یہ نثر لکھتا ہے
 رداں کے آفتاب اپنا قلم یوں بھی ہوا دیوں بھی
 اپنی حالت کے بدلنے کا ہے حکم کو یقیں
 گردِ شہر پہ تیار ہے بدنے کے لیے
 چاہتا ہوں کہ ہوں حالِ محبت ان سے
 دل یہ کہتا ہے کہ افسانہ غم یاد نہیں
 آدمی کے لیے اچھا نہیں غافل ہو نا
 وہ بھی کیا ہے جسے مرنے کی گھڑی یاد نہیں

محمد عبدالباقی

اردو کے ممتاز صحافی مولانا محمد عبدالباقی کا بروز جمعہ ۲۳ فروری ۱۹۷۸ء ساڈا پنج بجے شام دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک زمانے سے اختلاجِ قلب کے مرتب تھے۔ ۲۱ فروری کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر انھیں سہروردی ہسپتال (دہلی) میں داخل کیا گیا، جہاں دو دن بعد حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رہ کر عالمِ ہودانی ہوئے۔ اگلے دن ۲۴ فروری کو جنازہ اٹھا۔ نمازِ جنازہ قاضی زین العابدین تنجاہ استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پڑھائی اور انھیں جامعہ نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا محمد عبدالباقی کو اتھ، ضلع شاہ آباد (بہار) کے ایک شہانِ خاندان میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شیر شاہ سوری کی جگہ ولادتِ بہرام سے کوئی دس بارہ میل دور پٹانوں کی مشہور بستی ہے۔ ان کے والد عبد السلام صاحب فوج میں ڈاکٹر تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ زمیندار کے ادارہ فخریہ میں شامل ہو گئے یہاں

الگ ہوئے، تو صدیق حبیب اور محفوظ الحق (جامعی) کے تعاون سے روزنامہ "آزادہ" نکالا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں اس شان اور اہتمام سے کوئی روزنامہ آج تک نہیں چھپا۔ انیس کے یہ چشمِ حوادث کا شکار ہو گیا! اس معیار کے اخبار کے اخراجات کے لیے جس قارون کے خزانے کی ضرورت تھی، وہ باقی صاحب اور ان کے دوستوں کے پاس تھا نہیں؛ چنانچہ چند ماہ بعد پرچہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بہار چلے گئے اور پٹنہ سے "استقلال" جاری کیا، جو مہینے میں دو بار چھپتا تھا۔ جب ۱۹۳۶ء میں کانگریس نے سری کرشن سہا کی قیادت میں بہار میں پہلی وزارت بنائی، تو باقی صاحب اس میں مفصلات کے لیے پہلی افسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں جیل مظہری اور رام دھاری شگھ و کمر بھی اسی محلے میں ملازم تھے۔ جب سری کرشن سہا کی وزارت مستعفی ہوئی، تو یہ لاہور پہنچے۔ اتحاد پارٹی کے اکابر سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ حضرت جات خان ٹوانہ نے انھیں اپنے پہلی ڈپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر کر دیا (خواجہ کرشن نور احمد صاحب تھے)

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد وہ دلی آئے اور "پیام وطن" کے نام سے اپنا روزنامہ شائع کرنے لگے۔ یہ پرچہ کوئی تین چار برس جاری رہا۔ اس کے بند ہو جانے پر وہ ریاست کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں کی فضا اس نا آئی اور انھیں دلی واپس آنا پڑا۔ یہاں مختلف رسائل و جرائد میں مضمون لکھ کر بسر اوقات کے لیے کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ آخری ایام میں اپنا ایک ہفت روزہ "کاروانِ منہ" شائع کرتے تھے، اور اس کے علاوہ متعدد دوسرے پرچوں میں بھی اجرت پر مضمون لکھتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بلند پایہ صحافی تھے۔ — وسیع معلومات، زور قلم

قوت استدلال، ان کی تحریر کا طرز امتیاز تھے۔ لیکن افسوس کہ عدم استقلال
اور مزاج کے لالچاالی پن نے کہیں جم کر کام نہ کرنے دیا؛ اسی لیے بیشتر زمانہ
افلاس اور تکلیف میں بسر ہوا۔

صلوٰت ٹونکی، محمود الحسن عرب

محمود الحسن نام تھا، لیکن چوں کہ قوم کے عرب تھے، اس لیے عام طور پر محمود الحسن عرب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے والد سید حامد عرب، نواب ابراہیم علی خان بہادر کے عہد میں ٹونک وارد ہوئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ نواب صاحب نے دو گھاؤں "جایداد اہل عرب" کے نام سے وقف کر رکھے تھے، ان سے عرب مہانوں کو تحفے، تحائف اور نذرانے دیے جاتے تھے۔ انھوں نے سید حامد کو "معرب عرب" نامزد کر کے اس جایداد کا منصرم بنا دیا۔

یہیں ٹونک میں ۱۳۱۳ھ میں سید حامد کے ہاں محمود الحسن پیدا ہوئے، تو نواب وزیر الدولہ مرحوم کی صاحبزاد اور پھر بہو (صاحبزادہ عبداللہ خان کی بیوی) رقیۃ بیگم نے نواسہ کو اپنا مقبض بنالیا۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اور وہ شاہی خاندان کے صاحبزادگان کے ساتھ پروان چڑھے۔ تعلیم کا معیار بھی بلند رہا، مختلف اساتذہ سے حبلہ درسیا

پر عبور اور ان میں پوری جہارت حاصل کی۔

نواب ابراہیم علی خان شاعر تھے، بخیل تخلص تھا۔ بعض اساتذہ عہد ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلیمان خان اسد لکھنوی، احمد حسین بسل خیر آبادی، افتخار حسین مضطر خیر آبادی، ظہیر دہلوی ان میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ نواب صاحب کے اس ذوق کے باعث پوری فضا پر شعر و نغمہ چھائے ہوئے تھے۔ داغ کے مشہور تلامذہ صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق اور کیف کی پورش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ صولت نے پورش سنسٹھالا، تو وہ بھی اسی کیف و رنگ کی دنیا میں کھو گئے، اور شعر کہنے لگے، اس میں مشورہ عاشق اور کیف سے رہا۔ دونوں استاد ماہر فن اور قادر الکلام مخمور تھے۔ بہت جلد صولت بھی اس میدان کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گئے۔ اسی سہی کسر مشق نے پوری کر دی، اور ان کا شمار اپنے زمانے کے صف اول کے شاعروں میں ہونے لگا۔

بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ درباری تعلق کے باعث ان کے کلام میں قصائد اور مدحیہ قطعات وغیرہ کا بھی وافر حصہ ہو۔ ان کی عشق و سو میں ڈوبی ہوئی نعیتیں مولود کی محظوں میں بڑی مقبول ہیں۔ تو تک کی ایک خاص صنف سخن چار بیتی ہے۔

صولت نے اس میں بھی طبع بدلت پسند کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کچھ مزاحیہ کلام بھی ہے، لیکن افسوس کہ مزاح کی وارفتگی اور لاابالی پن نے عمر بھر کلام کی تدوین سے بے نیاز کر رکھا، آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ غیر مرتب کلام ان کے ورثہ کے پاس موجود ہے۔ کاش کوئی ائمہ کا بندہ محنت کر کے اس کا ایک نمایندہ انتخاب شائع کر دے، اس طرح یہ ضائع

ہونے سے بچ جائیگا اور ان کی یادگار بھی قائم رہے گی۔

انہوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صاحبزادہ افتخار علی خان ان کے شاگرد تھے، دو سو روپے مہینہ اندر انہیں پیش کرتے تھے۔ نواب اسماعیل علی خان نے بھی سو روپے مہینہ اپنے جیب خاص سے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جاہل اہل عرب، اوردوقیہ بیگم کے خرمکے سے بھی کچھ ملتا تھا۔ لیکن چون کہ وہ دارپا بہت تھیں، اس پر گرائی کا یہ عالم کہ اس نے بڑے بڑوں کا مطلقہ جند کر رکھا ہے۔ تنگی ترنگی سے مسرافات ہوتی تھی۔

۱۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کی صبح شگلے کے کینسر کے عارضے سے انتقال ہوا۔ خیرؔ تو ایک جہانہ ہو گیا، ورنہ ہے یہ کہ جب ۱۹۶۷ء میں ان کا بڑا بیٹا پیارے میا اللہ کو پیارا ہوا تو اسی دن سے وہ گھٹنے لگے تھے۔ یہی فہم جان یسوا ثابت ہوا۔ ٹونک کے مشہور شاہی قبرستان موتی باغ کے قطعہ خاص میں دفن ہوئے۔ ہجری سال وفات (۱۳۸۷ھ) کے نام مولانا محمود الحسن صولت ٹونکی سے برآمد ہوتا ہے۔ اولاد میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ انتخاب کلام و دوح ذیل ہے۔

حدو کی پاسداری کا قول سے شک نکل جاتا

کسی صورت سے لے لیتا ہمارا امتحاں قاتل

ہر اک اس کی ادا پر خود ہی اپنی جان دی ہمنے

حقیقت میں ہیں قاتل ہیں اپنے وہ کہاں قاتل

ہیں پھر شک رہیگا عمر بھر، اپنی محبت میں

خدا کے واسطے، لے لے ہمارا امتحاں قاتل

ہو اکیوں کر نہ تیرا خاتمہ بالآخر اسے صولت!

جو اک اللہ اوم آخر بھی تھا دہوڑا نہ قاتل

مذکورہ معاصرین

نیچے کی اگراں سان جیسی شکل پائی ہے

وہ جوانان جوانان کے کام آئے مشکل

وہ کلا دل سے ارماں جو نہ تھا دل سے نکلنے کا

جسے دل سے نکالا تھا وہ ارماں و گیا دل میں

چلو یہ عرفانی شے کے ہاتھوں ہاتھ لے آئیں

حیات جاودانی لٹ رہی ہو کسے قاتل میں

سب کچھ وہی کام آئیہ قسمت میں جو نکھا تھا مجھ کو تو کسی سے بھی شکوہ نہ گلا کوئی

یہ تم نے مسکرائے حجابِ بہار میں سب گل کھلانے ہیں چمن رو دکا میں

ہوتا نہیں جو صدق سے انسان منفصل صوت ہے جو کہنا ہو کہہ دیں ہزار میں

کہاں کا نا خدا کیسا سفید ہو چہ دریا کیا خدا پر دکھ نظر لے سوے ساحل کیجئے دل

یام در مطلع انوار نظر آتے ہیں اُن کے آنے کے سے آئنا نظر آتے ہیں

حسبِ خواہِ نظارہ نہیں ہونے پاتا یوں نظر آنے کو سوار نظر آتے ہیں

اب نہیں میں ان کو نہ پہچانوں تو میرا قصور

دار نہ وہ تو ہر طرف ہیں جلوہ گر میرے لیے

زلف و رخسار کے سلامت کیا غمِ شام و بکرا

شام اک میرے لیے جو اک سحر میرے لیے

تا تو انی سے مری یہ بار اٹھ سکتا نہیں

کوہ ہے صوتِ غمِ مرگ جگر میرے لیے

رہتے ہیں آسمان و زمیں اس کی تاک میں

کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب اک بشر کے ساتھ

اے خضر! مشق کر کے گزار دو تو بات ہے

حوالاتِ حیات، غمِ مختصر کے ساتھ

مذکورہ معلوم

میں کب غم تہائی سے مضطرب ہوا تھا
کس دن ترا چاہت، بہت کا فرائض ہوا تھا
کیوں تم نے اٹھائی ہے قیامت میں قیامت
شکوہ تو تھا ماسر محشر نہ ہوا تھا
اس درد میں یہ کیسی مصیبت ہے، الہی!

اس طرح تو جینا کبھی دُور بھرنے ہوا تھا
یہ سچ نہیں کہ مزا الفتِ بہتاں میں نہیں
سکتا ہی اتنی مگر قلبِ ناتواں میں نہیں
عجب یہ الفتِ اولاد کا کرشمہ ہے
جو دل کو چین، نفس میں ہو آشاں میں نہیں
دُفرق تا بہ قدم سب ترے محاسن ہیں

کچھ اور ذکر کہیں میری داستان میں نہیں
وہ تیرا در ہے کہ سر جس پہ خود بخود جھکا جائے
کہیں یہ جذبِ کشش اور آستان میں نہیں

پریم شکر فرحت دہلوی

پرپرانے دتی وال تھے۔ یہیں ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک متمول تجارتی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ موہن لال گوئلہ کا (جو حیات میں) گجراتوں کا کاروبار ہے۔ شاید اس خیال سے کہ بالآخر انھیں تجارت ہی کرنا ہے، تعلیم صرف انٹر میڈیٹ پائی؛ لیکن اس کے باوجود انگریزی بہت اچھی جانتے تھے، جیسا کہ ان کے شیگور کی متعدد نقطوں کے تراجم سے ظاہر ہے۔ فارسی سے بھی اچھی مرادلت تھی۔ اردو کے علاوہ ہندی سے بھی شغف تھا؛ ہری دیش بھٹان کے محبوب شاعر تھے۔ اردو میں انیس و دیر کے مرثی اور اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔

اردو کا شوق بہت ابتدا میں پیدا ہوا چند سے لالہ دھرم پال گپتا و فاسے مشورہ رہا؛ اب بہت دن سے البیشور پر شاد منور لکھنؤی اور کاکل نظامی دہلوی (تلمیذ سائل دہلوی مرحوم) سے اصلاح لیتے تھے۔ مجموعہ کلام سادہ حیات کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

آخری ایام میں ایک مثنوی (ساقی نامہ) لکھ رہے تھے، جو نامکمل رہ گئی۔
ان کے جسم میں موٹاپے کے اثرات تھے، جس سے قلب کا فعل کمزور ہونے لگا
تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو اچانک اپنے دوسرے کوئی مکان میرٹھ میں حرکت
بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ کائناتِ نظامی کے قطعہ تاریخ کا آخری شعر:

اگرچہ ہے ملی تاریخ یہ
"فرط غم سے سب ہیں دو پارہ جگر"

(۱ + ۱۹۶۷ = ۱۹۶۸)

اب چند شعر دیکھیے۔

نصیب عظمتِ آدم کو لا سکاں بھی نہیں

اور آج اس سے پتی جہاں بھی نہیں

مزاچ عشق کو مرغوب امتحاں بھی نہیں

مگر یہ بات محبت پہ کچھ گراں بھی نہیں

دورِ شوق میں تعمیرِ خود کیا جس کو

سرِ نیاذ کی قسمت وہ آستاں بھی نہیں

وہ صحن و درخش، یہ غم و قرا، یہ دشتِ بیاباں کچھ بھی نہیں

جز اپنی حد پر وادِ نظر، اسے دیدہ حیراں کچھ بھی نہیں

لفظِ اندو ز تو نے سا دِ عشرت ہو چکا

مواں سمجھ کے 'بھج' پر زانہ ہو خندہ زن

یہ مل رہا ہے میری وفا کا صلابے

جواب گل میں پنہاں کون ہے، جان چمن ایسا

یہ گس کا ذکر کرتی ہے ہر اک پتی زباں ہو کر

نورنگہ معاشرہ

رہ و فایں ہر گاہ اک صدموت ہے
کبھی کبھی تو یقین پر بھی سوگماں گزرتے
ہر اک گماں نے جلایا مگر چراغ یقین
یہ حادثات مرے درک پر گزراں گزرتے

پرنس شاہدی، سید محمد اکرام حسین

ان کا اصلی نام سید محمد اکرام حسین تھا۔ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ (لودی کٹرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید احمد حسین (ن ۲۱۹۵۲) خلاصہ کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ اس لیے انھوں نے بیٹے کو ایک زمانے تک مدرسے نہیں بھیجا، تمام تعلیم بچ کے طور پر خاص استاد کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے درس نظامیہ کا مابلی اور فارسی کا بشیر نصاب پڑھا، جو بعد کو بہت کام آیا۔ اس کے بعد لامحالہ انگریزی کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے دسویں درجے کی سند لی۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے اور ایم اے (اردو اور فارسی) اور قانون (ایل ایل بی) کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔

شروع میں خیال تھا کہ وکالت کرینگے لیکن اسی زمانے میں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آیا جسے خود انھوں نے ”جذبہ باقی صدر“ سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ایک خاتون سے محبت ہو گئی اور وہ اس سے شادی

کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے لڑکی کے والدین اس عقد کے خلاف تھے۔ ہمارے ہاں والدین بچوں کے جذبات اور خواہشات کا کم ہی خیال کرتے ہیں۔ قصہ کو تاہاں باپ نے لڑکی دوسری جگہ بیاہ دی۔ عفو ان شباب اور ایسا حادثہ، غریب کو بچنے کے در دیوار سے وحشت ہونے لگی، انہوں نے ترک وطن کی تھانی اور کلکتے کی راہ لی۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہو۔

کلکتے میں انہوں نے بسر اوقات کے لیے وکالت کی جگہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شروع میں بہت دن تک مختلف اسکولوں میں معمولی بلگ اور ٹھیل مشاہرے پر کام کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے مستقل مزاج اور دھن کے پکے، ہمت نہیں ہارے اور ڈٹے رہے۔ اسی دوران میں (۱۹۳۸ء) بی بی کی سنبھلی لی، جس سے تعلیمی محکمے میں ترقی کا راستہ کھل گیا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک مدنا پور کالج میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سرنیدر ناتھ کالج، کلکتہ میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے؛ لیکن جلد ہی یہاں کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۴۶ء میں وہ کیونٹ تھریک سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی پاداش میں قید و بند تک ذہن پر پہنچی۔ ڈیڑھ سال کی نظر بندی کے بعد ۱۹۵۱ء میں رہا ہوئے تو معلوم ہوا کہ اب وہ کالج کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ایک معمولی اور مفلسی کے شکار اسکول میں ہیڈ ماسٹر قبول کر لی۔ یہاں تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ اس سے روزمرہ کے معمولی اخراجات ہی چل سکتے؛ لیکن مزاکیرا کرتا۔ حسب توقع، دو برس بعد اسکول نے دم توڑ دیا اور ان کی نوکری کے ماتھے بھی گھٹی۔ بارے، جلد بعد سبھی ایم او بائی اسکول، کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اور اب ان کو یا اظہیان کی سائنس لینا نصیب ہوئی، یہاں وہ ۱۹۵۷ء

تک رہے۔

۱۹۵۸ء کے آغاز میں کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ کھلا، تو پھر وہی جگہ پر ان کا تقرر ہو گیا؛ اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔

مرد پر ایام سے وہ ناکام محبت کا زخم مندمل ہو گیا تھا۔ اب کچھ دوی آسائش بھی میسر تھی، اس لیے انھوں نے نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک بنگالی خاتون (ذہلیک بیگم) سے شادی کر لی۔ دونوں ہم مذاق تھے، وہ بھی ایک اکوڑ میں پڑھاتی ہیں۔ جیانی یادگار ایک ٹر و سال لڑکی چھوڑی۔

انھیں ایک زمانے سے دے کا تکلیف دہ عارضہ لاحق تھا۔ آخری ایام میں بعض اور عوارض نے بھی اگلیں اٹھا، بالخصوص کم خوابی اور بے چینی کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ علاج ہو رہا تھا کہ ہر سنی ہفتے کے دن طبیعت یکا یک زیادہ خراب ہو گئی؛ گیارہ بجے رات غشی کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر پوش میں نہیں آئے اور اسی حالت میں اگلے دن اتوار ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو سات بجے شام جان بحق ہو گئے۔ پیر کی صبح کو جنازہ اٹھا اور گوبرا قبرستان (د) میں سپرد خاک ہوئے۔

پردیز کے والد سید احمد حسین شعر کہتے تھے؛ احمد ارضو تخلص تھا۔ پردیز نے جب ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد شعر و ادب کی باتیں ہی سنیں۔ چنانچہ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر سے دلچسپی لینے لگے۔ جب سن تیز کو پہنچے، تو بولانا عین الہدیٰ نثر (تلمیذ سید فرزند احمد صغیر بلگرامی) سے مشورہ کرنے لگے۔ شاہری کا جزو اپنے دادا سید شاہد حسین کے نام کی مناسبت سے اضافہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت غزل کے دور اور ماحول میں ہوئی تھی، لیکن اپنے سیاسی رجحانات کے باعث انھوں نے غزل کے علاوہ نظم پر بھی

توجہ کی! اور اس میں اپنا منفرد مقام بنا لیا۔ وہ کل منہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ”تھیں حیات“ چھپ چکا ہے (مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۶۱ء) دوسرا ”تخلیث حیات“، (الآباد میں زیر طبع ہو۔) انیسویں صدی کے انجمن نصیب نہ ہوا۔ اس کے شروع میں انھوں نے جو پیش لفظ لکھا تھا، اس میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور اپنے نظریۂ شعری پر بھی نظر ڈالی ہے۔

وہ کیونست خیال کے آدمی تھے، لیکن نہ ان کے خیالات میں جارحانہ شدت تھی، نہ ان کی وجہ سے ان کے کسی دوست کو کبھی کئی قسم کی تکلیت پہنچائی۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی انسان دوستی اور وسیع قلبی، خلوص اور حسن نیت کے قائل تھے، ان کا کلام بھی اس کا شاہد ہے!

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے

اب چند شعر دیکھیے، جو ان کے دوسرے مجموعے ”تخلیث حیات“ سے ماخوذ ہیں:

جب تک شریکِ حال کسی کی نظر نہ تھی تھی زندگی حسین، مگر اس قدر نہ تھی
وہ چشمِ شریکِ جو بظاہر ادا کرتی تھی دل ہی سے ہم کلام تھی، اس کی خبر نہ تھی

کوئی دیرِ دردم کو جا کے میخانے میں ڈال آئے

دعا لی شیخ اچھا ہے، نہ حالِ برہمن اچھا

زمانہ سازِ بی ادبی بوس کی ہر دردِ اذ کو آپ محمودِ وفا ہی کے امتحان میں رہے
ادبِ شرکت ہی نہیں احساسِ یکجائی کو آج

مفتیس تو عشرت کتنی دل تہنہ میں ہیں

سزوکہ عاصم

دل والوں کی خاموشی ہی، بادِ سماعت ہوتی ہے

بے آوازی کربِ فضا ہے، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

جیسے بدلتی آوازیں ہیں، شام دس بج کر کھاتی ہیں

وقت کا دم کی ٹوٹ گیا ہے، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

سکتے تک اب آپہنچا ہو، بڑھتے بڑھتے کرسکت

ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہو، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

شاید نگاہ پہنچے۔ اب وسعتِ زمین تک پلٹا آئے تصورِ تنگ آگے آسمان سے

سب کے سب داغ بنے ہیں، بادِ کش کوئی نہیں

میکدے میں اب وہ قدرِ لغزشِ پیہم کہاں

آنسوؤں میں غرق ہو جاتا ہو دل کا اضطراب

غم پرستوں کے مقدر میں شعورِ غم کہاں

دیرانیوں نے بڑھ کے بانی ہیں بستی اب کہ وہ دشتِ زم کوئی دیرانیوں سے

ہے زندگی تعاونِ عقل و جنوں کا نام دل سے سلوکِ ذہین و قیادِ کجیوں سے

ہر دایت نے کیے تیرے ہی بت کو سجھ ہر بغاوت مجھے تیری ہی پرستار ملی

منزل بھی نیگی رستے میں اتم راگِ زور کی بات کرو

آغازِ سفر سے پہلے، کیوں انجامِ سفر کی بات کرو

ظالم نے لیا ہے شراب کو پھر گوشہِ داماں چٹکی میں

ہے وقت کہ تم جیا کی سے اب دیدہ ترکا بات کرو

آیا ہے چمن میں موسمِ گل، آئی ہیں جوانیِ زنداں تک

دیوار کی باتیں ہو لینگ، اس وقت تو دور کی بات کرو

ہے تیز ہوا، جتا ہے قفسِ خطرے میں پڑی ہو ہر تیل

نہ زیادہ سیرِ بند کرو، اب جنبشِ پر کی بات کرو

کیوں دارودسن کے سائے میں منظور کی باتیں کرتے ہو؟
 دکھ ہے جو اپنا سرا و نچا اتواپنے ہی سر کی بات کرو
 کیوں اہل جنوں ابوابِ خود کی عقل میں خاموش رہیں
 وہ اپنے سبز کی بات کریں، تم اپنے سبز کی بات کرو
 کیا ربط و دف دم توڑ چکے، موت آگئی یا کیا ہر نغمے کو
 تم مطربِ جام دینا ہو رکھو تیغ و سپر کی بات کرو

بے چہرگی

ہزار چہرہ آدمی	ہزار پوست استخوان
معاشیاتِ حرص کا اہلِ خلفا رہو	ہزار لبِ فخر کی
بحجم انتشار ہے	ہزار پردہ آشکنی
نظامِ بے ہمار کا عظیم شاہکار ہے	ہزار حیلہ بے دلی
ہزار چہرہ آدمی	ہزار عشوہ خود سری
محد اپنا چہرہ ڈھونڈتا	ہزار غمزہ عاجزی
دواں دواں	ہزار بچ آگئی
ابھی یہاں	ہزار عقدہ ابھی
ابھی دہاں	ہزار بعبہ خاموشی
نہ کوئی سمت زمین میں	ہزار مرگ زندگی
نہ کوئی راہ سامنے	غردِ برتری کے ساتھ اختلاجِ کتری
فقط فریب کا رہی ان کی گرد آدڑھ کر	یہ پارہ پارہ آدمی
کبھی ہو دوڑنا ادھر	یہ ریزہ ریزہ آدمی

کبھی ہے بھاگتا ادھر! ہزار چہرہ آدمی
 ہو کون اس کا ہمسفر؟ ہزار چہرگی لیے
 خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ بھٹک رہا ہو بے ارادہ صرف اپنی تلاش
 کھو گیا، دوبارہ وہ یہ کیا؟ کہ اس کو۔۔۔۔۔
 تھا دن آئیے کا بھی فریب ہی فریب! چہرہ چاہیے۔
 نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہو خود اپنا چہرہ چاہیے۔
 خود اپنے چہروں کا ہجوم درطہ نگاہ ہوا وہ اصل چہرہ چاہیے
 د کوئی نقش منفرد! بچہ کے جو سسک رہا ہے
 نہ کوئی عکس معتبر چہروں ہی کی بھیڑ میں

بینک

یہ کنشت و کلیسا، یہ دیو و جرم
 سب کے سب بینک ہیں کفر و دی کی کلم
 حصہ داری سیاست کی ہے غم بہ غم
 چمک کی صورت یہاں روز ٹھنٹے ہیں ہم
 روز ٹھنٹے ہو غم

تختے افسانے بنا کر دکھیے تھے شوق نے یوں نقاب الٹی حقیقت نے کہ حیلوں کر دیا
 کس قدر مضبوط نکلے تیرے یوانے کے آٹھ شام غم کو جب پھوڑا، صبح تاپاں کر دیا
 ہے حیات اک شور و شمس منزل آخرت کی آتی جاتی سانسوں کو زندگی نہیں کہتے
 وقت گزرا جو بے خیالی میں وہ ترسے ہی خیال میں گزرا

مرنے کے لیے پختل شوق کی ہے شرط جینے کے لیے تو ہوسِ خام بہت ہے
 وعدہ نہیں ہے کوئی اگر ان کا انتظار پردِ نازِ صبحِ شام کیے جا رہا ہوں میں
 شکایت کر رہے ہیں اب اسجدہ ہاے راہِ گناہ سے
 نہ دیکھا جائیگا اب اسوے آستانِ مجھ سے

فقیر سید وحید الدین

جن اصحاب کو ہمارا ہمارے بھیت سنگھ (۱۷۹۲-۱۸۴۹ء) کے حالات کے مطالعے کا اتفاق ہوا ہے، انھیں یاد ہوگا کہ ان کے دربار کی ایک نمایاں شخصیت فقیر سید عزیز الدین کی بھی تھی۔ وہ کچھ عرصے ہمارا ہمارے وزیر بھی رہے۔ سکھ دورِ سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی ان کے خاندان کی علم و ادب سے دلچسپی اور وضع داری قائم رہی۔ فقیر سید وحید الدین اسی نامور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

فقیر سید وحید الدین کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں اپنے کئی دوستوں کی طرح انھوں نے بھی فوجی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس میں کرنل کے عہدے تک ترقی کی۔

انھیں اقبال سے عشق تھا، ان سے ذاتی تعلقات بھی ایک زمانے تک رہے چنانچہ انھوں نے اقبال کی زندگی سے متعلق تصاویر کا ایک مجموعہ (المجموعہ) اقبال ان پکچر کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لگاؤ فقیر (دو حصے) کے نام سے ایک کتاب شائع کی، جو طباعت و کتابت کے پہلو سے بھی اردو کی چند بہترین

مکتبوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان اقبال کی مشہور رباعی سے لیا گیا۔

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید نیسے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارِ این فقیر سے وگر دامنے باز آید کہ ناید

اس کتاب میں انہوں نے اقبال کے حالات دیکھے ہیں، جو خود ان کے علم میں تھے یا ان کے عزیز دوستوں کے۔ اگرچہ یہ کتاب کوئی مسلسل سوانح عمری نہیں ہے، لیکن اس میں بعض بے حد قیمتی معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ کسی زمانے میں اقبال سے متعلق انہوں نے فیض کے تعاون سے ایک فلم بھی تیار کی تھی۔

فقیر سید وحید الدین نے حضرت رسول اسلام صلعم کی سوانح عمری (صمن اعظم) بھی لکھی تھی۔ یہ ان کی بہت مقبول کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اپنے سمعہ و نظر سے متعلق تاثرات اور یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ 'انجمن' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اور بھی کچھ چھوٹی بڑی تحریریں ان سے یادگار ہیں۔

اسٹوس ۱۱، کابروڈ منسٹر ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی شرافت اور وضع داری اور علم و ادب کی سرپرستی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی۔ ایک شخص تھا امین چند، سیلانی قسم کے انسان تھا۔ ۱۸۵۱-۱۸۵۲ء میں اس نے ملک کے بعض حصوں کی سیاحت کی اور بعد کو اس کے کوائف کتابی شکل میں 'سفرنامہ منشی امین چند' کے عنوان سے ۱۸۵۹ء میں شائع کر دیے (مطبع کوہ نور لاہور) اس میں وہ لکھتا ہے (ص ۴۳) کہ فقیر نور الدین اور فقیر عزیز الدین، دراصل قوم کے ختام تھے۔ بظاہر بہت غلط معلوم ہوتی ہے۔ خدا معلوم، اس کا ذریعہ معلومات کیا تھا۔

شفاء گوئیاری، سید محمد حسن

ان کے والد سید عوض علی طبابت کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ خاندان دراصل قانم گنج (ضلع فرخ آباد - یو پی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جد امجد نقل مکان کر کے گویار میں جا بسے تھے۔ سید محمد حسن یہیں گویار میں دو شنبہ ۱۲ رمضان ۱۳۳۰ھ (۲۶ دسمبر ۱۹۱۲ء) کو پیدا ہوئے۔ ہمارے نام منظر علی تھا، جس سے ۱۳۳۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

سید عوض علی اچھے طبیب تھے، لیکن اس سے کئی زیادہ کٹر مسلمان تھے۔ وہ بیٹے کو عالم دین اور فقیر شہر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار برس ہی کی عمر میں یہ ایک مولوی کے سپرد کر دیے گئے اور قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا، اس کے بعد فارسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اگر ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۹ء) میں ان کے والد کا (بمقام ۱۰ سال) انتقال نہیں ہو گیا ہوتا، تو یقین ہے کہ یہ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد کسی دینی درس گاہ میں مدرس بن جاتے یا پھر کسی مسجد کے پیش امام۔ لیکن جب اس کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو ان کے بیٹوں مولوی احمد زمان

نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم زیادہ باقاعدگی سے ہونے لگی۔ عربی ختم ہو گئی اور یہ اردو فارسی کے ساتھ انگریزی اور مراٹھی بھی پڑھنے لگے۔ اب انھوں نے میونسپل اسکول، لشکر گاہیاد میں داخلہ لے لیا جتنی کہ یہاں سے دسویں درجے کی سند حاصل کرنی۔ چونکہ نئی حالات آگے تسلیم جاری رکھنے میں مانع تھے، اس لیے انھوں نے طبی سند (M.B.) حاصل کرنی۔ اور ریاست گواہیار کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تقسیم ملک تک وہ گواہیار ہی میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب یہاں کی فضا مکدر ہو گئی، تو ہجرت کر کے بمبویا چلے گئے۔ یہاں شفا ٹیکل ہال کے نام سے اپنا مختصر ذاتی مطب اور دواخانہ کھول لیا اور یوں عزت و آبرو سے بسر کرنے لگے۔

انھیں تفکرات دنیا اور خامسے بڑے کہنے کی پرورش کے بارے پریشان حال کھل جسم بھی مٹنی اور اکبر انتھا، اس پر تنفس اور شعل کے پرانے مریض تھے۔ انھوں کی بیماری بھی لاحق تھی، اور اسی کے علاج کے لیے بمبویال کے ٹی بی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ ستمبر ۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء سات بجے شام اسی ہسپتال میں انتقال ہوا۔ جنازہ اگلے دن صبح اٹھا اور دوپہر کے قریب قبرستان کے باغ میں سپرد خاک ہوئے۔ بسمل و تلاوی نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

شستہ گو، پختہ گو، امیر سخن بزم سیلاب کا سر طلعت

وقت آتا تھا یہ بھی اے بہن! دود و دل دے کے ہوشفا رخصت

مرحوم نے شاعری ۱۹۲۴ء میں شروع کی۔ ہونہار بردار کے چٹکے چکنے بات بہت جلد ان کا کلام پسند کیا جانے لگا جس سے انھیں ۱۹۳۵ء میں ایک مختصر مجموعہ "گلہ سٹہ شفا" کے نام سے شائع کرنے کی جرأت ہوئی (شمس پریس، گواہیار)۔

اس میں صرف ۳۲ غزلیں اور ۳۲ ہی صفعات ہیں۔ ابھی تک انھوں نے کسی اتراو

سے مشورہ سخن نہیں کیا جی گوشتی سخن جاری تھی۔ بالآخر کئی دروازوں پر دستک دینے کے بعد ۱۹۴۰ء میں سیلاب اکبر آبادی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ پانچ سال بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں استاد نے مصروف فارغ الاصلاح قرار دے دیا، بلکہ دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ گواہیاد کا ماحول جو کچھ تھا (اور اب بھی ہے) اس میں کسی علمی و ادبی یا شاعرانہ صلاحیتوں کے نمایاں ہونے اور ترقی کرنے کا موقع معدوم تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں وہ بھوپال منتقل ہو گئے، تو یہاں کا گرد و پیش سراسر ان کے سازگار ثابت ہوا۔ شہر میں اچھے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ذکی وارثی (ف ۱۹۵۰ء) اور محمد یوسف قیصر بھوپالی (ف ۱۹۶۸ء) جیسے اساتذہ یہاں موجود تھے۔ شفا بھی ان حضرات کے یہاں آنے جانے لگے، اور انھیں خود اعتراف تھا کہ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

یہیں بھوپال میں انھوں نے اپنے متعدد مجموعے مرتب کر کے شائع کیے، آیات شفا (غزلیات: ۱۹۵۱ء)؛ نبض حیات (غزلیات: ۱۹۵۵ء)؛ شاخ زیتون ربابیتا اور نفلیس؛ رگ حیات (نفلیس)؛ دھم گل (غزلیات: ۱۹۶۳ء) اب بحیثیت شاعر انھیں مستلہ مقام حاصل تھا۔ ان کی فنی معلومات بھی بہت وسیع تھیں، خاص طور پر عروض کی واقفیت بہت اچھی تھی۔ ان کا حلقہ تلمذ کوئی ۴۰ شاگردوں پر مشتمل ہو گا۔

اتنی معنوی اولاد کے ساتھ مرحوم دینی لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے، دو بیٹوں سے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

اب کچھ کلام ملاحظہ کیجیے، جو ان کے مجموعے 'نبض حیات' سے ماخوذ ہیں:-

سجھو سامشعلوں پر تا کجا نالے کار داں والو!
 خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

مذکورہ معاصرین

جہاں سے تو دورا پہچان لے، اپنی حقیقت کو

وہیں سے فرض ہو جاتا ہے تجھ پر، احترام اپنا

کیا ہوئی تیری نگاہ ہر سہ سہارا کیوں افق سے ناگتا ہے تو، سحر؟

عزم دل کی کو بڑھائے تو کوئی رہ گزرخود، ہے چراغِ رہ گز

نگاہِ دل کے پر تو سے کریں شام و سحر روشن

مردِ خویش کی تائید کی تک بات کیوں پہنچے!

محبت کی کہانی ہو کہ نفرت کی حکایت ہو

کس کی بھی سہی، لیکن کس تک بات کیوں پہنچے

بھورپے مایوس پس یہ جو مسلسل مجبور کے مایوس کے، کیا دل نہیں ہوتا؟

اباد رکون سے گل رہ گئے ہیں کھلنے کو ابھی، خیر ہو، کیوں مسکرائے دیوانے

زمین سے گزر رہے ہیں، یا آسمان سے گزر رہے ہیں

جہاں کو ساتھ لیا ہے، جہاں سے گزر رہے ہیں

نہ پڑھیے، کششِ منزلِ عزمِ حبا ناں

یہیں کے ہو گئے، جو بھی جہاں سے گزر رہے ہیں

وہ جب دیکھتے ہیں کبھی میری جانب

تو میں جانبِ آسمان دیکھتا ہوں

کہانی کی یاد، کس کا نوکر، اس کی بزمِ رنگیں میں

ہمارا نام بھی اب تو براے نام آتا ہے

خدا شاہد کہ دل سے تو خدا کا نام لیتا ہوں

مگر لب پر جب آتا ہے، بھٹا رانا نام آتا ہے

زندگی ہے اک مسلسل سوز، اپہیم اضطراب
سستی حاصل سے قریب اور سستی لا حاصل سے

دل میں ہے عوہم مسلسل، عوہم میں پیہم تڑپ
ہیں وہی کچھ پاس منزل کے، جو ہیں منزل سے
حدِ عنوان سے آگے، آخر اٹھانے کہاں جلتے؛

تری مغل سے بڑھ کر، تیرے دیوانے کہاں جاتے
غمِ دہراں نے بڑھ کر، نو بڑھادی شمع ہستی کی
غمِ جاناں کے یہ بھٹکے ہوئے، جانے کہاں جاتے
یہ رموز کی ہو شانِ بے نیا دی، سا قیہ بورن

نہ جانے تم کہاں ہوتے، یہ میخانے کہاں جاتے
بھٹکتے پھر رہے ہیں مرنے والے جو پے منزل

یقین کی راہ پر آجائیں لے کر وہ گماں اپنا
ہر اک شکوہ بجا، لیکن ذرا اتنا تو کھادو

نظر سے غیر کی کیوں دیکھتے ہر گلستاں اپنا
سہارا بنجود ہی کا کیا، جڑوں کا آسرا ایسا

دوا ہی کب ہے دغل، ماسوا اصلِ محبت میں
میری ہی عہدِ یہ آنکھیں، ابھد کو کرتیں مغل

ان کے لب پر میرے اشکوں کا جواب آیا تو کیا؟
داغِ ناکا ہی تو اب بھی اسے جہیں سے منتقل

لاکھ ان کے آستان سے کامیاب آیا تو کیا؟
اد توجہ کرنے والے! شکر یہ جب مت چکا

اب خیالی پرستشِ خانہ خراب آیا تو کیا؟

مذکورہ معاصرین

عکاش برکوش نظر میں، لب پر حسیں ترانہ

ہر اک ادا ہے ان کی، الفت کا اک فراز

اب تک نگاہ میں ہو، پہلی نگاہ ان کی

منہتی رہی محبت، لٹا رہا نہ مائدہ

کیا ہو بیاں کسی سے تعنیر حسن و الفت

شعلوں کی اک کہانی، شبنم کا اک فراز

عجب ہو فطرت انسانیت کو انساں کو

یقین کی حد میں بھی لاکھوں گہاں گزرتے ہیں

دفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے

جہاں سے رک کے ذرا دو جہاں گزرتے ہیں

جو ان کی یاد سے خالی ہوں، ان کے ذمے بڑا

حیات پر وہی لمحے گراں گزرتے ہیں

دعا میں ستم دشمنان کو دیتا ہوں

نظر سے جب کرم دوتاں گزرتے ہیں

خوش بیاں تلخی گفتار تک آ پہنچے ہیں

سینہ مٹھلی سے لب خاں تک آ پہنچے ہیں

کس لیے دانستہ ہم کھائیں فریب حسن و حقیقت

کیوں غلط تائید و بطر شعلہ و شبنم کریں!

ظلمتیں گھٹنے کا آخر، اور کب تک انتظار

لاؤ، باقی رات کو بڑھ کر سحر میں ضم کریں

جو برا کہتے ہیں عالم کو، انھیں یہ چاہیے

پہلے اپنے آپ کو شایعہ عالم کریں

مذکورہ معامریں

ڈرتے ڈرتے کا مشورہ دینے کو عرفان تھا

بے خبر تھے خود، جو ہم کو بے خبر سمجھا کیے
اتھ تک ہم نے فروغِ دل پہ نظریں نہ کیں

ہر دم پہ منحصر اپنی محسوس سمجھا کیے
نہی اسی کا نام، دل کا سودا، معراجِ حیات

آدھی کو جب خوشی میں غم نظر آنے لگے
آدھی بہار تو اس وقت جباے

صحنِ پن میں خار بھی جب سکا سکے
اس ہی کو مسکانے کا حق ہے حقیقتاً

آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور ہکرا کے
ہیں وجہِ انفعال، خود اپنی مسیاہیاں

یوں دردِ شامِ غم پہ محسوس سکا سکے!
اگر غم کی ہوئی یوں کا رخصتی تو کیا ہوگا؟

دہی ہوتے ہوئے بھی ان کے تہائی، تو کیا ہوگا؟
جن سے گم ہو جائیں راہی، کچھ نشان ایسے بھی ہیں

زندگی کے راستے میں، امتحاں ایسے بھی ہیں
ظلم میں جن کے کرم ہے، لطف میں جن کے ستم

مہرباں ایسے بھی ہیں، مہرباں ایسے بھی ہیں
تو نے حالات کو مجبور کیا ہو خود بھی

کچھ خودی سے اور مطلبِ بخودی سے
کون کتنا ہے کہ مجبور تو حالات سے ہو؟

اوجھڑا ہے، ادھر کلیاں، ہر مصروفِ گراں خوابی
اگر ایسے میں پیغامِ سحر آیا، تو کیا ہوگا!

چلے تو ہیں تلاشِ آتاں میں، اے شفا! ہم بھی

مگر اپنا ہی پہلے سنگِ دریا تو کیا ہو گا !

جب اٹھی ہے چمک کوئی دل میں دوزخِ روشنی ہو گئی ہے

اے غمِ معتبر! ترے دم سے زندگی کام کی ہو گئی ہے

عالمِ رنج و حراں نہ پوچھو ہر خوشی خواب سی ہو گئی ہے

یوں پر ان کے حیاتِ آخر میں ہنسی نہ رہی

گلوں میں روح، ستاروں میں روشنی نہ رہی

خدا شناسوں کی پہچان ہی کوئی نہ رہی

کہ سرکشی بھی باندازِ سرکشی نہ رہی

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے

چراغِ جلتے رہے، اور روشنی نہ رہی

بنائے ہم نے، شفا! دوستی کے وہ ڈھانچے

کہ دشمنوں کو تناسے دشمنی نہ رہی

امین حسین خواجہ محمد مسیح پال

خواجہ محمد مسیح پال ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر عبدالمسیح پال اور صہبائی (ف ۱۹۶۳ء) ان کے برادرِ غمِ دوست تھے۔ ان کے والد خواجہ احمد دین پال عالمِ دینیات اور بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تعلیم بھی عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ اس مرتبہ کو یہ فخر حاصل تھا کہ اقبال کی طرح انھوں نے بھی شمس العلماء سید میر حسن (ف ۱۹۲۹ء) سے عربی اور فارسی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی اور بالآخر بی اے کی سند منان کا لچھ سیالکوٹ سے حاصل کی۔ ملازمت کا بیشتر زمانہ محکمات کی پولیٹیکل ایجنسی میں گزرا اور یہیں سے نشن پائی۔ ان کی خدمات کا اعتراف انگریزی حکومت نے خطابِ خان بہادر سے کیا۔ اگرچہ شعر و سخن کی طرف میلان سید میر حسن کے تلمذ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس کا آغاز ۱۹۰۲ء میں ہوا، جب ان کی پہلی غزل لکھنؤ کے مشہور مغلہ ستے 'پیامِ یار' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے تمام

اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن زیادہ تر غزل اور نظم سے مزادلت رہی۔ ہماری پھلی دہائیں اقبال سے متاثر ہوئی ہیں اور ان سے بیشمار لوگوں نے ان کے بقیے کی کوشش کی، لیکن کامیابی الّا ماشاء اللہ معدودے چند کو نصیب ہوئی۔ ان چند خوش نصیبوں میں امین حویسی کا نام سرفہرست ہو، جیسا کہ ان کے مجموعہ کلام "گلِ بانگِ حیات" کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ اسرارِ حیات کی تفسیر بغیر اخلاقیات اور اہلیات سے شغف، غفلتِ آدم اور عمل کی برتری ان کے تجلی دل پسند موضوعِ سخن ہیں۔ ان کا ۱۴ اگست ۱۹۶۰ء کو سیال کوٹ میں انتقال ہوا اور وہیں مشہور قبرستان "امام صاحب" میں سپرد خاک ہوئے۔ اسی قبرستان میں علامہ اقبال مرحوم کے والدِ بزرگوار شیخ نور محمد اور برادرِ اکبر شیخ عطاء محمد علی آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ کلام کا نو ذہبِ ذیلی ہے۔

درِ دلِ اصل میں تھا دلِ جوشِ نو جس سے بدائے ناچیز شجر ہو کے رہا
عشق میں جوشِ عبودیتِ دلِ دبِ نہ سکا کہیں کسو، کہیں نالہ، کہیں پرہو کے رہا
میں نہ کہتا تھا کہ لے دیدہ تر، ضبطِ کامِ خونِ دل ہو کے رہا، خونِ جگر ہو کے رہا
لائے چسے ہیں جان کے، جینے کا اہتمام کر

جن میں ہو کیفِ زندگی، بہرِ خدا وہ کام کر

مجھ کو تری ہی آنکھ سنے دیکھ رہی ہوں کائنات

بات یہ راز کی نہیں، اپنا خود احترام کر

پھونک دے نغمہ جاسوز سے سامانِ نفس

بلبلِ تفتہ جگر ! شکوہ صبا و نہ کر

لطفِ جینے کا ہو جب ہی کہ دل مستِ خودی

آسمانِ تم سے یہ کہ دے ہری ادا و نہ کر

یاس میں پھوڑ کے سرمے ہیں کم ظرف! این!

ظرف عالی ہے ترا، بیعتِ فرادہ نہ کر

تفکرات کی دنیا میں جیتوئے سکون علاج جس کا نہیں کوئی، ہو ہی وہ چوں

اسی کے خون سے رنگیں ہو داستانِ حیاتِ محال ہو کہ چوں اور بیقرار نہ ہوں

افسانہ حیات کو دہرا رہا ہوں میں بوں اپنی عمر رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں

رستے کے ادبِ پنج سے واقف تو ہوں میں ٹھوکر قدم قدم پہ مگر کھار رہا ہوں میں

دے اس آگ کو تارِ خلیل سے نسبت

کہ جس کے سوز میں گلزارِ جاودا نہ نہیں

شکستِ محبتِ عالی ہو، بخود ہی کی تلاش

کہ کارخانہ ہے دنیا، شرابِ خانہ نہیں

بلبلِ سوختہ سماں سے شاہو میں نے

عشق اک آتشِ بے شعلہ ہے، گلزارِ حسن

صاف آتا ہے نظر، دیدہ بنیا کو یہی

عشق، اقراءِ حقیقت ہے، اور اظہارِ حسن

عشق بیچارہ ہی آگاہ نہیں ہے، اور نہ

روزِ شوق سے خود اس کا طلبگار ہو حسن

اس حقیقت کو خدا را نظرِ اعجاز نہ کر سرد ہو جاتا ہو وہ شعلہ، جو بیباک نہ ہو

اگر شمعِ حقیقت کی ضیا باری نہیں ہو

تقل کو کہاں سے آگئے آدابِ پروا؟

وہی اس بزمِ ہستی سے سرد اندوختے ہیں

لگا ہی جن کی ہوں بیباک اور اطوارِ مردانہ

اک برق ہو جو ہم تقاضا لیے ہوئے جانے، میں آگیا ہوں یہاں، کیا یہ ہوئے
 اک تو کہ ہے حجاب نہ ہونا تری اداسی میں کہ شوق دید کی دنیا لیے ہوئے
 اک تو کہ اپنے حسن کی ہوا آپ ہی دلیل اس میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لیے ہوئے
 یہ نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے اس دل بڑ دہار کے صدقے
 وہ کریں مجھ سے احتساب وفا ایسے روز شمار کے صدقے
 غرق حیرت ہو چشم بچم سحر آنکھ کی اشک باریاں، تو بہ!
 خاک سے رنگے ہو کا یہ طوفان وقت کی دستکار یاں، تو بہ!

دریا کے تنوع میں دریا کی خودی پنہاں

گو ہر کے تھیل میں قطرے کی خودی پنہاں
 ہر چند خودی سے ہوا، ارضی کہ سادی ہو

مہر و مہر دا بچم میں ان کی ہے خودی پنہاں
 نگاہ شوق کے اعجاز کا نہ ہو منکر نجم مشور کا جام جہاں نما ہے یہی
 تڑپ سے اس کی نہ ہو بیقرار ڈالنے والی جہاں بس شور ہو جس کا وہ ارتقا ہے یہی
 خیالی محض کجا، اور کجا عمل نا داں! سراپ ہو نہیں سکتا، علاج تشنہ بس
 وہ ایک صیبر توبوں ہو فلک کی نظروں میں عزیز جس کو نہیں، شیوہ جفا طلبی
 ہر کام کو احساس سے نسبت ہے اضافی

اور شدت احساس ہی کا نام ہے مشکل
 جس شخص کا احساس نہیں عزم کے بس میں

تاکس ہے وہ، اُس کے لیے ہر کام ہے مشکل
 پر تو ہر لا مکاں ہے حسن ایک تنویر جاوداں ہو حسن
 ہستی کا ثبات ہو اس سے رونق بزم انس و جان ہو حسن

مذکورہ معامریں

مہ اگر جستجو ، تو عام ہے حسن سامنے دل کے صبح و شام ہو حسن
ہوا ہوس کی ، ایسے بلا جانے اک حقیقت ہے جس کا نام ہو حسن

لا الہ الا اللہ

حرمِ نازِ خداوندِ ناز کی سو گند	نگاہِ پاکِ دلِ پاکِ باز کی سو گند
قسم ہے حسن کے اندازِ بے نیازی کی	جبینِ عشقِ سراپاِ نیاز کی سو گند
قسم ہے غزلوی بیتِ شکن کے بازو کی	کعبہِ ذوقِ ورازاِ باز کی سو گند
قسم ہے ہر دمہ و انجمِ درخشاں کی	کرشمہِ فلکِ شیشہِ باز کی سو گند
قسم ہے عکسِ رُخِ ہر دمہِ طلعت کی	کمالِ صنعتِ آئینہ ساز کی سو گند
قسم ہو مطربِ بہتی کے ذوقِ نغمہ کی	اور اس کے دروہرے تارِ سا کی سو گند

ملی ہو جس کو مے لا الہ الا اللہ
وہ زندہ میکرہ مفضوب ہو نہیں سکتا

نجیب اشرف ندوی (سید)

ان کا وطن واسطہ تھا، جو بہادر شریف (ہمارے) سے سات میل مشرق کی طرف ایک بستی ہے۔ سید نجیب اشرف اور سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) یکجہری تھے۔ دونوں کے پردادا میر غفلت علی تھے۔ میر غفلت علی نے اپنی زندگی میں دیکھا کیے۔ بڑی ہلکے سے حکیم میر محمدی ہوئے؛ اور چھوٹی سے ہاشم شیر کے حکیم محمدی کے بیٹے حکیم ابوالحسن تھے، جو والد تھے سید سلیمان ندوی مرحوم کے اور ہاشم شیر کے بیٹے ڈاکٹر محمد مبین تھے۔ یہی نجیب اشرف ندوی کے والدین مرحوم تھے۔

ڈاکٹر محمد مبین سرکاری ملازمت میں تھے اور اسی سلسلے میں ان کا بیشتر زمانہ سی پی (مدھیہ پردیش) میں گزرا۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے بسکدوش ہو کر پنشن پائی اور اس کے بعد راجپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ان کا ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو انتقال ہوا۔

سید نجیب اشرف ۶ جون ۱۹۰۱ء کو آرموری (ضلع چاندہ، مدھیہ پردیش)

میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد سے پائی۔ اس کے بعد سرکاری اسکول میں بھیجے گئے۔ ایک تقریب میں شمولیت کے لیے ڈاکٹر محمد مبین خاندان سمیت اپنے دلہانے گئے تھے کہ وہاں سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی، جو اس زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے کہا کہ آپ سید نجیب اشرف کو تعلیم کے لیے دارالعلوم بھیج دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ قبول کر لیا۔ چنانچہ نجیب اشرف ۱۱۰۵ھ میں جب کہ ان کی عمر بمثل آٹھ برس کی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کا شکامہ بڑا تھا، جس کے نتیجے میں بالآخر مولانا شبلی ۱۹۱۳ء میں یہاں کی سکٹری سے دستبردار ہوئے تھے۔ سید سلیمان بھی اس سے قبل ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور مفتہ دار اخبار اہلال کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی غرض سے کلکتے جا چکے تھے۔ ایسے میں نجیب اشرف بھی ندوہ چھوڑ کر اپنے چلے گئے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہیں اپنے میں انھوں نے دسویں درجے اور انٹر کے امتحان پاس کیے (۱۹۱۹ء) وہ بی اے کے درجوں میں ذریعہ تعلیم تھے، جب ملک میں ترک موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ بھی کالج چھوڑ، قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس میں انھیں متعدد سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے رحلت کی۔ اس کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم نے اعظم گرام میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے سید نجیب اشرف کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں رہنے سے انھیں تصنیف و تالیف سے رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے ہاتھا گاندھی کی بعض انگریزی

کتابوں کا ترجمہ کیا 'سوداچ' اور 'رمنہا' نے صحت اور ترک موالات دوسرے ممالک میں 'عجب سیاسی تحریک میں تعطل پیدا ہو گیا، تو انھوں نے دوبارہ اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ ان کے چھوٹے بھائی 'سید علی اشرف' اس زمانے میں کلکتے میں تھے۔ ان کی تحریک پر یہ دہاں چلے گئے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی اور ۱۹۲۶ء میں ایم اے کی سند حاصل کی؛ دونوں امتحانوں میں درجہ اول پایا۔

تعلیم ختم کر لینے کے بعد وہ مستقلاً دارالمصنفین کے رفیق بن گئے؛ یہاں انھیں سو روپے ماہانہ کی قلیل رقم بطور وظیفہ ملتی تھی۔ اسی زمانے میں دارالمصنفین نے رقعات عالمگیر کی ترتیب و تدوین ان کے سپرد کی تھی۔ یہ کام انھوں نے مورخ شہیر سرحد و ناتھ سرکار کی نگرانی اور رہنمائی میں کیا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد رقعات عالمگیر اور رقعات عالمگیر (جلد اول) شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ مفید کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میں نے دوسری جلد کے مسودات مرحوم کے پاس دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں جوں کا توں شائع کر دینا چاہیے، ورنہ یہ بھی ضائع ہو جائیگے۔ زمانہ قیامِ عظیم گڑھ میں وہ عادت کی ترتیب میں بھی سید سلیمان مرحوم کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔

۱۹۲۰ء میں وہ گجرات کالج، احمد آباد میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ اگلے ہی برس ۱۹۳۱ء میں حکومتِ بہمنی نے اسماعیل یوسف کالج قائم کیا۔ اس پر سید غیب الرحمن گجرات کالج کی ملازمت ترک کر کے بہمنی آ گئے اور اس نئے کالج میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اسی ادارے میں رہے اور یہیں سے ۱۹۵۵ء میں انپشن پر سکندرشہن ہوئے۔

انھوں نے بہمنی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مضافات کے علاقہ اندر

میں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا۔ وہ بھٹی کی تعلیمی، ثقافتی، سماجی زندگی کا جزو لاینفک تھے اور سب حلقوں میں، اندوی صاحب کے علم سے معروف تھے۔ جب وہ ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے الگ ہوئے، تو انجمن اسلام نے انہیں اپنے نئے ادارے اردو لیریچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ اپنی وفات تک رہے۔ ادارے کا تھا ہی رسالہ نواسے اب بھی انہیں ملتی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

ان کی آخری شائع شدہ کتاب لغات گہری التھی، انہوں نے تصنیفی کام زیادہ نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ تھی۔ وہ حکومت کی اور مختلف تعلیمی اداروں کی اتنی کلیٹیوں اور بورڈوں کے رکن اور مشیر تھے کہ لکھنے پڑھنے کے لیے ان کے پاس کوئی وقت بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح ان کی علمی صلاحیتیں گویا پوری طرح بروئے کار نہ آ سکیں۔ اس سے ہمارے بعض دوستوں کا علم کو سبق لینا چاہیے، جو اپنا وقت غیر علمی کاموں میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔

جمعرات ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو دوپہر کے وقت سہنی اسپتال میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن شب میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور اہل لا قبرستان میں اپنی مرحومہ بیگم کے برابر دفن کیے گئے۔

میرے ان سے بیس برس کے تعلقات تھے۔ ان کے سے بلند اخلاق، وضع واد بامروت، سیر چشم دوست اب کہاں ملینگے ! اِنَّمَا لِلّٰہِ وَاٰلِہٖٓ رَاجِعُوْنَ

محمد مقتدی خان شروانی

پڑھے مکھے حضرات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کی اردو مطبوعات پر ایک زمانے سے یہ چھاپا ہوا پڑھتے آئے ہوئے : بابہام محمد مقتدی خان شروانی۔ افسوس! ان مولوی حاجی محمد مقتدی خان شروانی کا ۷ دسمبر ۱۹۶۶ء کو علی گڑھ میں انتقال ہو گیا! انھوں نے اس مصلح کے اور بعد کو اپنے ذاتی مصلح شروانی پر تنگ پریس، علی گڑھ کے ذریعے سے اردو کی طویل خدمت کی۔ وہ خود بھی مصنف اور مؤلف تھے۔ اگرچہ انھیں اس سے کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ ہم ان کے حالات قلبند کر کے جہاں ایک فنکاران کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں، وہیں

نام نیک رنگاں ضائع کن

کے مصداق سمجھتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اس قابل ہیں کہ ہمارے فوجوان ان کے نقشِ خدا پر چلنے کی کوشش کریں۔

مندستان کے مشہور شروانی ٹھکان خانہ کی ایک شاخ بلوڑ (ضلع علی گڑھ) میں مقیم ہے۔ ان کے مورت علیٰ یوسف خان ساکن راجپوت تھے۔ اس خانہ کی اکثر

افراد بلوڑ سے نقل مکان کر کے دوسری جگہوں میں جا کر بس گئے۔ یوسف خان کی ساویں پشت میں رشید خان (بن، بیل خانی) تھے، یہ بلوڑ ہی میں رہے۔ خدانے ان کی اولاد میں بہت برکت دی۔ وجہ تات کچ بلوڑ کا خاندان شروانی انھیں کے خلاف پستل ہے۔

انھیں رشید خان کی چوتھی پشت میں محمد ستیاب اللہ خانی تھے۔ انھیں بابے جو کچھ ترکے میں ملا انھوں نے اس پر اپنی سلیقہ مندی سے اضافہ کیا اور نیل سازی کی کوٹھی بھی قائم کی۔ ان نواح میں ان کے معاملات ملو و سدا کی شہرت تھی۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور اپنے نام کی مناسبت سے مقبول تخلص کرتے تھے۔ داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ پیام یاد کی پرانی جلدوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔ کچھ شری مضمون بھی ریاض الاخبار میں شائع ہوئے تھے۔ ملکی بیابا سے بھی دلچسپی تھی، کانگریس کے دکن تھے۔ ان کی دو دینی کا ایک فہم یہ ہے کہ آج سے ستر برس پہلے ۱۸۹۵ء میں انھوں نے ایک ہندو منڈت کو لازم رکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی (امت الہی) کو مندی پڑھائی۔ ۱۹۱۷ء میں جلت کی۔

انھیں محمد ستیاب اللہ خانی کے اکلوتے بیٹے محمد مقتدی خانی شروانی مرحوم تھے۔

محمد مقتدی خانی شروانی ربیع الاول ۱۳۹۷ھ (فروری / مارچ ۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ محمد مقتدی خانی ان کا تارنجی نام ہے جس سے (۱۳۹۷) برآمد ہوتے ہیں، انارسی عربی کی تعلیم نجی طور پر ہوئی۔ باقاعدہ انگریزی تعلیم ڈھولہ (خلع علی گڑھ) کے اسکول سے شروع ہو کر ۱۸۹۹ء میں ایم اے اور اسکول اعلیٰ گڑھ تک پائی یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ پشت اندر من مراد آبادی علی گڑھ اسکول میں ان کے جم جماعت تھے۔ وہ ان سے عربی اور پان سے سنسکرت پڑھتے تھے۔ میرے خیال میں ذرا انھیں عربی آئی، انہیں سنسکرت۔

شروانی صاحب کو نہ خاندانی جاواؤ کی دیکھ بھال سے کوئی دلچسپی تھی، نہ زمینداری اور کاشتکاری سے، نہ شروع سے اخبار بینی کے، یہاں تھے، اسی سے مضمون نویسی کا جینا پڑا۔ یہی شوق انھیں لاہور لے گیا اور وہ ۱۹۰۲ء میں جب ان کی عمر مشکل ۲۲-۲۳ برس کی تھی، منشی محبوب عالم کے

دو نادر سپہ اخبار کے ادارہ تحریر سے منسلک ہو گئے۔ اس اخبار کے علاوہ لاہور کے کئی دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے مضمون چھپتے رہے۔ اس سے نہ صرف لکھنے کی مشق حاصل ہوئی بلکہ انھیں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا اور جیت جیت ان کی صلاحیتوں کا رجحان اور مستقبل کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔

۱۹۰۹ء کے آخری مہینوں میں وہ لاہور سے علی گڑھ واپس آ گئے۔ یہ وقت وارث ملک (ف جنوری ۱۹۱۷ء) کی سکتوی کا زمانہ تھا۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف جولائی ۱۹۲۸ء) نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گورنمنٹ سے بی اے کی تھی۔ اس پر محمد مقتدی خان قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں وہ مشہور اخبار رسالہ انجمن ایسوسی ایٹڈ پریس کی ملازمت اختیار کر کے اس کے مقامی نائبرٹنگار بن گئے۔ اس عہد سے پر وہ چودہ برس کی طویل مدت (یعنی ۱۹۲۵ء تک) رہے۔

۱۹۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اب اس کا پریس (جہاں گزٹ چھپتا تھا) مسلم یونیورسٹی پریس کہلایا محمد مقتدی خان شروانی اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اب تک اس میں صرف نوچے کے چھاپے کا انتظام تھا؛ شروانی صاحب نے اس میں پتھر کے چھاپے کا اضافہ کیا۔

۱۹۱۲ء میں نواب حماد الملک سید حسین بگڑی (ف جون ۱۹۲۶ء) نے کلیات امیر خسرو کی ترتیب تمدن اور اشاعت کی داغ بیل ڈالی تھی؛ اس سلسلے کی سرپرستی حضور نظام دکن میر عثمان علی خاں (ف فروری ۱۹۲۷ء) نے قبول فرمائی تھی۔ اس مجموعے کی مختلف کتابیں ترتیب و تدوین کے لیے مقتدی صاحب علم میں تیسرے کو دی گئی تھیں۔ غمخسروی کی پہلی مشنری مطلق الاملا کی تصحیح محمد مقتدی خاں شروانی ہی نے کی تھی۔ انیسویں صدی کا کام پائیدگی کو نہ پہنچا اور صرف آٹھ جلدیں چھپ سکیں۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا، تو علم و ادب کی بہترین خدمت ہوتی۔ داتا توفیق اللہ بالہ دین

یہاں غالباً ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔

یہ کتابیں بہت اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ بہترین کتابت، اچکنا قیمتی کاغذ اور چھاپائی مسلم یونیورسٹی پریس کی جس کے کرنا دھرتا شرودی صاحب خود تھے۔ سارا کام خود ان کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اور نتیجہ اتنا شاندار ہوا کہ جس نے بھی یہ مجموعہ دیکھا، آتشِ آتش کر اٹھا۔ نواب عہاد الملک مرحوم قدردانِ علم و فن تھے۔ یہ منصوبہ بننا ہی ان کی تجویز پر تھا اور انہی کی سفارش پر نظامِ دکن نے اس کی سرپرستی منظور فرمائی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں کتابیں چھپ کر آئیں تو انہوں نے حضورِ نظام کی طرف سے ثمر دانی صاحب کو نظام، عہاد خسر، قلعہ دلویا۔

طاعت میں ہمارے کے باعث انہیں تین سو رتنے بھی ملے تھے، اول، سلیمان اشرف، ابنِ قلعہ (۱۹۲۹ء) پر دھیر مولا تا سلیمان اشرف نے اپنی کتاب الطہین کی حسن و خوبی طبع ہوئی۔ دوم، سرد جنگ کا نام قلعہ (۱۹۳۳ء) نواب سرور الملک بہادر شاہ نواب محبوب علی خان نظام دکن نے اپنی سوانح عمری کا نام سردی بھی لکھی تھی۔ یہ کتاب ثمر دانی صاحب کی نگرانی میں بڑی آب و تاب سے چھپی۔ اس پر مصنف کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ نے یہ قلعہ دیا۔ سوم، منزل، سلیمان بشری قلعہ (۱۹۳۸ء) مولا تا غلام حسین ہرمیا کوٹی (ف جنوری ۱۹۰۳ء) اپنے عہد کے نچا دھالم تھے۔ سر سیکھی ان سے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے ۴۰ سال کی تحقیق اور تجسس کے بعد ایک کتاب بشری تصنیف کی جس میں توہمات اور عہد نامہ قدیم سے صداقت، رسولِ صلح و اسلام ثابت کی گئی تھی۔ سر شاہ محمد سلیمان کی جوان دونوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ دلی خواہش تھی کہ کتاب چھپ جائے چونکہ اس میں عبرانی کے بہت سے اقتباسات تھے، اس لیے کتاب کا مہنتان میں چھپنا بہت دشوار تھا، لیکن ثمر دانی صاحب نے یہ ہم سر کر لی اور کتاب طبع کر دی۔ اسی پر نواب منزل اللہ خان نے یہ قلعہ دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ ایم اے او کالج کی پچاس سالہ جوبلی ہوئی۔ اس موقع پر اردو کانفرنس اسلام پریس کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھیں۔ پہلی کے صدر نواب صدیق آبادی، مرحوم (۱۹ اگست ۱۹۵۰ء) مولیٰ بشیر الدین مرزا البیض آبادی (۲۱ جون ۱۹۵۶ء) ان دونوں کانفرنسوں کی استقبالیہ مجلسوں کے صدر محمد مقتدی زان شروانی تھے۔

۱۹۳۶ء میں کسی وجہ سے یونیورسٹی نے اپنا پریس فروخت کر دیا۔ شروانی صاحب کو اس کام کا جو تجربہ تھلاپ اس سے مستفید ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کوئی اور مطبع قائم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے شروانی پرنٹنگ پریس کے نام سے اپنا خوانی مطبع جاری کر دیا۔ جو بدستوران کی نگرانی میں اعلیٰ معیار کی کتا بی چھاپتا رہا۔

مرحوم کو اردو مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کا ہوا تھا۔ جمید زود نویس تھے اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قادر تھے شعر بھی کہتے اور اپنے نام (مقتدی) کی بھائی کے کبھی بھائی، دوسرے مخلص کرتے تھے۔ مزاج کے تئوں کے باعث کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کب مرحوم سے قدر پر آدائیں۔ اس لیے یہ واقع ہے کہ سب ان سے خائف رہتے تھے۔

میری ان سے ملاقات نواب صدیق آبادی جنگ مرحوم کی مساطت سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت لطف سے پیش آتے تھے۔ علی گڑھ جانا ہوتا تو حتی الامکان سلام کو ضرور حاضر ہوتا ایک دن باتوں باتوں میں اُن معلوم کیسے مشہور صوفی شاعر صاحب لمحات و عشاق نامہ حضرت محرز الدین عراقی بہرائی (د ۱۳۸۹ء) کا ذکر چل پڑا۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہو چکی تھی۔

نخستین بادہ کا اندر حبا م کر دند
دشتم مست ساقی دام کر دند

میں نے کسی مناسبت سے یہ شعر پڑھا تو غالباً قالیچے کی وجہ سے ان کا ذہن میرے نام کی طرف متقل ہو گیا، اس پر خود اشعر ہوا،

ہے وحدت کو اندر حجام کو دند
 ز مالک رام، گو یحیٰ، دام کو دند

چھوٹی موٹی کوئی دوجن بھرکتا ہیں ان سے یادگار ہیں۔ مصباحین کی کجی خاصی تعدد و مختلف
 رسالوں میں منتشر پڑی ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کی قرعہ نگاہ آصفیہ کے دوسرے ایڈیشن
 کی ترتیب و تدوین میں کجی وہ مصنف کے دستِ راست تھے، جس کا اعتراف مولوی سید احمد
 نے کیا ہے۔

شبِ حجۃ ۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو بعد ۸۸ سال (قری ۱۹ سال) غلی گڑھ میں انتقال کیا اور
 وہیں قبرستانِ شاہ جمال میں سپرد خاک ہوئے۔

حکیم احمد شجاع

لاہور کے مشہور حکیموں کے خاندان کے چشم چراغ تھے۔ لاہور کا بازار حکیمان اسی خاندان سے منسوب ہو۔ احمد شجاع ۱۸۶۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اپنی ملازمت کے بشیر زمانے میں پنجاب قانون ساداسلی کے سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ نظم و اثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ لاہور کے اہل ذراے "ہزار داستان" کے اوڈیٹر رہے، افسانے لکھے، فلم تک سے تعلق رہا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ساتھ تخلص تھا۔

کسی زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ خدا معلوم، یہ مکمل ہوئی یا نہیں! اس سے متعلق ایک لطیفہ ہے!

کسی نے علامہ اقبال مرحوم کو بتایا کہ حکیم احمد شجاع تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں تو فرمایا کہ ہم آج تک حضرت حسین کو سب سے بڑا مظلوم مانتے آئے ہیں، لیکن اب یہ داس تبدیل کرنا چاہیگی! آج قرآن سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ ہر کدھم اس کی تفسیر لکھنے

لگا ہے ۔

۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو اپنے ذاتی مکان (فیروز پور روڈ، لاہور) میں انتقال کیا، اور وہیں چوبڑھی کے قریب اپنی خاندانی ہڑواڑ میں دفن ہوئے ۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

یوپی کے ضلع فرخ آباد میں پٹھانوں کی ایک بستی قائم ہو گئی ہے، اور اس کے مضافات میں ایک مختصر گاؤں تنوہ نام کا ہے۔ اب تو ان لوگوں میں ماشاء اللہ کبھی کبھار کوئی پڑھا لکھا آدمی نظر آ جاتا ہے، لیکن یہ ذکر پچھلی صدی کے آخری کربے کا ہے۔ اس زمانے میں یہاں کے باشندوں کا دل بہت مشغول باہمی مار پیٹ اور مقدمہ بازی تھا۔ یہاں کا ہر ایک سپوت دعویدار تھا کہ،

سو پشت سے ہے پیشہ آباپہ گری

اس لیے پڑھا لکھنا ان حضرات کے نزدیک کوئی ذریعہ عزت نہیں تھا، جس کے لیے جان جو کھم میں ڈال جانے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہاں کے ایک نوجوان فدا حسین خان صاحب نے نیزے کی جگہ قلم ہاتھ میں لیا اور مقامی انگریجوں اور نیکلرڈز کے گول میں داخلہ لے کر اردو فارسی پڑھنے لگے، تو ان کے ہم وطنوں نے انھیں بدعیتی اور آبائی روایات سے باغی قرار دیا۔

فدا حسین خان صاحب حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں تجارت

کر سینگے ، لیکن حیدر آباد پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ، اور اس کی جگہ دکانیت کی تعلیم حاصل کرنے لگے ، اور پھر اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا

Hyderabad

لیکن اس سے بھی بڑا اور اہمتر کام حیدر آباد لارپورٹر

Law Reporter کی تدوین و ترتیب اور اشاعت کا تھا۔ اس کی ہانگ موجود تھی ، چنانچہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی۔ فردری ، ۱۸۶۷ء میں خدا نے فداسین خان صاحب کو تیسرا بیٹا دیا تو انھوں نے اس کا ذاکر حسین خان نام رکھا۔ یہی ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں ، جنھیں ان کے بے تکلف دوست اور چاہنے والے محبت سے ”ڈاکر صاحب“ کہتے تھے۔

ڈاکر صاحب کا بچپن حیدر آباد میں گزرا ، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابھی کم عمری کا زمانہ تھا کہ حضرت پیر حسن شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان پر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ چونکہ اس کا بالواسطہ طور پر ڈاکر صاحب کی تعلیم و تربیت اور عام زندگی پر بھی اثر پڑا۔ اس لیے اس کا بیان سود مند ہو گا۔

پیر حسن شاہ صاحب کے مرشد ، حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی تھے۔ پیر حسن شاہ کو اوائل عمر میں مندوؤں سے سخت کد تھی۔ یہی نہیں کہ وہ انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے ، بلکہ ان کے برخلاف بر ملا برا بھلا تک سب کچھ کہہ جانے میں بھی انھیں دریغ نہیں تھا۔ حضرت شاہ طالب حسین کو بھی اس کا علم ہوا۔ چونکہ ان کا یہ رویہ تصوف کی صلیح کل اور دوا داری کی تعلیم کے خلاف تھا ، انھوں نے مرید کی اصلاح

سے ایک مرتبہ پی نے مرحوم سے دریافت کیا کہ صبح صبح ولادت کیا ہو ، تو فرمایا کہ سالی یقیناً ۱۸۶۷ء ہے ، مینا غالباً فردری کا چوتھا ربیع اور وہ ان کا یقین اب ممکن نہیں ، کیوں کہ سب خاندانی کا غذا است اور یادداشتیں ضائع ہو گئیں۔

کا ایک انوکھا علاج تجویز کیا۔ فرمایا کہ سر پر سندھو ڈال کیسی چوٹی رکھو اور پشانی پر تشقہ لگا دو اور اسی سج و سج سے پاپادہ بٹاؤ دیک جاؤ۔ دوران سفر میں اگر کوئی سندھوؤں کا تیرتھ استھان آئے تو اس کی بھی زیارت کر لو۔ جاؤ اور پھر اسی طرح سے واپس آؤ۔ اس سے مقصود یہ تعلیم دینا تھی کہ کسی نے چوٹی رکھ لی، تو کیا! اور کسی نے ڈاڑھی بڑھائی تو کیا! ان طواغیر سے کسی کے ایمان اور اخلاق اور ارتقاء سے متعلق حکم نہیں لگایا جاسکتا؛ اصلی چیز باطن کی صفائی اور پاکیزگی ہے۔

حکیم مطلق نے جو بیہوشی لادماغ کا حکم دیا ہے، اس سے دوسرے فوائد کے علاوہ یہ تعلیم بھی منظور تھی کہ اس طرح انسان کو دنگا دنگ تجربے حاصل ہونگے اور اس کا دل اور نظر وسیع ہو جائیگے۔ ہمارے حکیم شاعر نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

حد سے دل اگر اندر رہے، اگر تمنا شام

کو چشم تنگ، شاید کثرتِ نظر اسے ڈاہو

بارے اس سفر کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور جناب حسن شاہ قبلہ نے باقی عمر انسان دہشت اور محبت کی تعلیم عام کرنے میں بسر کر دی، جو ہر مذہب اور مضابطہ اخلاق کی علتِ خانی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اگر صاحب کے دادا غلام حسین خان صاحب عرف محسن خان مرحوم سے متعلق بھی بیان ہوا ہے۔ انھیں فقراء اور اہل اللہ سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنے رہنے کے لیے پختہ حلی تمیر کرنا شروع کی۔ ایک دن نہیں معلوم، کس بات پر اودھ کا کام کرنے والے مزدوروں سے بہت سختی سے پیش آئے اور انھیں گالیاں دیں جب ان کے مرشد تک یہ بات پہنچی، تو انھوں نے فرمایا

جہن خان! اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد اس حویلی میں خیر و عافیت سے بسر کرے اور پھلے پھولے، تو اس بد زبانی کا کفارہ ادا کرو، اور وہ اس طرح سے کہ متعجباً کرواں چند سے فلاں منہ و سادھو کی صحبت میں رہو اور ان سے پریم کرنے اور کرو دھ پر قابو پالے گا گیان حاصل کرو جب یہ سیکھ جاؤ، تو واپس آکر باقی عمارت مکمل کر لینا، ارادتمند جہن خان نے نقیل ارشاد میں متعجباً کی راہ لی اور کچھ مدت اس پریم نگری میں اس سادھو کی خدمت میں رہے اور پھر واپس آکر ادھورا مکان پورا کیا۔

یہی رواداری کی تعلیم نو جوان ڈاکر حسین خان کے دوستوں اور حلقے میں آئی۔ پیر شاہ صاحب کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعے کا بھی بہت شوق تھا، وہ جہانیاں جہاں گرد تو تھے ہی، جہاں جاتے، وہاں سے کتابیں، ٹیڈر، ٹیڈر کر ساتھ لاتے۔ ان میں سے لامحالہ بعض انھیں مستعار لینا پڑتیں، جو وہ اس وعدے پر لاتے کہ انھیں واپس کرو دیں گے۔ چنانچہ جب وہ لد سے بھندے حیدر آباد پہنچے، تو ڈاکر صاحب کو حکم ہوتا کہ ان کو نقل کر لو۔ یہ سلسلہ ان کے حیدر آباد کے قیام اور پھر اٹماوہ اسکول تک جاری رہا۔ ڈاکر صاحب بہت غوشمنط تھے۔ یہ اسی ابتدائی زمانے میں ان کتابوں کے نقل کرنے کی شوق کا نتیجہ تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں اٹماوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول بھیج دیے گئے یہاں انھوں نے دسویں درجے تک پڑھا، اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ ایف ایس سی کا امتحان انھوں نے یہیں ایم اے او کانٹے سے دیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اب بی ایس، سی کے لیے انھوں نے کرسچین کالج، مکھنڈ کا انتخاب کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ یہاں وہ سخت بیمار پڑ گئے اور انھیں

کالج چھوڑنا پڑا۔ تندرستی بحال ہو جانے پر دوبارہ علی گڑھ کالج میں آ گئے۔
جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند لی۔ ۱۹۲۰ء میں ایم اے کے آخری سال
میں تھے، جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ ہمارے صفِ اول کے
سیاسی رہنماؤں (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ)
نے علی گڑھ کا رخ کیا اور طلبہ کو ترغیب دی کہ وہ کالج سے ترک موالات کریں۔
بڑی رد و کد کے بعد طلبہ کی ایک معتدل تعداد نے ان اکابر کے حکم پر لبیک کہی
اور کالج سے نکل آئے۔

ان فوجیوں کے سرخیل ڈاکٹر صاحب تھے۔ علی گڑھ کالج کے کرتا و عہد اس زمانے
میں ڈاکٹر (سر) ضیاء الدین مرحوم تھے، جن سے بڑا انگریزوں کا اور انگریزیت کا
تداح اس الجو بہ زارِ منہستان میں بھی شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ ڈاکٹر صاحب
نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی انہی صفاتِ عالیہ کے باعث ان کے سفر کی
خلاف سمت کو اپنی منزل مقصود قرار دے لیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب یہ اکابر
قوم علی گڑھ میں جمع ہوئے اور انہوں نے ہم سے کالج چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا
تو میں عجیب کش کش میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی حیرت
میں تھا کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب موصوف بلا بھیجا۔ حاضر ہوا۔ بہت محبت
سے پیش آئے۔ ارشاد فرمایا: دیکھو، ناخبر بہ کاری میں کوئی غلط اقدام ذکر
نہیں۔ یہاں کالج میں رہو گے، تو خدا چاہے، سال بھر کے اندر ہی ڈپٹی کلکٹر کی
مل جائیگی۔ اس کے بعد زندگی بھر مزے اڑاؤ گے۔

فرمایا ڈاکٹر صاحب کی اس بزرگداشتِ نصیحت نے مجھے اتنے دن کی الجھن سے
نجات دلادی۔ میں جو فیصلہ کرنے میں اتنی دشواری محسوس کر رہا تھا، وہ اب
خود بخود رفع ہو گئی۔ ان کے دہاں سے واپس آ کر میں نے کالج چھوڑ دیا۔

یعنی بنیاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کا دن ہمارے ملک کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ اس دن علی گڑھ کے چند نوجوان طالب علموں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج سے ہم حکومت کے دست نگر نہیں ہونگے، آج سے ذریعہ تعلیم کوئی بدسی زبان نہیں، بلکہ ہماری مادری زبان ہوگی؛ آج سے تعلیم کا مقصد میکالے کے الفاظ میں حکومت کے کارندے نہیں بلکہ ملک و ملت کے مخلص عوام، پیدا کرنا ہوگا۔

ذاکر صاحب دوسریں تک جامعہ ملیہ میں معاشیات پڑھاتے رہے، لیکن علی گڑھ چھوڑنے سے ان کی اپنی تعلیم اور صوری رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے لیے وہ بالآخر ۱۹۲۲ء میں جرمنی چلے گئے جہاں سے تین برس بعد ۱۹۲۶ء میں وہ برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ (معاشیات) کی سند لے کر واپس آئے۔

ہم میں سے بہت لوگوں نے اردو زبان غالب کا برلن اڈیشن دیکھا ہوگا؛ لیکن اس کے چھپنے کی داستان شاید سب کو معلوم نہ ہو۔

جس زمانے میں ذاکر صاحب برلن میں تھے، انہی دنوں پر وفیسر محمد مجیب بھی وہیں تھے۔ یہ وہاں خاص طور پر چھاپے خانے سے متعلقہ امور کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین بھی یہیں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ دونوں حضرات تو خیر کچھ پڑھنے لکھنے کو گئے تھے اور اس میں ملے رہتے، لیکن ذاکر صاحب کو علی گڑھ میں جوں کا توں قلمندری اور کھلنڈے پن کا پڑ چکا تھا، اس سے مجبوراً بالعموم طرح طرح کے مفسو بے بازی اور اسیکیم بازی میں مشغول رہتے۔ یہاں برلن میں ایک چھاپہ خانہ کا دیانی پریس کے نام سے قائم تھا جس کے مالک ایک ایرانی صاحب، تقی زادہ نامی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تجویز پیش کی کہ اردو کی بعض کتابیں صحت اور صفائی سے چھاپی جائیں۔ تقی زادہ بھی اس پر تیار ہو گئے۔ پہلا قرعہ غالب کے

اردو دیوان پر پڑا۔ اس کے مصارف کے لیے ڈاکر صاحب نے ان دونوں عجیب صاحب اور عابد صاحب کی جیبیں خالی کر دالیں۔ یہ دیوان چھوٹے جیبی کتابی سا پڑ چھپا ہے۔ اہلی کاغذ، خوبصورت ٹائپ، سلی دار جلد، دوزنگی چھپائی، نفیس مضبوط جلد۔ غرض ہر ایک چیز خوب سے خوبتر ہے۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک سو فکری تصویر بھی ہے۔

اس اڈیشن کی دو خصوصیتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں: پہلی یہ کہ اس کی کمپوزنگ کا بیشتر کام خود ڈاکر صاحب نے کیا تھا۔ یہ اس زمانے میں ساتھ ساتھ حرف جوڑنے کی کمپوزنگ، کا کام بھی سیکھ رہے تھے۔ اتفاق سے ان ایام میں شہر میں یہ کام کرنے والے بھی کافی نہیں تھے۔ اس لیے تاخیر کا اندیشہ تھا۔ شاید اس طرح مصارف میں کچھ سمجھت بھی منظور ہو، چنانچہ انھوں نے دیوان اردو میں اس کام کا زیادہ حصہ خود کیا؛ کچھ حصہ عجیب صاحب کا بھی جو تیار ہوا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ جو تصویر شامل ہے، یہ اصلی نہیں ہے، بلکہ لاٹریٹنگ کے رہنے والے ایک جرمن مصور کی بنائی ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ جب دیوان چھاپنا طے ہوا، تو تجویز ہوئی کہ اس میں غالب کی تصویر بھی ہو۔ موجودہ تصویروں میں سے کوئی انھیں پسند نہ آئی۔ اور دسے ملے اور یادگار غالب میں غالب کے حلیے اوپر لباس سے متعلق انھیں خاصی تفصیل موجود ہے۔ دیوان فارسی کے ساتھ لیتھو کی تصویر بھی چھپی ہے۔ یہ سب باتیں اس مصور کو بتائی گئیں اور انھوں نے اپنے ذہن سے یہ تصویر بنادی۔ خدا کی شان، آج ہی تصویر سب سے زیادہ دیکھنے میں آئی ہو!

برسبیل تذکرہ، یہ بھی یاد رہے کہ شیخ الملاک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اچھے خاصے شاعر بھی تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے، شیدائے مخلص تھا۔ دیوان غالب کے بعد ڈاکر صاحب نے اسی چھاپے خانے سے دیوان شیدائے مخلص بھی اسی اہتمام

سے شائع کیا تھا۔ اس کی کچھ بڑی جگ سترائے عجیب صاحب کا کارنامہ ہے۔
 جرمی سے واپس آنے کے بعد ذاکر صاحب کی زندگی کا سب سے اہم دور شروع
 ہوا۔ ان کی غیر حاضری ہی میں جامعہ ملیہ کی جاعتیں اور دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل
 ہو چکے تھے۔ ذاکر صاحب اب شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔ خوش
 قسمتی سے انھیں ساتھ کام کرنے والے ایسے کارکن مل گئے جنہیں ان پر
 کامل اعتماد تھا اور جو خود بھی پورے اعتماد کے قابل تھے۔ ان میں پروفیسر محمد
 مجیب (موجودہ شیخ الجامعہ) ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم جے راج پوری،
 مولانا خواجہ عبدالحی، سعید انصاری، حافظ فیاض احمد، حامد علی خان، وغیرہ
 خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جامعہ ملیہ کی مالی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ حکیم حسن خان مرحوم کا
 بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ خود بھی بہت کچھ دیتے رہتے تھے اور ان کے ذریعے سے
 فتوح بھی ملتی رہتی تھیں۔

جب دسمبر ۱۹۲۰ء میں وہ انڈیا کو پیارے ہو گئے، تو اب جامعہ ملیہ کا بار ڈاکٹر انصا
 مرحوم کے کندھوں پر آ پڑا۔ یہ بڑا سختی کا دور تھا۔ آمدنی کم، بلکہ معذور اور مرض
 کی مصیبت اس پر ستراد۔ اگناہ (ٹرسٹیوں) کی کثرت نے یہ اسے دی کہ چونکہ
 جامعہ کو چلانے کے لیے ضروری مالی انتظام نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بند کر دی
 جائے۔

ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت جو مردِ زمانہ سے ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی،
 ان کا خطرے میں ہی ہر اک کو دترنے کا انداز تھا۔ کوئی نازک مرحلہ ہو یا مشکل
 مقام ہو، مصیبت کا احتمال ہی نہیں۔ یقین ہو۔ اس سے ان کے اندک کا بھٹا
 جویوں تصوف اور تعلیم کی چادر تانے سو یا رہتا، جاگ اٹھتا۔ یہ ان کے لیے

چیلنج کا حکم رکھنا، اور یہ بات ان کی شانِ مردانگی کے منافی تھی کہ وہ یہ بیڑا اٹھانے سے انکار کر دیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ جب ٹریشیوں نے جامعہ کے بند کر دینے کا فیصلہ کیا، تو ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا:

ہم جامعہ کو بند نہیں ہونے دینگے، اور جیسے بھی بن پڑا، اسے چلائینگے۔ گیارہ سالہ اور کارکنوں نے عہد کیا کہ ہم بیس برس تک ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ شاہرہ طلب نہیں کریں گے۔ لیکن ان بے چاروں کو یہ ڈیڑھ سو بھی کب دیا گیا۔ بلکہ بعض اوقات مہینوں کسی کو ایک جتہ تک نہیں ملا۔

فرض اس کے بعد ان لوگوں کو کلینٹ اپنے زور بازو پر تکیہ کرنا پڑا۔ ملک کے دو مہند اور صاحب احساس جتنے نے جب بھی اور جو کچھ بھی ان کی بھولی میں ڈال دیا، انہوں نے اسے ہمدردی سے قبول کیا۔ ان غریبوں نے یہ ایام کس تنگی ترشی سے گزارے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ ۱۹۴۳ء یا شاید ۱۹۴۴ء میں نظام حیدر آباد کی حکومت نے جامعہ ملیہ کو پانچ لاکھ کا گرانقدر شاہانہ عطیہ دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی راوی ہیں کہ جب ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی، تو میں نے اس کا میانی پر انھیں مبارک باد دی۔ خوش ہو کر کہا: رشید صاحب، آج گیارہ برس میں پہلی مرتبہ جامعہ کے اٹاف کو پوری تحوّل دے سکا ہوں۔

ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جس سندھی اور یکوٹی، صبر و استقلال، ایثار اور خودداری سے یہ فرض نبایا، اس کی شاہد ساری دنیا ہے۔ خدا نے بھی ان قربانیوں کو نوازنا، اور شرف قبولیت بخشا۔ ملک آزاد ہو گیا اور آج جامعہ ملیہ اسلامیہ ملک کی تعلیمی جدوجہد میں ہر چلو سے صفِ اول میں ہے۔

آفشتہ ایم ہر سر خار سے بخون دل

قانونِ انبیا فی صحرانِ نوشتہ ایم

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ لیکن چونکہ آزادی اور ملک کی تقسیم تو ام آئیں۔ اس لیے ترقیوں ملک میں انتشار اور بد امنی کا دور دورہ رہا۔ خاص طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور اس کی ہستی تک معرضِ خطر میں آگئی۔ حکومت وقت نے دیکھا کہ اگر اس وقت کوئی تجربہ کار اور معتبر شخصیت یونیورسٹی کا نظم و نسق ہاتھ میں نہیں لیتی، تو یہ سرخیز کا لگا یا ہوا پودا صحرانِ حشا کا شکار ہو جائیگا۔ آخر لگاؤ انتخاب ڈاکر صاحب پر آن ٹھہری۔ مولانا ابوالکلا آزاد مرحوم وزیرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے بدوا بھیجا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کو بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ دانش چانسلر بن کر وہاں چلے جائیں۔ یہ عذر کرنے لگے۔ اپنی گونا گون مصروفیتوں اور جاموہ قلیہ کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر کیا۔ اس پر مرحوم نے نفسیاتی ہتھیار استعمال کیا۔ کہنے لگے: اچھا اگر آپ نہیں جانا چاہتے، تو میں مجبوراً فلاں صاحب کو بھیجنے بیٹھ لگا۔ یہ صاحب مرفوع القلم ہو چکے تھے۔ ایسے چیلنج پر ڈاکر صاحب بھلا کیونکر حرج دے جاتے ان کے نام کا سنا تھا کہ انھوں نے فوراً پیشکش قبول کر لی اور علی گڑھ چلے گئے۔

یہ نومبر ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ یہاں یہ ۱۹۵۷ء تک رہے۔ ان آٹھ برس میں انھوں نے یونیورسٹی کی ساکھ پھر سے قائم کر دی، جو آزادی سے پہلے کے دو تین برس میں لمبا میٹ ہو گئی تھی۔ وہ پودا جو بادِ سموم کے بھونچکوں سے مرجھا یا جارا ہوا تھا، ڈاکر صاحب کی آبیاری اور نگہ رانی کے صدقے پھر سے اُبلھا اٹھا اور اس میں نئے سرے سے پھل پھول آئے لگے۔

۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر مقرر ہوئے، اور جب چار برس بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدش ہوئے تو ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء کو جمہوریہ ہند کے نائب صدر بنادے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر ادا چاکر شن کی صدارت جمہوریہ ہند کی میعاد ختم ہوئی۔ نیا انتخاب ہوا، تو قوم نے ملک کے اس سب سے بڑے عہدے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ انہوں نے قوم ان کی خدمات سے اس قدری تمت کے لیے ہرہ سند نہ ہو سکی!

۲ مئی ۱۹۶۹ء صبح گیارہ بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور چند منٹ کے اندر جان بحق ہو گئے۔ اٹالکھ داتا ایہ راجپوت۔

وہ اپنی محبوبہ جاسموتیہ کے درمیان ایک خاص احاطے میں سپرد خاک کیے گئے۔
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاکِ طینت

ڈاکٹر صاحب کو اپنی فیملی اور انتظامی ذمہ داریوں نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہیں دی۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف معاشیات کے موضوع پر تھی۔ انہوں نے تعلیم سے متعلق بھی اپنے تجربات اور خیالات قلمبند کیے ہیں۔ کسی زمانے میں انہوں نے ”رقیہ ریاض“ کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ اس وقت تک ان کی مندرجہ ذیل چیزیں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ مبادی معاشیات (ایڈون کینن کی کتاب کا ترجمہ ۱۹۶۲ء)

۲۔ ریاست (افلاطون کی کتاب Republic کا ترجمہ ۱۹۳۱ء)

رتنرانی کے بعد دوبارہ ۱۹۶۷ء)

۳۔ معاشیات، مقصد و منہاج (۱۹۳۲ء)

۴۔ معاشیات قومی List کی کتاب National Economy کا ترجمہ

۵۔ ذکر سین (محرم کی تقریر)

۶۔ حالی، محب وطن (یوم حالی کی تقریر)

۷۔ تعلیمی خطبات

۸۔ جامعہ کیا ہے؟

۹۔ تشکشا (سندی)

Educational Reconstruction in India ۱۰

The Dynamic University ۱۱

(۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے مختلف یونیورسٹیوں کے خطبات صدارت ۱۹۶۵ء)

۱۲۔ سندھستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم (پیش خطبات کا اردو ترجمہ) ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۹۶۲ء)

۱۳۔ دیانت (ڈراما)

۱۴۔ ابوحان کی بکری (بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ)

Die Botschaft des Mahatma Gandhi ۱۵

(۱۹۴۳ء جرمن)

۱۶۔ خرگوش اور کھجور (۱۹۹۷ء)

تقریریں، مذاکرے، صاحبِ کاغذیہ، یہ تھا کہ تصنیف بول چال کی زبان میں ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ خیالات کی گہرائی، زبان و بیان کی سلاست اور سادگی، لب و لہجے کی صداقت اور خلوص ان کی ہر تحریر کا خزانہ امتیاز ہے۔ اگر آپ کو ان کی کسی تحریر میں مشکل الفاظ یا فارسی کی تفصیل ترکیبیں ملیں تو یقین کیجیے کہ یہ انہوں نے بہت سی جلدی میں لکھی ہے اور اس پر انہیں نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کی طرح کبھی کبھی تصنیفِ شعر بھی کہہ جیتے تھے۔ (دشمن نے):

ماہرِ جہم دروہی ہے جزوِ زندگی پرکھتے زندگی نہ سہی، زندگی تو ہے
لشکر اس کے ذکر سے نفرت نہ کیجیے اگر شکستہ حال ہی، آدمی تو ہے

شاد، نریش کمار

اردو کا یہ جوان مرگ شاعر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں بھین پور (لاڑکانہ) ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوا۔ ان کے والد نوہر رام دودھ گلیڈ جوش لیانی بھی اپنے زمانے میں پنجاب کے ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ شاد نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ لیکن دوسری بلا شراب نوشی بھی اسی کے ساتھ آئی۔ دودھ بلا نوش تھے اور اسی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ گھر باد کی خبر نہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال بٹا دینے جوں توں کر کے دسویں درجے تک کی تعلیم تو مکمل کر لی، لیکن کچھ تو حیران حالی کے باعث اور کچھ اپنے لالچابی پن سے اسے جاری نہ رکھ سکے اور کم عمری ہی میں انھیں ملازمت اور تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا۔ چنانچہ راولپنڈی، جالندھر، لاہور میں مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔

تعلیمِ ملک کے بعد زبوں حالی میں اور اضافہ ہوا۔ وہ بے سروسامانی میں جان بچا کرتی آئے۔ بعض دوستوں کی مدد سے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت ملی،

لیکن میں اتنا ہی کہ جان و تن کا رشتہ برقرار رہ سکے ۔

اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی ۔ شاعری میں وہ بچکتے نہیں تھے۔ خیالات میں پنگلی ، بیان میں شگفتگی ، زبان میں چستی اور ان سب پر مستزاد ہلکا سا تیکھا پن اور طنز ۔ لیکن انوس کو شراب نوشی نے ان کی جملہ صلاحیتوں کو برباد کر دیا ۔ وہ کئی مرتبہ موت کے دروازے سے لوٹ کر آئے ۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ایک ان کے والد و دو صاحب لاپتا ہو گئے ، خدا معلوم ، انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا ، گھر سے بھلے چلے نکلے ، اور واپس نہ آئے ۔ سناؤ نے ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا ، لیکن بیسود ؛ ان کا سراخ ملنا تھا نہ ملا ۔ شاد نے غم غلط کرنے کو شراب میں پناہ لینے کی کوشش کی ۔ یوں گھریلو زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی گئی ۔ آخری شام ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء وہ گھر گئے ، توہاں کا ماحول معمول سے زیادہ ناقابل برداشت پایا ۔ ان کی سکوخت دریا سے جہنا کے کنارے کی بستی تیار رور میں تھی ۔ دس گیارہ بجے شب گھر سے نکلے اور رات بھر غائب رہے ۔ اگلے صبح ان کی لاش دریا سے ملی ۔

انھوں نے بہت کچھ کھایا ۔

(۱) نظمیں : تنگدہ ، فریاد ، دستک ، ہلکار ، آہٹیں ، تقاضائیں ، آیات جنوں ، پکھوار ، سنگم ، میرا منتخب کلام ، میرا کلام تو یہ نو ، دد آتش و حافظ کا ترجمہ و جدان ۔

(۲) نثریں : ڈارلنگ ، راکھ تلے ، سرخ حاشیے ، سرقد اور تو ارد ، مطالعہ جان پہچان ، خائب اور اس کی شاعری ، انداز غالب (شرح) ، محاورات خائب ، آواز غالب ، پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری ، پانچ مقبول طنز و مزاح نگار ، شام نگر میں سینما آیا ، جینی بلبل ، سندری شہزادی ۔ آخری تینوں کتابیں نچوں

کے لیے ہیں

شاد نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں کچھ غزلیں اپنے والد درد کو درسی کو یہ کہہ کر دکھلائیں کہ یہ میرے ایک دوست کا کلام ہے؛ وہ ڈرتے تھے کہ اگر والد کو معلوم ہوا کہ میں شعر کہتا ہوں، تو خفا ہونگے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا، تو انہوں نے ناراضی کی جگہ خوشی کا اظہار کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ شکی تلوک چند محروم سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد جناب جو شس لمبیانی سے اصلاح لی؛ اور نعیم کے بعد دلی پہنچے، تو چند غزلیں جو شس طبع آبادی کو بھی دکھائیں۔ شاد کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور اردو کے منظوم سراپے میں مقام بلند کا مستحق ہے۔

کچھ مختصر کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہوا

ظہور ہر و محبت کی جلوہ گاہ تو ہیں
خدا کے فضل سے شاید گناہ تو ہیں
اگر ڈاب کے قابل نہیں ہیں ہم نہ ہیں

حسن ہوا یا چھلکتا سا غرنے

آج آتی ہے جسم سے ایسے

زندگی کے حسیں گلستاں میں

جب بچوڑا ہے خندہ گل کو

دہریں ہم دفاتع اردوں کو

دشمنوں سے تو بچ گئے، لیکن

مری حیات کی بہتی میں بھی بلندی تھی

ایسر طائر ہیں سخت بزدل، فضول بھرتے ہیں سوا ہیں

قصص کو بھی ساتھ لے آ رہی یہ، اگر قصص سے نجات چاہی

مرے تخیل کا حاصل ہیں، مرے تصور کی زندگی ہیں
 دراز گیسو، حسین آنکھیں، جھل چہرہ، گداز باہیں
 خوشی کے نغموں میں کار فرما، بشر کی بے چارگی کے نوحے
 براک بمبم کی تہ ہیں آنسو، ہر ایک حسرت کی تہ ہیں
 وہ طلب میں جو تھک کے بیٹھے نری نظر میں وہ دلوں سے
 پناہ کی اس میں جستجو کیا، کہاں ہیں اس میں پناہ گاہیں!
 جن گلیوں میں تو نے مجھ سے کچھ جھوٹے اقراء کیے تھے
 اب بھی بجال افسردہ میں ان گلیوں میں گھوم رہا ہوں
 تیرے علم میں ہم حیات بھی ہے مجھ میں جینے کی کوئی بات بھی ہے
 رخ سے خوگر نہ تھے، دانتوں نہ تھے آلام سے
 کیا وہ دن تھے، جب گزرتی تھی بڑے آرام سے
 صبح تک کیا جانے، کیا گدے سے مریض مٹتی رہ
 نہتا تھا ہے چراغ زندگی جب شام سے
 ایک ہم ہیں یاد کرتے ہیں انہیں صبح دسا
 ایک وہ ہیں، جن کو نفرت ہو جاوے نام سے
 صبح عشرت میں کہیں شام الم پہناؤ نہ ہو
 دور ہے دل فریب گردش اتنا م سے
 اٹھری بخودی کرتے پاس ٹھیکر تیرا ہی انتظار کیا ہے کبھی ابھی
 دیر و حرم سے دور، دجو و عدم سے دور
 لے جا رہی ہے مجھ کو تری رہگزر کہاں؟

ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں
 عمر بھر بنو ابیاں میرا مقدر ہو گئیں
 آپ ہی کا یہ فیض ہے، ورنہ زندگی اس قدر اداس نہ تھی
 آپ دل کے قریب ہیں پھر بھی ہاتھ دیدار کو ترستی ہے
 بادہ و جام پر نہیں موقوف تشنگی میں بھی ایک مستی ہے
 شاد جس کو خوش سمجھتے ہو وہ بھی مہربانے غم کی مستی ہے
 کٹ تو گئی ہے بھر کی رات کیسے کٹی؟ یہ اور ہے بات
 اک تخیل ہے جو محتاج بیاں رہتا ہے
 لمبے وہ حسن جو بے نام دن شاں رہتا ہو
 زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جسے

ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہو
 نگاہ اہل محبت کا فیض ہے درد حوی نظر کو بھی کیا علم تھا کہ تو کیا ہو؟
 جو نہ ترے تو بے جاہ محبت میں سفر ہو سہل تو پھر مطلق جہتو کیا ہو؟
 ہیں نگاہ مستور سے دیکھنے والو! یہ حادثات جو تم پر گزر گئے ہوتے!
 یہ ناخدا جو نہ ہوتے تو شاید ہم اب تک

بفیض موز بلا پار اتر گئے ہوتے
 کون سگتے آنسو روکے، آگ کے ٹپنے کوں چبائے
 لے ہم کو کھانے والے! کوئی تجھے کیوں کر سمجھائے
 برکھا برسے، نئے گونجیں، شیشے سے شیشہ ٹکرانے
 کون اس وقت انجام کی سوچے، کون خود کے پھر میں لے

جھون کے اندھیا رے پتھر پر جس نے تیرا ساتھ دیا تھا
 دیکھ کہیں وہ کوئل آٹا، آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے

اس دنیا کے رہنے والے، اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
 کون پر اپا روگ خریدے، کون پر یاد رکھ اپنائے!
 ہے مری مایوس امیدیں، واسے مرے ناکام ارادے
 مرنے کی تدبیر نہ سوچی، جینے کے انداز نہ آئے
 اس دنیا کے غماتے میں، غم سے اتنی فرصت کب ہو!
 کون شادوں کا منہ چومے، کون بہاروں میں ہلے!
 ضبط بھی کب تک ہو سکتا ہے، صبر کی بھی اک حد ہوتی ہو
 پہل بھر چین نہ پانے والا کب تک اپنا دوگ چھپائے!
 شادو ہی آوارہ شاعر، جس نے تجھ سے پیاد کیا تھا
 نگر نگر میں گھوم رہا ہے، اداؤں کی لاش اٹھانے!
 کہاں کہاں نہیں موجود میرے نقش قدم!
 کہاں کہاں نہیں ٹوٹا مرا دل حساس!
 کہاں کہاں نہیں تڑپ نکلا درد شناس!
 کہاں کہاں نہیں جھلکے، یہ دیدہ، بڑے غم!
 کہیں بھی نہ ملے گی میرے رخ سے گرد ملائی
 کہیں بھی مل نہ سکا کوئی حباد منزل
 کہیں بھی رک نہ سکا میں مسافر غم دل
 یہی ہوا میری سادی مسافت کا مال
 گیا جہاں بھی، پلٹ کر میں سو گوار آیا
 کسی جگہ بھی تو تسکین جستجو نہ ہوئی
 کہیں بھی تو دلا، تجھ سے گفتگو نہ ہوئی

پکارنے کو تجھے ہر طرف پکار آیا

جواب میں وہی آواز باز گشت آئی

کہاں ہوئی مری فریاد کی پذیرائی!

ہر تنہا پہ بے حسی ہوتی ہر سرت بکھی بکھی ہوتی

موت ہوتی آخر دنیا میں زندگی موت بن گئی ہوتی

زندگی کی ستم ظریفی کو داقہ ہے کہ کم سمجھتے ہیں

وہ بھی روٹھی ہوئی سرت ہو جس کو ہم لوگ غم سمجھتے ہیں

جاننا ہے ہر زمانہ تجلی ہے ماہ میں یتری نگاہ جب سے ہو میری نگاہ میں

دل میں ہو شوق دید کا عالم تو دیدنی گو دیکھنے کی تاب نہیں ہو نگاہ میں

اسے شاد رہروں کے رویے کو دیکھ کر آنا پڑا ہے راہزوں کی پناہ میں

کچھ میکش کو اس نے بھی رسوا کیا، مگر کچھ میکش بھی شاد کو بدنام کر گئی

یوانیوں پہ بھی بگے کرنا پڑا ہے فخر یاران نیک نامہ کے اطوار دیکھ کر

جیسے مری نگاہ نے دیکھا نہ ہو کبھی محسوس یہ ہوا تجھے ہر بار دیکھ کر

کچھ تلخی شراب نے مجھ کو کیا ہلاک کچھ تلخی شعور کا ارا ہو اہوں میں

آج تک وہ نظر نہیں بھولی تم نے دیکھا تھا ایک بار مجھے

یہ چاندنی، یہ گھنٹن خامش، یہ تنہائی دل شکستہ کی ہر چوٹ پھر ابھر آئی

مہرائی میں تغافل کی اداس ہے توہیں کچھ نہ کچھ آپ کا دل ہم سے خفا ہو توہیں

موسم دکش، ساقی گرو، صحن گلستاں، بادہ رنگیں

اس ماحول میں رہ کر بھی میں شادابیت مغموم رہا ہوں

زندگی سوز سے عبارت ہو یہ کسی ساز کی نقیب جمیں

کھن قدر بد نصیب انساں ہیں کوئی غم بھی سمجھیں نصیب نہیں

سٹے تو بن گئے کسی ہوش کے نقش پا
 پھیلے تو ہم تضاد و تدریس پہنچ گئے
 گو ہر قدم پر دیو و جہم کے تھے بیچ و غم
 ہم پھر بھی تیری رہگذر تک پہنچ گئے
 دل نے بنا دیا ہے محبت کا دل گہے
 ہر وار واپس شوق مری واردات ہو
 فسرہ دیکھ کے تم کو خیال آتا ہے
 نسر و گی میں بھی کم دل کشی نہیں ہوتی
 غم جہاں میں گہی دل کشی نہیں ہوتی
 غم حبیب کا جب تک نہ حسن شامل ہو
 دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
 آپ سے یوں تو ادھر بھی ہوں گے
 آپ کی بات آپ ہی کی ہے
 عقل سے صرف ذہن روشن تھا
 عشق نے دل میں روشنی کی ہے
 کسی رخ پر جب گز و غم دیکھتے ہیں
 تو اپنی ہی تصویر ہم دیکھتے ہیں
 کسی کی نگاہوں کی بیگانگی میں
 ہمیں جانتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں
 کوں کیا غم زندگی کی شکایت
 یہی غم تو ہے زندگی کا ہسار
 شاید یہ سب غم نہیں دل میں
 پھول کی گودی میں مشرا رہے
 آغم زندگی! او اس نہ ہو
 آتھے ہم گلے لگاتے ہیں
 مجھ سے ملنے سے پیشتر وہ نظر
 آئینے سے بھی روشناس نہ تھی
 سکوں کسی کو نہیں مجھ کو مضرب ہوا
 کوئی قفس کے لیے کوئی آئیاں بکلیے

ناطق گلاؤ ٹھوی، سید ابوالحسن

کہا جاتا ہے کہ ذاب مرزا خان داغ کے ہزاروں شاگرد تھے جن کے نام ایک ضخیم تاریخ تلمذ کی ترتیب سے درج تھے۔ اس بیان کی صحت سے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ جب داغ کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ہے تو ان کے بلامبالغہ سینکڑوں شاگرد ان کا سلسلہ قائم رکھنے کو موجود تھے۔ ۶۵ برس بڑا بھائی ہے، آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اب کئی برس سے صرف دو حضرات رہ گئے تھے، جوش طیبانی اور ناطق گلاؤ ٹھوی۔ گزشتہ مئی میں ناطق بھی اس کو پیار سے ہو گئے۔ اب صرف ایک حضرت جوش کی ذات اپنے استاد کی یادگاہ رہ گئی ہے۔ خدا ان کا حامی و ناصر رہے!

سید ابوالحسن ناطق گلاؤ ٹھوی ۱۱ روزہ برہنہ کوکاسٹی میں پیدا ہوئے، جو ناگپور کے قریب اچھا خاصا بڑا قصبہ ہے۔ ان کے بزرگ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ حدیث اُسنے لے۔ ان کے دادا سید غلام غوث وکالت پیشہ تھے اور اسی سلسلے میں مدائن میرٹھ میں مقیم رہے۔ پھر خاندان نے گلاؤ ٹھوی (ضلع میرٹھ) میں سکونت اختیار کر لی

یہاں ان کی کافی بڑی جاوا اور زمینداری تھی۔ ناطق کے والد سید ظہور الدین نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ وسیع پیمانے پر ٹکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ کامٹی میں سکونت پذیر تھے، چنانچہ ناطق یہیں پیدا ہوئے۔ سید ظہور الدین گھ ۱۹ویں انتقال ہوا۔

ناطق کی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر شروع ہوئی۔ قدرتا فارسی عربی پر خاص توجہ رہی، اور انھوں نے اس کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی۔ آخری دورہ حدیث۔ شیخ ابندولانا محمود الحسن سے پڑھا۔ وہیں طب سبھا ان کے بادرخو حکیم احمد حسن دغف حکیم بدن اسے حاصل کی۔ بعد کے زمانے میں وہ زمرہ کے کام کاج کے لائق انگریزی سے بھی اپنے طور پر واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بلکہ ان کے کلام میں بعض انگریزی شعرا مثلاً سفیسی، لابلگ فیلو وغیرہ کی نظموں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

سید مشوق حسین اظہر باپڑی، ناطق کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انھیں کی ترفیب پر انھوں نے کسی کے زمانے میں شاعری شروع کی، لیکن ان سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے لیے انھوں نے بیان ویزہ الی مرحوم ۱۹۰۰ء کا انتخاب کیا، جو اساتذہ وقت میں بھی درجہ خاص کے حامل تھے۔ لیکن چند ہی ماہ بعد بیان فوت ہو گئے۔ اسی زمانے میں امیر جنابی بھی چل بے۔ اتفاق کی بات کہ میں سے داغ کے دو دیوانہ گلزار داغ اور آفتاب داغ۔ ان کے ہاتھ لگ گئے۔ انھیں دیکھا، تو یہ داغ کے ایسے گردیدہ ہوئے کہ تھوٹے دن بعد خط و کتابت کے ذریعے ان کا طرز اختیار کر لیا۔ بعض اصحاب نے انھیں جلال بکھوڑی کا شاگرد بھی کہا، جو یہ درست نہیں، وہ شاگرد داغ ہی کے تھے، یاد چار غزلوں کی حزمک بیان پڑوائی کے بھی کچھ لے لیے۔ باآخ انھوں نے مشق اور غور و فکر سے خود درجہ استاد حاصل

کر لیا تھا چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے شاگرد زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔
تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ یہ گویا ان کا ورثہ
تھا۔ ان کے ایک چچا سید عنایت اللہ کو ۱۷۸۵ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں
انگریزوں نے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ ناطق مرحوم کانگريس اور خلافت کی تحریکوں
میں ۱۷۸۵ء سے نقدے بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے۔ چون کہ گھر کے کھاتے مٹے تھے، اس
بے معاش کی طرف سے کوئی تنویش نہیں تھی۔ وہ مسلسل ۲۰ سال تک انگریزوں کی
کیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کے بھی رکن منتخب ہوئے تھے۔ لیکن
روز بروز مالی حالت کمزور ہوتی گئی، اور قواعد کے اصولوں کے ساتھ وہ سیاسی
سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکے، اور بالآخر خانہ نشین ہو گئے۔

ان کا کلام مجین (درد لول)، افسانہ اخبار (لاہور)، میں لٹا ہے۔ اپنے زمانے کے دوسرے
مختلف رسائل و جرائد میں بھی ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ ان کی خفیات کا دیوان اب تک
شائع نہیں ہوا۔ چند نظموں کا مجموعہ "ناطق" کے عنوان سے گلدرت "جلو کار"
دہلی (۱۹۱۳ء) کے شمارہ مارچ ۱۹۱۳ء کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپا تھا۔ چند سال ہوئے، ایک
حولی مکتوب جس میں فنی معلومات ہیں (کیل میں خلیل) اور تنقیدی موضوعات سے
متعلق چند خطوط اور مضامین "سید سیارہ" کے نام سے شائع ہوئے تھے (لاہور
۱۹۲۰ء) غالب کے دیوان کی شرح کنز المطالب اگرچہ ۱۹۲۶ء میں نکلی تھی، لیکن شائع
ابھی پانچ سال (دیکھو فروری ۱۹۲۷ء) ہوئی۔ جس شخص نے ستر سال مشق سخن کی بڑی
اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے کلام کی مقدار کتنی ہو گی۔ دیوان کے علاوہ کچھ اور
تصنیفات بھی غیر مطبوعہ رہ گئیں، جن کے مسودے ان کے بعض شاگردوں کے
پاس ہیں۔

مرحوم بہت کم آمیز تھے، بلکہ بہت حد تک زود درخ اور اٹھارہ ماٹے میں رہا کرتے تھے۔

اسی لیے ان کے احباب کا حلقہ وسیع نہ ہو سکا۔ انوس کو ان کا آخری زمانہ بہت حسرت اور کس میرسی کی حالت میں گنا۔ اولاد میں چھٹے ہوئے۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ لیکن وہ سب داغِ مفارقت دے گئے چار کا تو گنسی ہی میں انتقال ہو گیا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی گھربار والے ہو کر مرے۔ ان صداتِ زمینی و جسمانی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ چھ ماہ بسترِ مرض پر پڑے پڑے تہیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔ اعضا بیکار ہو گئے اور حافظہ کبھی رخصت ہو گیا۔ نقل و حرکت تک سے معذور ہو چکے تھے۔ آخر وہ دن بھی آگیا، جو اٹل ہے۔ انہیں بہت دن سے شسل بول کا مارضہ تھا، لیکن خدا کی شان، دوسرے گزشتہ میں اس کے بالکل عکس پس بول کی شکست پیدا ہو گئی۔ اسی کے علاج کے لیے انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ جب اتفاق ہو تو گھر پر آگئے، اور یہاں علاج ہوتا رہا لیکن اب کمزور و مجید ہو گئے تھے ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کی شام سے حالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور زبان بند ہو گئی۔ آدھی رات کے وقت آخری ہنگامی آئی دیوں وہ شب ۲۶/ ۲۷ مئی ۱۹۶۹ء راتِ صبح الاول (۱۳۸۹ھ) کو ناگپور میں ملکِ حقیقی کے جاوے پر دہاں چا پیچھے، جہاں ہم سب آگے پیچھے جانے والے ہیں۔

صبح ہوتے ہوتے اس حادثے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ سوگ میں کارپوریشن کے دفتر بند کر دیے گئے، جس کے وہ ۲۰ برس تک دکن رہے تھے۔ سرپر کو جنازہ ان کی قیامگاہ سے اٹھا اور سرشام انہیں قبرستانِ مومن پر وہ (ناگپور) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

ایک مجلسِ بیاض سے انتخاب کر وہ چند اشعارِ ملاحظہ ہوں: یہ جناب محمد عبدالعلیم، ناگپور کی مملوک ہے، جو ان کے مخلص نیا زمندوں میں سے ہیں۔
پھولوں کا رنگ وہ پاپندوں کے چہچہے کس کو خبر ہو، سب کہہ کر آئے اکوھر گئے

ہم کو تو راتِ مذاکاتی کسی ٹکلی کے وصل کی
 آج یہ خانے میں برکت ہی تھی
 اس کے سہل دن ہمارے یوہیں گزر گئے
 میکشا آؤ، عبادت ہی تھی
 آپ اور جنسِ دل کے خریدار: جی نہیں
 ہوا شاہوں صورتِ اہل نظر کو میں
 ساقی خیار نور آداسے شمعِ بزمِ عیش
 آتشِ گل کا، فرما سے شرابِ نغمہ ہے
 جنوائی دیکھ، آہیں ہم آہنگی نہ پوچھ
 نئے شغلِ نالہ و مطرب کا یہ نغمہ ہے
 مستی یزداں پرستی کے یہ، اندھ نہیں
 یوں دغ و کیف و حیرتِ اختصارِ نغمہ ہے
 آج کل نغمے یہ ہے، مطلق! حارِ شاعر
 شاعری پر پہلے کہتے تھے، حارِ نغمہ ہے
 کس کو ہر ہاں کیسے، اکون ہر ہاں اپنا
 وقت کی یہ باتیں ہیں، وقت اب کہاں پنا
 لے خدا! نگلہ سن لے دہنی بے نیازی کا
 آج حال کہتا ہے، ایک بے زبان اپنا
 تار و دنیا میں رہ کے خوب بھر پائے
 جل جل چلیں اسے دل: کچھ نہیں یہاں پنا
 یہی اندازِ حوادث ہے، تو دن ہو گا انداز

یہی دن رات اگر ہیں، تو وہ دن دور نہیں

دوسروں کو کیا کیسے دوسری ہے دنیا ہی

ایک ایک اپنے کو، ہم نے دوسرا پایا

کم بکھ میں آتے ہیں اب تو اس کے گل بوٹے

ہم نے نقشِ مسک کو کچھ مٹا مٹا پایا

رکھتا ہے تلکام، غمِ لذتِ جہاں
 کیا کیسے کہ، لطف نہیں کچھ گستاہ کا

میں حاصلِ نظر ہوں، تھکے دید میں
 دیتا ہوں کام ہر مہینے سے، نگاہ کا

بھگا نہ حیات سے لینا تو کچھ نہیں
 اس دیکھتے چلو، کہ تماشا ہے راہ کا

کہیں کس سے، پتے کی بات کہتا ہی نہیں کوئی

سینس کس کی میاں جس نے کبھی، اپنی بھی تم سے

اسے جنوں! باعثِ بد حالی صحرایا کیا ہے؟

یہ مرا گھر تو نہیں تھا کہ جو دیراں ہوتا

آہی جاتا ہے بُرے وقت میں اپنوں کو خیال

کوئی ہوتا جو مہاراجہ کی تو پر ساں ہوتا

کھیل ہو سہتی موم و موم، مگر ہے دلچسپ جو یہاں بیٹھ گیا آگے، وہ مشکل لے اٹھا

مہسفر ہو کوئی افتاد تو پیش آنے کو کہ قدم آج اٹھتا ہوا منزل سے اٹھا

جی چرائے کی نہیں شرط، دلِ ناز بہا دینے اٹھانے ہی کی تھری ہوا تو پھر لے اٹھا

یہ مقامِ حسن کب تھا کہ وفا شعار ہوتا کوئی کا ذخیرہ ہوتا، تو گناہ کار ہوتا

ترا پیر نیم کش ہو مرے شوق کی ترازو اسے کون تول دیتا جو جگر کے پار ہوتا

اسے پارِ بھل نہ کہت جو خیالِ تیرہ بخت جسے ذرہ کبر رہے ہو ایسی اک شرار ہوتا

نقل جہاں میری مصیبت خاطر مشکل پسند کوئی آسانیاں کہہ دوں کہ آساں ہوئیں

جل اٹھے تیری نگاہِ کرم سے سینے کے ڈٹ برسرِ جو شمعیں بجھا دی تھیں فوڈاں ہوئیں

تھا جنوں پرور مرا ذوقِ تن آرائی مجھے بے سرو سامانیاں خود ساز و سامان ہوئیں

ہو گئی دیوانگی ٹیکل اسبابِ خرد گایاں بجز دُوب کی اسرارِ عرفاں ہوئیں

ہماری داستان کے ساتھ رودادِ جہاں کیوں ہو

جہاں ہم ہیں، ہمیں تم ہوں، ہاں میں کیوں آساں کیوں؟

بھروسہِ عالم اسباب پر کس نے بتایا ہے

چمن کے چار ننکوں میں قریبِ آشتیاں کیوں؟

افسردہ خاطر ہی دلِ بھڑوں کو لے کر دیکھتے ہوئے چراغ نے گھر کو حبلِ لاویا

اٹھ گئے ہم درمیاں سے اٹھ گیا ہم سے حجاب

رہ گئے ہم اس کے جو کمرہ گیا پردہ، نہ ہم

دوستِ دل کیا ہے جا کر اپنی دل سے پڑھے
 دل تھا اپنا بھی کچھ، جانے مگر رکھنا نہ ہم
 دینچہ رسوائی نہیں، دنیا ہے رسوائی کا گھر
 ہیں سبھی رسوا، قویوں سمجھو نہ تم رسوا نہ ہم
 قائمہ کیا، رہتی دینیک انکو کوئی ر ہا
 یہ تو ظاہر ہے کہ رہنے کے لیے، دینا نہ ہم
 کھاگنی اپنی ہوس کی وضع، اپنی عشق کو
 بات کس کی روگنی کوئی، عدد و تہا نہ ہم
 ہم کہاں ہونگے دعاؤں میں اثر ہونے تک
 کچھ نہ کچھ ہو تو رہیگا، مگر ہونے تک؟
 خود ہو کے کچھ، خدا سے بھی، مردِ خدا نہ مانگ
 رسمِ دعا یہ ہے کہ دعا، دعا نہ مانگ
 میں اپنی بے زاری کی ندامت کو کیا کہوں
 تو اور شرمسار نہ کر، اسے گدا! نہ مانگ
 اس خاکدانِ دہریس، گھٹنا اگر ہے دم
 مقدور ہو تو آگ لگا دے، ہوا نہ مانگ
 رسمِ طلب میں کیا ہے، سمجھ کر اٹھا قدم
 آ، تجھ کو ہم بتائیں کہ کیا مانگ، کیا نہ مانگ
 خوگر ہو درو کا کہ یہی ہے علاجِ درد
 یہ کس کے بس کا روگ ہے، اس کی دوا نہ مانگ
 ملتی نہیں مراد، تو مطلقاً، نہ خیال چھوڑ
 میری صلاح یہ ہے کہ تو روٹھ جا، نہ مانگ
 ۴۴

الم مظفرنگری احمد اسحق (مولانا)

قوم کے افغان تھے۔ ان کے جدہ علی حسین خان پڑاؤ (ضلع مظفرنگر) کے رہنے والے تھے۔ یہ دیہات ان نواح میں افغانوں کی مشہور بستی ہے، اور یہاں کے کھنڈرات افغانوں کی گزشتہ عظمت کی داستانِ دہائی حال سے کچھ رہے ہیں۔ الم کے والد مولانا خان الزیاء صاحب، سید مظہر علی شاہ ایرانی سے بیعت کرنے کے بعد تارکِ دنیا ہو گئے تھے۔ جس پر ان کے نام میں لفظ "شاہ" کا اضافہ ہوا ہے۔

خان الزیاء صاحب کے ایک پیر بھائی تھے، سید صفہ علی ایرانی، علیم متوالہ پران کی نظر وسیع اور قدرتِ مسلمہ تھی۔ چنانچہ آتم جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو سید صفہ علی نے ان کی بسم اللہ کرائی۔ انہوں نے دنیات میں قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ، اور ادب عربی کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد علیم نجوم کی طرف توجہ ہوئی، تو اس میں بھی دستگاہِ کامل حاصل کی۔ جب عربی فارسی پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا، تو پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹیوں سے السنۂ شریعہ کے مختلف شعبہ امتحانوں کی وٹا حاصل کی۔ ساری عمر مدرسہ میں گواہی پہلے چندے لائبریری کا

میں رہے اور ۱۹۴۲ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر اسلامیہ ہائی اسکول مظفر آباد میں آگئے، یہاں سے ریٹائر ہوئے۔

بخوم سے متعلق ان کی معلومات کی وسعت کا اندازہ ان مضامین سے ہوتا ہے، جو ان کے قلم سے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ مومن کے بعد اردو شعراء کے حلقے میں الم سے بڑا مقہور کم ہی ہوا ہوگا۔ اس کی شہادت ان کا نیا کوہ حضرت رسول کو یم صلعم کا زاپچڑ ہے، جس میں انھوں نے حیات مبارکہ سے متعلق تفصیلی احکام لگائے ہیں۔ عظیم بخوم سے متعلق انھوں نے ایک مفصل کتاب بھی لکھی تھی، یہ غیر مطبوعہ رہ گئی۔

وہ سیما ب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے، اور خود استاد کو ان کی علم اور استعداد پر فخر تھا۔ نظم میں ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، سلیس، کوثر، سدرہ وطلوی، امیر لکڑہا (مارس) وادب ۱۹۶۳ء (لاہور)، گیتا منظوم، موخر الذکر، ہی پریوپی حکومت کی طرف سے ان کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ عظیم اختر، خضر ننگوی اعلیٰ کے شاگرد ہیں، اگرچہ خود اچھی کے ایما پر شروع میں انھوں نے سیما بخوم سے بھی اپنی چند غزلیوں پر اصلاح لی تھی۔ اپنی شعر گوئی کے آغاز میں پر و نصیر، راجندر، ناتھ شیدا نے بھی ان سے مشورہ کیا تھا۔ جب سیما ب کی صحت زندگی کے آخری ایام میں بہت مستحکم ہو گئی، تو انھوں نے اپنے فو شق شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے فارغ الاصلاح تلامذہ سے رجوع کریں، الم بھی ان اصحاب میں شامل تھے۔ اسی زمانے میں الطاف مشہدی اور احمد ندیم قاسمی نے الم سے بھی مشورہ کیا۔ گورنمنٹ کالج، جہلم (منزل پاکستان) کے پرنسپل سید صفدر حسین صفدر نے بھی شروع میں الم سے اصلاح لی تھی۔

انہیں پراسیٹ گلیٹنڈ کی تکلیف تھی۔ اس کے لیے عملی جراحی ہوئی، لیکن ناکام رہا اور اسی سے ان کا ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء کو منظرِ نگار میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر تقریباً ۸۳ سال کی تھی۔ منظرِ نگار میں ان کے ذوقِ مکان (فردوسِ نعل) کے شمال کی طرف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

چند شعرِ ملاحظہ ہوں :

شویشِ ہستی کے ضامنِ احسن کے جلوے بھی تھے

عشقِ تنہا بامشِ ہنگامہ محفلِ نہ تھا

گرا ہے خاک پر مڑکا لہے، دیکھو وہ آنسو کجس کا خزلِ دل میں قیام ہو نہ سکا
ازل کے دن سے بیاں کردا ہوں میں بچکر فناءِ غمِ ہستی مستام ہو نہ سکا
نوازشیں تو بہت کیں گاہِ بسا قے نے مگر ہم سے تمہی شغلِ حجام ہو نہ سکا
الم ہمیشہ رہا مقتدرِ پیرِ مغان جی تو اہلِ حرم کا امام ہو نہ سکا
چشمِ زدن میں کج رویا زندگی جہانِ راد بکھا بھی تو نے بے خبرِ اقصائے شرنے لیا کیا
سیکرہ دنوں عالمِ بے فیضِ عشقِ ہر پیشِ نظر پھر بھی تیری بزمِ گاہِ ناد میں تنہا ہوں یہاں
میں نے یکے ہیں نکاتِ فنِ المِ ایسا ہے جانتے ہیں سب کہ مرزا داغ کا بلو تاجوں یہاں
حقیقتِ آشنائے گلستاں فصلِ بہاراں میں

بحورِ رنگ و بو کو برقِ کاشانہ سمجھتے ہیں

کس دن جس کے شعلے خرمنِ ہستی کو پھونکنگے

ای بجلی کو ہم شمعِ حربِ فناء سمجھتے ہیں

چھپا لیتے ہیں ہرزخِ جگر کو فصلِ گلی میں بھی

چمن میں پھولِ منشاے غمِ نہاں سمجھتے ہیں

کچھ ایسی بھی آنادیاں ہیں کہ جن کی فضاؤں میں پھیلا ہے دامِ امیری
بڑے پرخطر ہیں وہ گوشے جن کے جو کچھ نفس کی حدود سے ملے ہیں

کسی گلشن میں یا صحرا میں جا بیٹھینگے دیوانے

پے نشیمنِ وحشت آپ ہی کی انجمنِ یکوں ہو

مجھے احساں نہیں منظور اس دستورِ گلشن کا

فردزاں آتشِ محل سے مری شاربِ جہنم کیوں ہو

ہر رگِ دل میں کھٹکتے ہیں اُلم و دیکھاں دور کے ساتھ، نگاہِ غلط انداز بھی ہے

کسی بہارِ گزشتہ کی یادگار تو ہے ہمارا بارِ خفا خزاں رسیدہ بھی

وہ بھی ایک جلوہ ہے پردہ کی نمود اہلِ نگاہ پر وہ حائل کہیں جسے

یہ ساغر میں ہر گلِ بادۂ کھفام آتا ہے بہار آتی ہے یا گلشن میں دورِ جام آتا ہے

کم ہیں سالانہ طرب میرے یہ کم بھی ہیں جنگ و فتنہ نہ بھی، نالہ و ماتم بھی ہیں

ہے تو اک سلسلہِ دعوتِ شرکاں قاتمِ خونِ فانی، رنگِ زخمِ جگمگ بھی ہیں

حوصلے دل کے بڑھانے کے یہ شامِ قلمِ ہمنشیں، تذکرہ گیسوئے برہم بھی ہیں

سینے میں کھنکی رہتی ہے، فشر کی طرح، "نفث کی خلش"

یہ پچاس یوں ہی رفتہ رفتہ جو دستِ جگر ہو جاتی ہے

خوابِ بخشِ زمانہ! کچھ خبر ہی نہیں جو زندگی کو سنبھالے، وہ وقتِ غم ہے

فیضِ ساقی سے نہیں محروم، بادۂ کش کوئی

میکدے میں مل ہی جاتی ہے، اگرچہ کم بھی

کھینچنے کے ساقی! جودل سے آتی ہے وہ کچھ اور ہے

ترے شیشے میں جوابِ کوثرِ دزمزم بھی

اتھاں گاہِ وفا میں ہے یہ کیسی خفا مٹی

اب حریفِ غم نہیں ہوتا کوئی، تو ہم بھی

ازل سے ان کے سنگِ دہ کو کھلی جس کی تمنا ہے

لیے ہے ایک وہ مجدد، اگلی ذوقِ جہیں میرا

پھولوں کو دیکھیے، رستہ روں کو دیکھیے
ان میں کسی کے شوخ اشاروں کو دیکھیے
چلیے تو سیرِ لالہ و گل کو بہار میں
اک دن تو اپنے سینہ نگاروں کو دیکھیے
اللہ سے! یہ بارشِ مستی رنگِ دیو
کس کا شاہ ہے، یا بہاروں کو دیکھیے
عشقِ بتاں کو بہرِ خدا چھوڑیے، آلم!
کب تک جاں میں ہر تلخ گاروں کو دیکھیے

دعوتِ جوش

(۱)

شمعِ حیاتِ شوق اب جلوہ طرازی نہیں
محلِ بسوز و ساز میں کیف و گداز نہیں
وقت نہیں ہے ساز گارِ زمانہ دنیا کے لیے
ختم ہے ذوقِ غزل و زلفِ ایاز نہیں
کوئی نہیں ہے شغلِ دستِ جنوں کے واسطے
جیبِ خود ہے خود ہی چاکِ اُمید و غم نہیں
آئینہ بہار سے دل کو تسلیاں ہوں کیا!
بادِ صبا کی جھینٹیں لالہ طرازی نہیں
اس لیے غم گئی ہیں ازاں نظر کی خیریں
بزمِ سکندری میں آج، آئینہ ساز نہیں
شدتِ درد و غم کے بعد دل کو سکوں کہاں
جوشِ نیا دکا جواب گری ناز نہیں
نہ جم غلط کا ہے اسیر جس کو بھی دیکھتا ہوں
شیخ ہو یا کہ برہمن، واقعہ راز نہیں

(۲)

لامتِ انقلاب ہے گردشِ چرخِ چنبیری
باقی رہی دھن کی طرزِ ادا میں دلیری
چھایا ہوا ہے دیکھائیں عید کی صبحِ دھام
گیٹ میں سازِ عیش کے گونج رہی ہے جلیبی
اص کی خبر نہیں اگلی، سلمِ خفتہِ بخت کو
حسِ عمل سے زندگی پاتی ہے، ادجِ مڑی

عید ہے ان کی جو کہ ہر خلق و دولت سے بہرہ
خلق خدا کی خدمت میں کرتے ہیں جو کہ وقت پر
جن کے کمال عجز سے دیتی ہے شانِ مقصیری
وہی تو ہیں مقلدِ رسم و رواجِ پیسری
ان کی جبین ہے مسجد و ریزِ عشق کی بازگاہ
ان کی خودی کو مل گیا، عز و وقار بوزی

(۳)

اک کہ بجائیں خواب سے جذبہ کامیاب کو
ظلمتِ زخمر کی ہو ویرانہ جس کی تجلیات سے
عروجِ جواں سے نمودیں باز سے انقلاب کو
ایسا جمال بخش دیں گری آفتاب کو
نفوں کا جوش لے اڑے نغمہ عجزِ رباب کو
فطرتِ سازِ عشق میں ایسی نوا ہو موجزن
ضبطِ سکون کی راہیں سے جو ہر اضطراب کو
مطلعِ عید پر ہم آج، لائیں اس آفتاب کو
مرکزِ اہلِ جوش کی جا کے بلند یوں سے وہ
جس نے صفا کے اوج سے ہر کے طلوع و وقت
لفظ و بیاں میں رکھ دیا مقصد الکتاب کو

انتباہ

باغیاں جب تک کہ ہے بیگانہ را از چمن
ہو نہیں سکتا کسی صورت میں دما از چمن
جس کنارے میں نہیں محفوظ اعیانِ خودی
وہ حریفِ ہوج طوفاں ہو نہیں سکتا کبھی
وہ جنوں شوق جو ہر اذِ سودِ دل نہیں
شورشِ آوازی ہے رونقِ محفل نہیں

ساز بے سودِ وفا کے گیت کو سمجھ گیا کون
جلوئے بے فیض کی تنویر کو دیکھ گیا کون

مذکورہ معاملین

دیکھ ان کی سمت بھی 'اے مالکِ سر و زمین!
جن کی جولاں گھاہ' ہے قہقہے پہنائے چین

ہر وفا دارِ گلستاں مستحقِ داد ہے
قدرِ آزادی ہے لازم، تو اگر آزاد ہے

ہو احقوت کا پجاری، تو ہے گر مردِ وفا
وہ دن سن لے، قادرِ مطلق کا ہے یہ فیصلہ

جس سے وابستہ نہیں انسانیت کا احترام
خود بخود ہو جائیگا اک دن فنا وہ انتظام

ناظر کا کوروی، میرزا احمد علوی

ان کے والد مرحوم امیر احمد علوی بھی مشہور اور کامیاب لکھنے والے تھے، گویا تصنیف و تالیف کا شوق اور عکہ و دہشے میں پایا۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری ”آشفۃ سرای میری“ میں لکھا ہے کہ میری ولادت ناٹھال (گڑھی، کانگوری) میں ۲۶ محرم ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) کو ہوئی۔ تعلیم علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی میں پائی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں میں علی گڑھ کا ذکر بھی بہت ہے اور تعریف بھی! دراصل انھیں اپنی مادر علمی سے عشق تھا اور اسی نے ان کی علی گڑھ شہر، یہاں کے باحول اور باشندوں سے دلچسپی اور محبت کو المضاغف کر دیا۔

وہ نظم و شعر دونوں پر قادر تھے جب تک تو اور درست رہے، نظم باتھ سے نہیں چھوڑا۔ جب صحت کمزور ہو گئی اور بیماری نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، تو دوسروں سے لکھواتے! خود بولتے جاتے اور کوئی شخص اسے قلمبند کرتا۔ معلومات اور مطالعہ آسان وسیع تھا کہ وہ کسی موضوع میں بند نہیں رہتا۔ اگر مضمون علمی اور تحقیقی ہوتا، تب بھی

وہ حافظے کا مدد سے اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات نکھائیے اور کسی حوالے کی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

آخر عمر میں مذہب سے بہت شغف ہو گیا تھا۔ صوم و صلوة اور اوراد و انفال کے بہت پابند ہو گئے تھے۔ نجوم و جفر میں بھی خوب دستگاہ تھی۔ اور یہ بھی انھیں اپنے والد سے ورثہ ملی۔ اکثر حکم ایسا درست ہوتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ لوگوں کو قویٰ بھی دیتے تھے اور ہر طرح کا مشورہ بھی۔

خوش اطلاق، خوش طو رک اور خوش پوشاک تھے، وغویش کھلانے کے بھی شوقین۔ حال آنکہ آخری زمانے میں مالی حالات بہت سست ہو گئی تھی، جب بھی ان کی طبیعت کرنے کی عادت نہ گئی۔

پرستش سے کینسر کا جان بیا مرض لاحق ہو گیا، لیکن ان کے صبر و شکر کے قربان جانیے کہ کبھی آفت تک نہیں کی اور نہ دیکھا گیا ہے کہ اس عارضے کے مریض درد سے جینیں مارا کرتے ہیں۔

اسی میں، ۱ جولائی ۱۹۶۹ء صبح کے وقت کھنڈ میں جاں بحق ہو گئے۔ لاش کا کوری گئی اور وہیں تکہ شریف کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

فرہوا نے تاریخ لکھی:۔
جہان علم و فن مفارقت سے غمزدہ ہے آج کوئی درہا ہے، کوئی ہاتھ لے رہا ہے آج
بپا ہوا ہے حشر ایک رحلتِ زمیں سے لے کیا شراہہ مہرباں دیا تھا ہے آج

(۱۳۸۹)

جسمانی یادگار چار بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ ان میں سے دو لڑکے انگلستان میں ہیں اور ایک پاکستان میں، چوتھے جناب احمد ابراہیم علوی روزنامہ قوی آواز میں ملازم ہیں۔

تینوں لڑکیاں بھی اپنے گھر بار والی اور خوش و شرم ہیں۔ ان کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں سے چند زیادہ اہم یہ ہیں:

(۱) ناول: چند رکلا؛ سہرا حلقہ؛ ستاروں سے آگے۔ (۲) تنقید: حالی کا نظریہ شاعری، تنقیدی شعور، جائزے، مطالعہء حالی، مطالعہء متنبلی، مطالعہء نسیں۔ (۳) تذکرہ: اردو کے مہد و ادیب۔ (۴) اسلامیات: ولی اللہی تحریک و غیرہ۔

عندلیب شادانی، وجاہت حسین

سنبھل (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے ایک صاحب اشتیاق حسین تھے۔ وہ چڑے اور جوتوں کی بڑے پیلے پر تجارت کرتے تھے۔ اصلاً صدیقی شیخ تھے۔ ان کا نکاح کوچہ قاضی، راپور کے تھانوں میں ہوا اور اپنی سسرال کے رواج کے مطابق غلو نے بحیثیت خانہ داماد اپنی زندگی راپور میں بسر کر دی۔ یہیں ان کے ہاں جاہت (عندلیب شادانی) پیدا ہوئے۔ ان کی دسویں وجے کی سرکاری سند پر تاریخ ولادت یکم مارچ ۱۹۰۴ء ثبت ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، وہ اس سے بہت بڑے تھے۔ سرکاری ملازمت میں اس طرح کی غلط بیابیاں ہو جاتی ہیں۔ ان کا سال ولادت غالباً ۱۸۹۷ء تھا۔ مدرسہ عالیہ راپور میں تعلیم ہوئی، جہاں ان دنوں سید اولاوحسین شادان بلگرامی کی بدولت حشر فیض جاری تھا۔ انھیں کے فیض کا نتیجہ تھا کہ عندلیب نے شادانی کی نسبت اختیار کی اور وہ بھی ایسی کہ جو نو علم ہو گئی۔

مدرسہ عالیہ کی تعلیم کے دوران میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحاناتِ منشی عالم (فارسی)

اور مولوی عالم (عربی) کی اسناد حاصل کیں۔ دسویں دورے میں تھے کہ ایک ہر عنوان کے باعث مدرسے سے نکال دیے گئے۔ اب یہ لاسور چلے گئے۔ یہاں انہوں نے بی اے تک کے امتحانات پرائیوٹ حیثیت میں پاس کیے (۱۹۲۲ء) انہوں نے ملازمت بہت کم عمری میں شروع کی۔ عربی فارسی کی تعلیم تو ممکن کر ہی چکے تھے اور اس زمانے میں پنجاب میں ہر تعلیمی درجہ گاہ میں یہ زبانیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے مدرسہ کی ملازمت کے حصول میں چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ پہلے ۱۹۲۱ء میں چند ماہ خالصہ ہائی اسکول، گڑوالہ (ضلع ہوشیار پور) میں رہے، اور اس کے بعد اسلامیہ اسکول، بریلی چلے آئے۔ ۱۹۲۴ء میں اسی حیثیت سے ایچ بی کالج، لاہور میں ملازمت مل گئی، جہاں دلیان ریاست اور اہرام کے بچوں کی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ اسی زمانے میں ان کی نواب دو جانا (ضلع روہتاک) سے شناسائی ہو گئی اور وہ انہیں اپنے ولی عہد کا اتالیق بنا کر اپنے ہاں لے گئے۔ دو جانا بیگم کی دوبرس رہے اور ۱۹۲۶ء میں دہلی سے آ گئے، جہاں منہد کالج میں اور دہلی کے پیکو مقرر ہوئے۔

دو جانا کے قیام کے زمانے سے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ غالب کے احباب میں محمد تفضل اللہ خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کے فارسی اور اردو کے مجموعوں میں ان کے نام کے خطوط شامل ہیں۔ مثنیٰ تفضل اللہ خان نے غالب کے دیوان فارسی کا ایک نسخہ اپنے لیے ۱۲۷۰ھ میں کھویا تھا۔ بعد کو یہ نسخہ کسی طرح دو جانا ریاست کے کتاب خانے میں پہنچ گیا، اور جس زمانے میں عندیہ شادانی دہلی گئے، وہیں موجود تھا۔ اپنے منصب کے باعث پورا کتاخانہ ان کے تصرف میں تھا۔ انہوں نے یہ خطی نسخہ دیکھا، تو ان کا حجب الٹی گیا۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر بھی تھی۔ بعد کو ان سے یہ تصویر پریذیڈنسی کالج، کلکتہ

کے فارسی کے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے لے لی؛ وہ غالباً اس کا عکس تیار کر دینا چاہتے تھے۔ کرناخدا اکا کیا ہوا کہ اس کے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ وصیت کر گئے تھے کہ میرا ذخیرہ کتب وغیرہ خدائے بخش اور تیل پبلک لائبریری، پٹنہ کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ان کتابوں کے ساتھ یہ تصویر بھی پٹنہ بھیج گئی اور آج بھی وہاں موجود ہے۔ شادانی مرحوم جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے، تو انھوں نے دیوان کا خطی نسخہ یونیورسٹی کتاب خانے کی نذر کر دیا۔ اس طرح گویا یہ بھی محفوظ ہو گیا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

۱۹۲۸ء میں شادانی صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی امداد کے استاد مقرر ہوئے۔ یہیں سے وہ ۱۹۳۱ء میں لندن گئے، جہاں سے انھوں نے ہندستان کے مسلمان موع کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی۔ انھوں نے مسلمان مؤرخوں کی فارسی تصنیفات، انشاء، اسلوب وغیرہ پر بحث کی ہے، ان کی تاریخی حیثیت سے اعتنا نہیں کیا۔ گویا موضوع فارسی زبان تک محدود رہا، تاہم تاریخ سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ مئی ۱۹۶۹ء تک شعبہ فارسی دہلی سے متعلق رہے۔ اور اسی پہنے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ اب وہ نقل مکان کر کے رامپور آنے کی تیاریاں میں مصروف تھے کہ خاتون حقیقی کا بلا دا آگیا۔ ان پر دل کا دورہ پڑا جس پر اسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہیں ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو عصر سے کچھ پہلے راہ گراے عالم جاودانی ہوئے۔

انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو کچھ انھوں نے پیچھے چھوڑا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ کے ہیں تھے۔ نظم و نشر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ایک زمانے میں وہ پریم بھاری کے فرضی نام سے افسانے بھی لکھتے رہے۔ مطبوعہ

سرایہ یہ ہے :

نظم : نفاط رفتہ (غزلیات و منظومات) (لاہور ۱۹۵۱ء)

تحقیق : تحقیقات (۱۴ تحقیقی مضامین)

تتقید : اردو غزل گوئی اور دو ریاضیہ مضامین پہلے سلسلہ وار ماہنامہ ساقی ادب
میں چھپے تھے) ؛ پیام اقبال (خطبہ صدارت یوم اقبال - ۱۹۵۰ء)

افسانہ : بھی کہانیاں ؛ ویش

ناول : چھوٹا خدا - دو طویل افسانے ؛ چھوٹا خدا اور بے روزگار

دوران قیام لاہور انہوں نے بعض نصابی کتابوں کے ترجمے بھی تیار کیے تھے مثلاً
انشای ابو الفضل (دفتر اول) ؛ چار مقالہ نظامی سرقندی (مقالہ اول) ؛ رباعیات
بابا ہریران ؛ قصائد قافیہ ؛ نقش بدیع ؛ جدید فارسی زبان کا لغت بھی اسی زمانے
کی تالیف ہے ۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۸ء میں ایک روزنامہ مشرق پاکستان جاری کیا
تھا چار سال بعد ماہنامہ خاور نکالا لیکن دونوں مالی مشکلات کا شکار ہو گئے ۔
ان کے اہل خانہ نے سے مشرق پاکستان میں ہجرت کر دی اور وہ ایک ایسی ضعیف فروزاں گل ہوئی
جس نے زندگی بھر اپنی علم کی روشنی سے دلوں کو متور کیا تھا ۔

پہلے نفاط رفتہ کے چند شعر ہیں :

محمدری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں	انھیں کی یاد میری زندگی ہے
بتیغ ادرتا ہوں اور کچھ نہیں معلوم	دل میں اک ترنما ہے ، یہ خبر نہیں کیا ہو
محبت میری سب کا حال ایسا تو نہیں تا	کردن آئندہ میں چلنے ، آنکھوں سے جو چر
جب کسی سے کوئی پیمانہ وفا کرتا ہے	کاتب اٹھتا ہوں کو میز ہی سا انجام دہو
خونترے ، کوئی مرے پاس کہاں ہوتا ہو	اپنے سایے پر بھی حیرا ہی گماں ہوتا ہے
مات اک بزم میں تھے جو رجحان کے شکوے	دل بھر کیلجہو تری ہر دو قیاد آئی

چاندنی، اور اداس تنہائی تم ہو کس حال میں، خدا جانے!
 تم پاس ہو، اور دل کا یہ عالم، تو بہ! یہ حال تو جب دوستے، جب بھی نہ ہوا تھا
 چاندنی، سبز، لب جو، لوگ بھی حلاط تم اگر ہمراہ ہوتیں، ہم بھی مہنتے ہوتے
 چاندنی، سبز، گل بے رنگ، دلو، نئے اداس

اک ترے جانے سے، کیا بتلاؤں، کیا کیا ہو گیا
 ہے، کیا گزرے گی اس بربادِ وقت پر جسے

دردِ دل کہتا ہو، اور یاد رہا نہ ہو تقریر کا
 نئی بھی دھن، صحبت کی داستانیں تاکا کیوں نے بات کا افسانہ کر دیا
 زمانے کی طرح اسے کاش! وہ بھی بیوقوف ہوتا

کہ اب اس کی وفائیں یاد آ کر خون رُللاتی ہیں
 اشد سے، دیوانگی شوق کا عالم وعدہ نہیں، اور جانبِ درد دیکھ رہی ہوں
 ایک شعلہ ہے کہ سینے میں پکتا ہے دھام شاید اتنا ہی صحبت کا صلہ ہوتا ہے
 بہت مختصر تھے محبت کے لمحے مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا
 ہواں ہیں پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم

خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے
 کہتے تھے تم سے جھوٹ کے کیونکر جییں گے ہم!

جیتے ہیں تم سے جھوٹ کے، نقدِ وجود کھائے
 دل آج، سید گھبرا رہا ہے اسے دوستِ آج کا کچھ تذکرہ کر
 دل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے رونے کو اکثر

دل کا یہ حال کیا ہے غم تنہائی نے کھلے صحبت و دھن، تو بہن جاتا ہے
 اب کچھ ایسا کام ملاحظہ ہو، جوان کے مطبوعہ مجموعہ نظم کے بعد کا کہا ہوا ہے: یہاں

پوری پوری غزلیں اس لیے دی جا رہی ہیں، تاکہ ایک تو یہ محفوظ ہو جائیں؛ دوسرے اس لیے بھی کہ اس طرح ان کا رنگ سخن پورے طور پر سامنے آجائیگا۔

بڑھ کے جب گیسوئے شب تابکر آتے ہیں
دوستو! تم پہ بھی گودا ہے کبھی یہ عالم؟
کھلے آغوشے پھول، ستاروں کی ضیائیز موئی
چاند پھر لوٹ کے اس بام تک آئے کہ نہ آئے
پتھر ناز کبھی ہوا کبھی تصویر بنیاد
بہرے چھین لیا ماہ سے اپنا پردہ کو
یک بیک رات کچھ اس طرح تری یاد آئی
اب بھی آجائے کہ آنکھوں میں ضیاء ماتی ہے
کششِ نقش سے بڑھ کر ہے محبت کی نقش
ہم امیڑوں کے لیے یوں بھی قیامت ہو رہا
اس نے بھولا ہے مجھے میری محبت کا فرق
ادھر سے مری یادوں کے ٹکڑے آتے ہیں
نیند ماتی نہیں، اور خواب نظر آتے ہیں
دل دھڑکتا ہے کہ شاید وہ ادھر آتے ہیں
دھم کیا کیا مجھے سنگا ہم سہرا آتے ہیں
دلربائی کے نصیب کتنے سہرا آتے ہیں
کتنے دیریاں درد و دیوار نظر آتے ہیں
جیسے آوارہ وطن لوٹ کے گھر آتے ہیں
اب بھی کچھ دہشت کے آثار نظر آتے ہیں
آسمان سے سرد و خورشید اتر آتے ہیں
چاندنی ہو تو یہ زخم اور ما بھرا آتے ہیں
جانباط میں تارے سے نظر آتے ہیں

خاک میں مل گیا میرا حسن گماں خود فریبی کا اب کوئی پہلو کہاں

عہد و چہاں ترے کاغذی پھول ہیں، رنگ ہی رنگ سے ان میں خج جو کہاں

خواب کیوں کہہوں، میں تو بیدار تھا اور اگر سچ ہے یہ سب تو کنویر کا

اب تو آسمان نہیں خود مجھے بھی یقین اس کے گیسو کہاں، میرے بازو کہاں

کون بدزدق تھا جس نے تشبیہ دی چاند سے اس کے دئے و کلام کو

چاند کے پاس وہ چشمِ جادو کہاں، چاند کے پاس وہ لعلِ دلجو کہاں

وہ غرورِ جوانی کی باتیں، وہ محبت کی بیدار وایتیں گیش

وقت کا سیل سب کو بہا لے گیا، اب گاہ تنہا میں جادو کہاں

- تذکرہ معاصرین -

لیکن تقدیر کل میری تنہائی تھی، آسمانوں سے جنت اترائی تھی
کج لیکن کے اعتبار آئیگا، تابشِ نازِ ادا بیل بالہ دکھاں

کا مرد لیس بھی چھان مارا، مگر سحر و انصوں کا پایا نہ کوئی اثر
تیری آنکھوں میں ہے بومنی الفتِ گوارہ، در نہ بنگاں میں اوجِ داد دکھاں

اپنے دامن سے پونچھے وہ آنسو مرے بس ہیں در الفت کی مہلج و
نقشِ براہ ہے یہ نتا، مگر اُس کا دامن کجاں، میرے کنو کجاں

ان میں صہبائے الفت چھپ چکی ہوئی، اُن میں مشت ہی دشت چھپ چکی ہوئی

کیفِ الفت سے دشت کو نسبت ہی کیا، تیری آنکھیں کجاں، چہرہ کجاں

بشیرِ غم کی تراوش بھی اسی تو نہ تھی مری فنا کی تابش بھی اسی تو نہ تھی

دل میں کبھی تھیں بہت چاند کی کرنیں لیکن چاند کے قرب کی خواہش بھی اسی تو نہ تھی

جذبِ اخلاص کا اعجاز ہے یا سوج سرب مرے اندوہ کی پرسش، کبھی اسی تو نہ تھی

ترے جلوے تو دی ہیں مگر اے ماہِ تمام! دل میں جذبات کی شورش بھی اسی تو نہ تھی

سجدے کرتی تھی نظر چاند کی چلے بھی مگر آوازِ مند پرستش، کبھی اسی تو نہ تھی

تو نے چلے بھی مجھے روشنیوں کی تھیں مگر دل پر انوار کی بارش، کبھی اسی تو نہ تھی

دُشہر سکتی ہیں نظریں، دہشت سکتی ہیں شعلہٴ حسن میں تابش، کبھی اسی تو نہ تھی

سمنِ اندامی و گلِ پیرمینی، قہر، قہر حشر میں جانے کی خواہش بھی اسی تو نہ تھی

اب جو پایا ہے ترا پادِ لاجبی ڈرتا ہے

سحر و شام کی گردش، کبھی اسی تو نہ تھی

شوق کی رات ہے، نماز کی رات ہے اور تقدیر سے چاندنی رات ہے

نغمہ ہے چاندنی، بادہ ہے چاندنی آج طوفانِ جذبات کی رات ہے

فلکِ دہر مشبہ تانِ عشرت بنا چاند نکلا تو پھر چاندنی رات ہے

ذکرہ معاصرین

اک پہلی ہے بوجھ تو جانیں کہ ماں
 خود ہی تیرن لومری زیست کی راعیتیں
 صبح ہوتے ہیں پھر ہم کہاں تم کہاں
 رد چکے، آؤ، سنس بول نہیں وہ گھڑی
 درد دل کہتے سنتے سحر ہو گئی
 شمع گل ہو گئی، چاند بھی چھپ گیا
 پھول ہی پھول تھے، اٹک ہی اٹک میں
 وہ ضیلے تبسم کی صبحیں کہاں
 ہائے کیو نکو پہ نظر دکھاؤں تمہیں
 آج کیوں اس قدر مومنی رات ہے!
 آج تم سے ملے کون سی رات ہے؟
 بزمِ انجم فقط رات کی رات ہے
 جو نہ آئیگی پھر، یہ وہی رات ہے
 کیا خبر تھی کہ یہ آخری رات ہے
 دل منہ پھٹا نہیں، اور اکھی رات ہے
 رات کل بھی تھی، اور آج بھی رات ہے
 زندگی اب فقط رات ہی رات ہے
 میری ہلکوں پر تاروں بھری رات ہے

کتنی سناں و دیران و اندہ گیس

یہ وہی کل کی منہتی ہوئی رات ہے

اگلی سی کہاں وہ رونقِ بزمِ سخن!

حسرت میں، نہ اصغر ہیں، نہ فانی باقی

کل ہم بھی نہ ہونگے، لے جو براہِ وطن!

وہ جائیگی بس ایک کہانی باقی

بیخود، عباس علی خان

ان کا خاندان پٹھانوں کا تھا لیکن ان لوگوں نے مدت سے لڑائی بھڑائی کا مشغلہ ترک کر کے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے والد رمضان علی خان بھی تدریس پیشہ تھے۔ بیخود ۲ جولائی ۱۹۰۶ء کو قصبہ قاضی کی سرائے (ضلع فیض آباد) میں پیدا ہوئے۔ بچپن وطن ہی میں گزرا۔ سن بمشکل بارہ برس کا ہو گا کہ ۱۹۱۸ء میں بھڑاہ برس، اپنے دادا کی میت میں کلکتے چلے گئے، جو تلاش روزگار میں جہاں گئے تھے۔ ابتدائی درجوں کی تعلیم وطن میں مکمل ہو چکی تھی؛ اب بڈل کے بعد سے آخر تک پوری تعلیم کلکتے میں پائی۔ دسویں درجے میں امتیاز حاصل کرنے کے نتیجے میں دو سال کے لیے اکیسر کبیر وظیفہ ملا۔ ۱۹۲۰ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے اعلیٰ کے امتحان پاس کیا، تو فارسی (آزاد) میں دسویں درجہ اول پایا، بلکہ صوبے بھر میں اول آئے۔ یہی صورت دو سال بعد ایم اے میں رہی۔

ایسے کامیاب تعلیمی دور کے بعد ملازمت کی کیا کمی تھی؟ چنانچہ فوراً ہی کلکتہ مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ چندے بعد اپنی مادر علمی اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج)

میں چلے گئے۔ سب سے آخر میں پرنس ڈی لنسی کاٹل، کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے رہے، زندگی کا آخری زمانہ یہیں گزرا۔

بڑے یار، باش اور مجلسی آدمی تھے، دوستوں کے درمیان، جن کا حلقہ بہت وسیع تھا، خوب چمکتے تھے۔ ابتدائی زمانہ بہت عیسراخانی اور تنگی ترشی میں بسر ہوا تھا، اس لیے طبیعت بہت بگڑ رہی ہو گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ جیسے گراں شہر میں انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں بچ بھی کیا تھا۔

بہت دن سے تنفس کا عارضہ تھا۔ ۶ اگست ۱۹۶۹ء صبح کے وقت اس کا شدید دورہ پڑا۔ علاج کے لیے رحمت بائی اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ لیکن وہاں بھی کوئی افقہ نہیں ہوا۔ اسی دن آدھی رات سے کچھ پہلے ساڑھے گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اگلے دن (۷ اگست) سرسہر کو خمازہ اٹھا۔ تھلا روڈ کے گوبرا قبرستان میں دفن ہوئے۔ پردیو شاہدی بھی جہنم مد فون ہیں۔ بخیر و کی قبران کے بالکل ہی قریب بلکہ عین اس کے پائین کوئی گوبھر کے فاصلے پر ہے۔ وصیت کی تھی کہ میری قبر کھپا رکھی جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں ہو گیا گیا۔ اس سے قوی اندیشہ ہے کہ مرد زمانہ سے اس کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔ لیکن یہ بھی وہم اور خام خیالی ہے۔

مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے۔ ان کے خواجہ تاش جیل منظر نے ایک رباعی میں جبری تاریخ کہی ہے:

بزم احباب کی وہ زینت نہ رہا وہ وارث مستصدات نہ رہا
بیرون نقی بزم پر مرگب نہ خو کہتی ہے کہ جانشین وحشت نہ رہا

(۱۳۸۹ھ)

اگرچہ انھوں نے تفنناً چند نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں (۱) مطالعہ قدرت (کلکتہ ۱۹۳۵ء) یہ دوسری کتاب ہے جس میں

بچوں کے لیے مختلف معلوماتی مضامین ہیں (۲) جام بنودی (کلکتہ ۱۹۴۷) کلام کا مجموعہ ہے۔ بعد کا کوئی رائج صدی کا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کچھ نثری مضامین بھی ہیں جو مختلف رسائل میں منتشر پڑے ہیں۔ مطبوعہ کلام میں غزلیات، منظومات، نعتیہ کلام اور جازعہ و جہم کی مدح میں قصیدہ نمک ہے۔

کلام پر رضا علی وحشت مرحوم (دف جولائی ۱۹۵۶ء) سے اصلاح لی۔ اور انھیں سے غالب سے عقیدت بھی ورثے میں پائی؛ کلام غالب کے عاشق تھے لکھتے ہیں،

کلام حضرت وحشت پسند ہے، بنود!

کمال حضرت غالب کو مانتا ہوں میں

جس طرح وحشت سے بہت لوگوں نے فیض پایا، اسی طرح بنود کے طفیل اس شمع سے کئی اور شمعیں روشن ہوئیں لکھتے ہیں ان کے شاگردوں کا اچھا بڑا حلقہ موجود ہے خدا نے انھیں قابل اور نیک سمائی اولاد سے بھی نوازا۔ چار صاحبزادے اپنی یادگارا چھوڑے ہیں۔ انھوں نے سب کو مقبول تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑے لڑکے جناب اختر من خان، ایم ایس سی، سینٹ ڈیویری کالج، کلکتہ میں سائنس پڑھاتے ہیں۔

پہلے چند شعر ملاحظہ ہوں، جو جام بنودی سے بعد کا کلام ہے:

کسی سے عشق کرنا اور اس کو باخبر کرنا	ہے اپنے مطلب دشوار کو دشوار تر کرنا
فرح کی سختی بڑھی، ان کو ہتیاں دیکھ کر	موت مشکل ہو گئی جیسے کاساماں دکھ کر
بدل سکا زمانے کے ساتھ ہی افسوس!	بدل گئی ہے نگاہ اس لیے زمانے کی
انگ ہو اختر سے یہ کچھ کر	میں اپنی منزل پہ حبا رہا ہوں
آپ کیجئے مگر خیال رہے	بات پھر لوٹ کر نہیں آتی
کون کس کا ہے، کون سستا ہے	کس سے کس کا ٹھکے کرے کوئی
موت وہ مانگے جو لذت بخش بیدار نہیں	ناخن غم کا بدل تیشہ فرما دہیں

آئینہ بن کے تری بزم کی زینت تو ہوا۔ کچھ تو کام آیا، مجھے دیکھ کے حیراں ہونا
تعبیب کیا، اگر مجھ کو محبت پھر حواں کرے۔ جھلک ہے حسنِ یوسف کی زینا کی جانی یا
دل آسنو کی دد بندوں سے کچھ ہلکا سا ہو جاتا ہے

اب اس سے زیادہ اور اُجالا ٹوٹے تارے کیا کرتے!
دنگ میں نہ نقشِ قدم، اندھیرا ہے تری تلاش نے غم کر دیا کہاں مجھ کا
چمک کر دنگ پر آتا، ایک ایک پہرا جو جانا۔ قمر کی ہیں قصویریں، یہ آنے کی دہ جانی کی
کوشش ہے عیش، تدبیرِ غلط، فطرت کا بدلنا ناممکن

جو تو تپ ہے، وہ ہوتا تھا، جو ہو گا اس کو ہوتا ہے

آخر میں چند شعرا رد کیجیے، جو ان کے مطلوبہ مجموعے جامِ بیخودی سے ماخوذ ہیں!
بیخود پڑا تھا، رہا تو پوچھی نہ بات تھی۔ اب حال پر چھتے ہیں غریب التیاریا کا
مردِ الوہوس پر حیف، استم ہو گیا اور۔ جنس وفا کو آپ نے ارزاں بنا دیا
بیخود، ہائے دل میں بھی کیا کیا خیال تھے۔ سب کو فلک نے خواب پریشاں بنا دیا
پیشانی بے نیاز دی ہے، خدا معلوم ہوتا ہے

خدا معلوم، کیا ہوتا، اگر وہ بت خدا ہوتا!
اگرچہ عہدِ وفا کا نہ اعتبار آیا۔ بہت ہے یہ بھی کہوں کہ تو کچھ قرار آیا
دخود کہاں ہیں اگلے ہمارے جنوں کی جیب۔ تھا تنگ ہم سے ہیرمن اور ہیرمن سے ہم
جب آئے منزلِ الفت، آہنگ تھے بوجھِ حنک کا

کہ لذت ہے محبت کی، غریبِ حن کھانے میں

محاکاتِ علم و فن سارے یہاں ادھام باطل ہیں

نہیں کچھ فائدہ ان مسئلوں پر سرکھانے میں

بعد سرایۂ دانش، جھکا دے سر کو قدموں پر
لہو مند اور خود داری، تو رسوا بن زمانے میں

جنگل سے چھوٹ کر ایسا ہوا بے خانماں جیسے زیر آسماں میرا خدا کوئی نہیں
 جان کر بخود ہوا خود دشمن اپنی جان کا پھر نگاہ کیوں دوستوں سے ہے مر کوئی نہیں
 مرے خیال نے خلوت کو کر دیا محفل حریٰ نگاہ نے خلوت بنا یا محفل کو
 کہاں سے آئی یہ حیرت نگاہ یہ خود میں کہ اس کو دیکھ کے کہتا ہے اہل محفل کو
 وہ ہیرا نہیں، تو کوئی ہیرا نہیں کیا کم ہے یہ زمیں جی، اگلی آسماں نہ ہو
 ان کو منظور خود عنائی غفلت پھیر غفلت ایک لن ترانی بھی
 ہم ان کو ہیراں پا کر، کہیں کیا آرزو دل کی بجو و برق سے ظاہر ہے جو قسمت حاصل کی
 فقط اک پاسِ خودی جتنو ہے کیا کروں بخودا و گرد عاقبت معلوم ہے بعد کو بھی منزل کی
 جام گردش میں ہو اور دور بھی مجھ تک پہنچے کہیں ایسی بھی تو اک گردشِ دواں ہو جائے
 بخود ہی سرحدِ دراک جنوں ہے، بخودا دو قدم اور کٹے عالم اکھاں ہو جائے
 چمن میں برق ہے، گلہیں ہے، اور ہے صیاد نفس میں پھر بھی تڑپتا ہے دل چمن کے لیے
 راضی پر رضا تھا تو، لیکن جب پوچھا تھا، کچھ کہنا تھا

بخودا! یہ قری خاموشی میں اک شکوہ پایا جاتا ہے
 شکوہ جو ردِ جفا کیونکر کریں اہل وفا آپ کے مہر و وفا کی یاد اب تک مل میں ہے
 خوشی پیہم کا حاصل انتقاماتِ برق ہے فکرِ حاصل ہے جسے وہ سبھی لا حاصل میں ہے
 دھپھرتی گھٹا میں جنوں سے، تو خدا کو مانا جائے بکے خوف ہے خدا کا، تجھے خوف ہے خدا سے
 ہماری سستی خود اس کی، جو وہ ہے جو ہر تو عرض میں ہم
 نہ تجھے جو ہم، تو خدا کہاں تھا، نہیں جو ہم، تو خدا نہیں

ابوسعید محمد محمد و محمد علی الدین

سلسلہ نسب مشہور صحابی رسول حضرت ابوسعید خدریؓ تک پہنچا ہے۔ بزرگوں کا وطن انظم گڑھ دیوپی تھا۔ یہ خاندان سلطنتِ مغلیہ سے وابستہ رہا۔ اسی سلسلے میں ان کے جدِ اعلیٰ اور گزیرب عالمگیر کی ہم دکن میں ان کے ساتھ چلے گئے اور پھر وہیں حیدرآباد کے ہو کر رہ گئے۔ محمد و محمد کے والد غوث محمد علی الدین تعلقہ اندول میں تحصیل کے محرر تھے اگرچہ محمد و محمد کی تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن غالباً صبح تاریخ ۲ فروری ۱۹۰۸ء (دیکھ محرم ۱۳۲۶ھ) ہے یہ مشکل سے چار سال کے ہونگے کہ والد کا حسین جوانی میں عمر ۲۹-۳۰ سال انتقال ہو گیا اور ان کی کفالت اور تعلیم و تربیت ان کے چچا بشیر الدین نے اپنے ذمے لے لی۔

گھر کا احوال ٹھیک مذہبی تھا۔ اس لیے نہ صرف تعلیم کا قرآن اور عربی سے آغاز ہوا بلکہ نماز روزے کی پابندی اور روزانہ ختم خواجگان اور مسجد کی جاروب کشی اس کا لازمی جزو قرار پائے۔ غالباً بعد کے زمانے میں مذہب سے لبہ اور اشتراکی خیالات سے قریب آئی ابتدائی ماحول کا ردِ عمل تھا۔

مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند اور اس کے بعد وہیں سٹی کالج میں اردو پڑھانے لگے۔ لیکن جلد ہی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث ملازمت سے ہاتھ دھو کر پڑا ان کی دیکھی اشتراکی خیالات اور اسی وجہ سے ٹریڈ یونین تحریک سے تعلق۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض کانفرنسوں میں شرکت کے لیے یورپ کا سفر بھی کیا، اور چندے واپس مقرر بھی رہے۔

۱۹۵۶ء میں عام انتخابات کے موقع پر وہ اکوڑھرا پر ویش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اپنی وفات تک وہ اس کے رکن رہے۔

وہ بعض جلسوں میں شرکت کے لیے آئی آئے ہوئے تھے کہ برصغیر ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء صبح کو ان پر دل کا دورہ پڑا۔ فوراً اردن اسپتال بھیج دیے گئے۔ وہاں حالت کچھ بہتر رہی تھی کہ اگلے دن مرض کا دوبارہ حملہ ہوا، اس کے یہ جان یورٹا ثابت ہوا۔ ۲۵ اگست کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہوئے۔ ۲۶ اگست کو لاش ہوائی جہاز سے حیدرآباد منتقل ہوئی جہاں اسی دن رات کو نام علی کے فوج میں قدمیں قبرستان اور گاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک ہوئے۔

انہوں نے کسی زمانے میں جینون کے ورلڈ (Cherry Orchard) کو اردو میں پھول بن کے نام سے منتقل کیا تھا اور اس کے نام و مقام تبدیل کر کے اسے بالکل حیدرآبادی نغض کے مطابق کر دیا تھا۔

ان کی زندگی میں کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: سرخ سویرا (۱۹۴۳ء) پہلی تو (۱۹۶۱ء) اور ریا طر قص (۱۹۶۶ء) آخری مجموعے میں مجموعہ 'اول' (سرخ سویرا) کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ مخدوم کا کلام اگرچہ اشتراکیت اور سیاست سے بہت متاثر ہے، لیکن ان کے غلو میں نے اس میں ایسا رنگ و روغن بھریا ہے کہ انہیں قبول عام کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ان کی وفات کے بعد ان کے مجموعے 'ب' طر قص پر ہاتھ بٹا دیا گیا ہے ۱۹۶۹ء کا پانچ پڑ

انعام دیا، یہ ان کی بیوی کو ادا کیا گیا تھا۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو، جو سادہ و قش سے محفوظ ہے:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زلزلہ کو ساتھ لے کے چلو
بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ شکام نشاط
سکون نے دالی، کھینچیاں لینے لگیں
جہاں بھی بیٹھے ہو جس جا بھی رات نئے لی ہے

انہیں کی آنکھوں کے قہقہے، انہیں کے پیار کی بات

یہ زرد زرد اجائے، یہ رات رات کا درد

یہی تو رہ گئی اب جان، بمقدار کی بات

تمام عمر چل ہے، تمام عمر چلے

آگنی اختتم نہ ہو یار، عکسار کی بات
بجایا تھا کہیں دور کوئی شہنائی

اتھا ہوں خواب میں اک خوابِ تمام بیے
وہ جو چھپ جاتے تھے، کیوں میں صحنہ انوس

ان کو لالاکے بٹھایا گیا، پوانوں میں
فصل گل ہوتی تھی کیا جہن جنوں ہوتا تھا

کچھ کچھ بھی نہیں جوتا ہے گھٹتا نوں میں
کچھ تو کئی دوراں بھی بہت ہلکی ہے

گھول دو جبر کی راتوں کو بھی پہاڑوں میں
کچھ تو طنزِ محبت کا اثر باقی ہے

تہتے گونجے پھرتے ہیں بیاباؤں میں
وہل ہے ان کی ادا، جبر ہے ان کا انداز

کونسا رنگ بھروں مشق کے افسانوں میں
شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نرا کی محمد دم

تذکرے رستوں میں ہر چہ ہیں پرغیاؤں میں

شاعر

کچھ تو سب قزح سے زنجبت لی، کچھ نر، چھایا تاروں سے

بیل سے تڑپ کو مانگ دیا، کچھ کیف اڑا یا بہاروں سے

پھولوں سے جھک شاخوں سے جھک اور مندوؤں سے تھک
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرا یہ

پست جوانی سے چھینی، کچھ بھیکری، کچھ اترامہ پس
پھر حسن جنوں پر دے دی آشفستہ سری دل کی دھڑکن

بکھری ہوئی زنجیں کرفوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
قطرت کے پریشاں نعروں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں جتیا، اک بُت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو تپھر کے دل میں بھرتا ہوں

انتظار

دلت بھر دیدۂ نناک میں بہاتے ہے
خوش تھے ہم اپنی تنہاؤں کا خواب آئیگا
نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئیگا
آگئی تھی دلِ مضطرب میں شکیبائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ وہ آپ آ ہی گئے
شب کے جاگے تھے تاروں کو بھی غیند آنے کی
صبح نے سچ سے دھتے ہوئے انگوٹھی لی
میرے محبوب! مری غیند اڑانے والے
ابھی جا رہا کہ مرے بھدوں کا اڈن نکلا

سائس کی طرح سے آپ تے رہے جانے رہے
اپنا اوان برا نکندہ نقاب آئیگا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئیگا
بج رہی تھی مرے غمزہ میں شہنائی سی
بجدے مسرود کہ مسرود کو ہم پائی گئے
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
اوجھلا تو بھی جوانی، تو اکیلی آئی
میرے مسرود! مری روح پہ پھانے والے
ابھی جا رہا کہ مرے بھدوں کا اڈن نکلا

اقبال

اے اندھیرے میں یہ کون آتش نو اگلنے لگا!
جاںِ مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں جھٹٹنے لگیں، جھٹٹنے لگیں
 فلتوں کی چادر میں بیٹھے لگیں، جھٹٹنے لگیں
 اک شرابہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
 آسمانوں پر زمیں کے تڑکے مچنے لگے
 عالم بالا پر باہم مشوئے ہونے لگے
 پھر اندھیرے میں دہی آتش نوا پائی گیا
 وہ نقیب زندگی، شام دھو گاتا گیا
 گیت سننے کے لیے خلق خدا آنے لگی
 "نغمہ جبریل ہے، انسان کا گانا نہیں
 "عروش کی تبدیل ہے، اک آسمانی لڑنے لگے
 سو برا سرا فیل ہے، مونیانے پہا نا نہیں
 داگ کیا ہے سر سے، پاک عشق کی اک لگے

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
 دیر سے، دور سے آئی ہے، اگر آئی ہے
 مری صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئیگا
 رات تو نیکی، اجاؤں کا پیام آئیگا

آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
 سازد آسنگ بھی، تو خیر بھی، جھٹکار بھی ہے
 زندگی دید بھی ہے، حسرت دیدار بھی ہے
 تو بھی، آب حیات لب و خسار بھی ہے
 زندگی درد بھی ہے، زندگی ولدا رہ بھی ہے

آج کی رات نہ جا

مذکورہ معامین

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات دہیا

بھاگ متی

پیارے آنکھ بھراؤں ہے، کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام دنا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
داگ کی اونگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگائی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں، نہ پُٹن کے بادل
سوئے چاندی کے گلی کوچے، نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے اتارا ہیں بازاروں میں
نواجہ شہزادے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے، محبت کا نشان باقی ہے
دہری باقی ہے، دلدارِ جاں باقی ہے

تذکرہ معاصرین

سرپرست نگار خان جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے، تری چشم نگواں باقی ہے

منہرو

ہزار رنگ ملے، اک سُبُو کی گرو مشیں ہیں
ہزار پیر ہیں آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا عُبَّار، مشیتِ بہار
ہو اے داویٰ جنتِ نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دُور مسیتو، بن کر

راذ چاند پوری، محمد صادق

۲۵ مارچ ۱۸۹۲ء کو چاند پور (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ خاندان میں پیشہ پسرگئی پشتوں سے چلا آتا تھا لیکن ۱۸۵۵ء کے بعد حالات دگرگوں ہو گئے، اور ان کے والد حافظ محمد جعفر کو کمر کھول کر ملازمت کو ذریعہ معاش بنانا پڑا۔ راذ جب تعلیم مکمل کر چکے تو انھوں نے بھی اسی پیشہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں جب ان کا تباہ کانپور ہوا تو یہ وہاں کے مشہور ماسٹرس، نانا کی تربیت میں بخشی دیا خزانہ نگار (۱۹۴۲ء) کے معاون بن گئے۔ یہ سلسلہ کم و بیش چار برس تک قائم رہا اور اس کے بعد ان کے جیلو چلے جانے کے باعث منقطع ہو گیا۔

کلام پر اصلاح سیما بکیر آبادی سے ل اور اس میں شک نہیں کہ خود استاد کی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی دلچسپی تھی، افسانے بھی لکھتے تھے۔ مبطوعہ کتابوں میں زیادہ اہم یہ ہیں:-

نثری افسانے، دنیا سے راز (مظہرات)؛ نواسے راز (غزلیات)؛ سیما بکیر آبادی (سوانح)؛ داستانے چند (یادداشتیں)

غیر مطبوعہ کتابوں میں صحیفہ مراد (منظومات) اور حدیثِ راز (دعا و عبادت) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹالسٹائی کے ایک مادل کا بھی ترجمہ بعنوان "ماشا" لکھا تھا۔ یہ بھی نہیں چھپ سکا۔ بچوں کی جو نامرنگی اور خاموشی کو رقیقہ عبادت کی دوائی مفارقت کے باعث ان کے آخری ایام بہت افسردگی اور مدلل مگر ٹھنکی اور گوشہ نشینی میں بسر ہوئے۔ اسی عالم میں ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اب چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں جو ان کے مجموعہء کلام "نوائے راز" (الکاباد ۲۱۹۶۱) سے منتخب ہیں:

راز سے مل کے آپ خوش ہونگے آدمی ہے بڑی محبت کا
جینے کا مزہ جب ہے، جینے سے ہو کچھ حاصل

بوس لاکھ جیسے کوئی، تو جینے سے کیا ہو گا
محبت اور پھر اُس کی محبت آہ کیا کیجیے!

تڑپ اٹھتا ہے دل جب نام مندا ہوں صبح کا
وہ منکدہ تھا غلط، خیر، منکدہ ہی تھی

مری نگاہیں تو اُس کا آستانہ تھا

سوہر قیہ ہیں پرستش کے، اگر ذوق ہو کچھ
کیا بڑی بات ہے کوئی اسے سجدہ کرنا،
شکلیں آساں ہوں؛ یہ آساں بھی ہے، دشوار بھی

مطمن ہوں کیا نظام بزم امکان دیکھ کر

جاننا ہوں، مگر بشرطِ ادب ہوں خطا دار جیغ ہر گز

مکہ نظر میں حدودِ حسنِ عمل کامیابی کا ہے یہی اک راز

جس طرف اٹھ گئی نگاہ شوق وقفِ سجدہ ہوئی جبیں نیاز

دل نہیں پہلوئیں، دردِ دل نہیں آہ! اب جیتے کا کچھ حاصل نہیں

چہین ملتا ہی نہیں دہریس دیوانے کو
 ہک خانماں خراب کی دولت کہیں ہے
 دھانی خیال کے تہہ بان جائے !
 دردِ فراق یار کی مجبوریاں، بجا !
 لے سکتا ہو، تو دے مجھے دادِ ستکشی
 لذت کشِ نظارہ ہے تیری نظر تو کیا !
 باقی کہاں ہے نازِ زمانے میں آجکل
 وہ دیکھنے آتی ہے دنیا مرے دیرانے کو
 وہ دردِ دل میں ہے کہ محبت نہیں ہے
 صورت ہے وہ نظر میں حقیقت نہیں ہے
 اتنا تو ہونہ شورا قیامت کہیں ہے
 یادہ سلوک کر کہ عداوت کہیں ہے
 اتنی تو بزدلی ہو کہ حیرت کہیں ہے
 وہ حسنِ دل نواز، محبت کہیں ہے

اک وقت میں دو باتیں، کیونکر نہ ہو دشواری

دنیا کی طلب کو شئی، حقیقی کی طلب گاری

اللہ اللہ! یہ بیچارہ گی، اہلِ منہ را
 زندگی ہوئی کیا بزمِ جہاں سے خواست !
 ناکام ہم محبت ہوں میں اسے راز تو کیا غم
 جو دم ہے غنیمت ہے خراباتِ جہاں میں
 حاصل نہ ہو گا کچھ سبھی اخفا نے راز سے
 موقع بھی مل ہی جائیگا پھر عرضِ حال کا
 ہے جتنوے تیر حقیقت ابھی فصول
 لے خوشنوا سے بزمِ محبت ! اٹھا باب
 وہ نغمہ چھیڑا، دجس آجائیں اہلِ دل
 لٹہ، ایک جام سے جہاں نواز کا !
 اہجارِ چشمِ لطف کا احسان ہے یہ راز !
 کیا زمانہ تھا اسے معاذ اللہ !
 اہلِ الفت کا جہاں میں نہیں پڑا کوئی
 نظر آتا نہیں اب سوختہ سامان کوئی
 یہ بات بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی
 پابندِ نفسِ عمر دشمنِ آیام نہیں ہے
 آمیزہ حالِ دل ہے جبینِ نیاز سے
 حاصل تو کو نیازِ ذرا چشمِ ناز سے
 واقف نہیں تو اپنی حقیقت کے راز سے
 بھرے دلوں کو آتشِ سوز و گداز سے
 گونج اٹھے بزمِ نازِ نوا اہلے راز سے
 ہاں، ایک جامِ میکہ، سوند ساز سے
 سوندِ دروں بدل دیا دم بھر میناز سے
 قلبِ میکش ہے نخرِ ناز کا

تذکرہ صلحین

زندگی ہے، نواب وہ زندہ دل، زاد بختک ہے ہر اک منجوار

مادہ اکس سے کہوں میں حال، برہمن غیر شیخ دنیا دار

قدم ہانگے بڑھا، اے مرد بیدار، دیکھتا کیا ہے

قبوب، دہریہ، جی ہے دنیا، خود نما ہو کر

یہ برہمن ہے، یہ شیخ حرم، یہ پریتاں، یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی میفروش نہیں!

مفتی انتظام الشہابی

قبیلہ گوپامو (ضلع بیتا پور) کے ایک علمی خاندان کے نام لیا تھا۔ ان کے مشہور علمی شیخ آدم بن محمد نیر حضرت شہاب الدین سہروردی اوچے سے ۸۰۰ھ میں گوپامو گئے۔ سب سے پہلے عہد باری میں ان کے ایک بزرگ عہدہ افتا سے سرفراز ہوئے اور اس کے بعد دارللمی حضرت بھی مفتی مقرر ہوئے جس سے خاندان کے افراد کے نام میں لفظ مفتی کا جوہر و علم کی طرح سے اضافہ ہو گیا۔

قادی عالمگیری کی ترتیب میں اس خاندان کے ایک فرد شیخ وجیہ الدین بھی شامل تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے دادا مفتی انعام اللہ تحصیل علم کے بعد کلکتہ گئے اور وہاں مسٹر کولبروک کے بیٹے کے امالیق مقرر ہو گئے۔ جب کولبروک دہلی میں ریٹائرڈ ہوئے تو یہ ریٹائرڈی میں سر مشتمل دار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اسی زمانے میں اکبر شاہ کی طرف سے انھیں خاقی کا خطاب عطا ہوا۔ غالب کے دوستوں

میں منشی غلام غوث خاں بیچر بھی تھے؛ یہ انھیں مفتی انعام اللہ کے ولادت تھے مفتی انعام اللہ بالآخر ریاست ٹونک میں ہتھم بند و بہت مقرر ہوئے تھے، وہیں سے یہاں ہو کر آگے آئے اور یہاں ۲۱ شوال ۱۳۷۷ھ کو انتقال کیا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔ انتظام اللہ کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود رہی، لیکن آخری زمانے میں اپنے طور پر اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ مختلف کتابوں سے استفادہ کر سکتے تھے۔ متوسطات تک دینیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد نقد نویسی اور انجینئرنگ سیکھی، لیکن ملازمت کی بجائے تجارت میں لگ گئے؛ مدتوں اپنے ہونی ارشاد حسین کی شرکت میں جانوروں (بشر، مہاشی وغیرہ) کی خرید و فروخت کرتے رہے۔ یہ مشغلہ دس سال یعنی ۱۹۲۵ء تک رہا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع سے تھا۔ اور انتظامی قابلیت بھی اچھی تھی، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں بائبل سوسائٹی کے طرز پر دائرۂ معارف قرآنیہ قائم کیا اور اسی کی طرف سے قرآن، حدیث، سیرت رسول وغیرہ سے متعلق کئی چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ یہاں دلی آگئے اور دنیا کتاب گھر (ناشرین) کے ہاں سوا سو روپے مشاہرے پر ملازمت کر لی۔ یہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں تعدد المصنفین سے بھی تعلق پیدا ہو گیا۔ اس ادارے کے لیے انھوں نے سلاطین، مہند اور تاراج بلیٹ کے کئی حصے مرتب کیے۔ برہان (ماہنامہ) کی ترتیب میں بھی کچھ دنوں شریک رہے۔

۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں متعدد علمی و ادبی اداروں سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ آخر تک لکھتے رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ”داعی اسلام“ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی، اور آخری ”قافیہ سجان اکبر باد“ ۱۹۷۸ء میں۔ ان ۵۴ برس میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ مشاہیر اکبر باد“ میں انھوں نے اپنی ۱۲۹ کتابوں کی فہرست

تذکرہ معاصرین

کی ہے۔ ان میں سے بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ ان کے موضوعات بھی بہت متنوع ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری حالات اور حوالے وضع کرنا تھی۔ اس کے لیے وہ بکلی کسی کتاب کا حوالہ دے دیتے بلکہ دیکھ دیتے کہ یہ قلمی کتاب ہمارے خاندان گوپاٹو کے کتابخانے میں موجود ہے۔ حالانکہ وہ واقعہ ہی درست ہوتا، نہ اس جام کی کوئی کتاب ہی عالم وجود میں ہوتی، اور نہ گوپاٹو میں کوئی کتاب خانہ ہی تھا۔ لوگ ان پر اعتراض کرتے، لیکن یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی اپنی حرکت سے پشیمان ہوا، نہ اس نے اپنی یہ انوسٹناک اور گمراہ کن روش ترک کی۔ معترضوں سے کہہ دیتے، میاں، تم اعتراض کرتے رہو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں، البتہ کے لوگ درست کو لینے؛ لیکن اس سے کسی نہ کسی طرح سے "یادغاں" کا نام تو آجاتا ہے ورنہ کاتیکہ کلام تھا اور اس سے ان کا اشارہ اپنی طرف ہوتا تھا، خود میں ایک مرتبہ بہت پریشان ہوا۔ انہوں نے اپنی ایک تحریر میں ایک قلمی کتاب کا حوالہ دیا اور کچھ دیا کہ یہ قلمی نسخہ ارکاٹ کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ چونکہ موضوع سے مجھے دلچسپی تھی، میں نے اپنے بعض مددگاروں دوستوں سے استدراکی۔ مہینوں کی ٹنگ وود کے بعد راز کھلا کہ سب جمل تھا۔ انالٹ وانا الیہ ماجون۔ پیر کے دن ۸ ستمبر ۱۹۶۱ء ساڑھے چھ بجے شام کراچی میں انتقال ہوا۔

علی عباس حسینی (سید)

سید علی عباس حسینی ۳ فروری ۱۸۶۷ء کو ضلع غازیپور کے ایک محاکمہ داروں پارہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی اے کی سند کے کراٹھوں نے ایل ٹی میں داخلہ لے لیا اور جب ۱۹۲۱ء میں یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو مددنی کا پیشہ اختیار کیا اور ملکہ قیلم سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں پرائیوٹ امتحان سے ایم اے کی سند لے لی۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزری اور تقریباً ۱۵ برس کی ملازمت کے بعد ۱۹۵۴ء میں پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی طاقب علمی کے زمانے میں انگریزی زبان کے افسانوی ادب کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اسی کے زیر اثر خود بھی افسانہ نویسی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ 'شمرہ کلیاں' تھا جو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں لکھا۔ لیکن ان کا سب سے پہلا مطبوعہ افسانہ 'ضرب کابل' ہے جو کانپور کے شہور رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'رفیقِ تنہا' شائع ہوا تو اس پر ہندوستانی اکادمی، لاہور نے انعام دیا تھا۔

انھیں اپنی تصنیفات پر چار مرتبہ انعام ملا۔ ایک کو ہی خندستانی اکادمی کی طرف سے؛ دو مرتبہ پر سکارس راجا سمٹی کی طرف سے اور ایک بار ایک امریکی اخبار کی طرف سے، جس نے مختلف ملکوں کے افسانوں کے مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ اسی سلسلے میں اتر پردیش حکومت کے اس پانچ ہزار کے خاص انعام کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جو ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں مارچ ۱۹۶۸ء میں دیا گیا تھا۔

دورانِ ملازمت میں انھوں نے درسی نصاب کے سلسلے میں بھی تیار کیے تھے۔ ایک تو کان لینگویج ریڈرس کے عنوان سے، یہ تقریباً ۱۲ برس تک یوپی کے مختلف اضلاع میں رائج رہا۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لیے اردو کو رس اور پھر ہائی اسکول کے لیے۔ اس وقت بھی ان کی کتاب گلستانِ شرد نظم "کشیر میں ہار سکھدری" درجوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ انھیں ترجمے پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ واللہ ان کا ترجمہ بہت مدت چونی، کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ یادگار لیکن بھونوان

One World and India جو فقہر آفاق مؤرخ آرملڈ ٹامین ٹی نے ۱۹۶۰ء میں لکھے، ان کا اردو ترجمہ بھی حسین صاحب کا کیا ہوا ہے۔ متعدد مسلمان حضرات نے کشیر کے موضوع پر ریڈیو سے اردو میں تقریریں نشر کی تھیں؛ ان کا انگریزی ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔

آخری دو تین سال بسترِ علالت پر گزروے۔ دل کے مریض تھے۔ اسی حالت میں، ستمبر ۱۹۶۹ء صبح ساڑھے آٹھ بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور رکھا گیا۔ مگر جانِ کھنوں میں آخری خواہنگاہ نصیب ہوئی۔ ان کی وفات سے اردو نے ایک صاحبِ نظر مصنف کھویا، اور میں نے ایک بزرگ ہیران اور دوست۔ ان کی محبت یاد آتی ہے، تو دل بٹھائے نہیں سنبھلتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تسلیت کی فرست حسب ذیل ہے۔ ۱۔

تذکرہ معاصرین

۱۔ انسانوں کے مجموعے : رفیق تہائی، آئی سی ایس، کچھ سنہیں نہیں، ہاسی پھول،
میلہ گھونٹی، ہمارا گاڈ، کانٹوں میں پھل، ایک عورت ہزار جلوے۔

۲۔ ناول،

سرشید احمد پاشا، شاید کہ ہمارا آئی، ندیا کنارے، حکیم بانا، ڈینگوں کا
بادشاہ (مضحکات)

۳۔ ڈراما،

فدتن (ایک اکیٹ کے ڈرامے)

ایر خسرو کی کہانی (اردو مندی)

۴۔ ناول کی تاریخ و تنقید۔

۵۔ مندی،

پھوٹوں کی چھڑی، گائے تان، کولنگری۔

بہت سی چیزیں نامکمل اور غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ نامکمل میں دو ناول ہیں، اور مکمل، لیکن
غیر مطبوعہ میں، ہماری اردو شاعری، راج ہٹ، اور تقریباً ۲۵ فلمی کہانیاں۔

آربری، آرتھر جان (پروفیسر)

ماہرین علوم شرقیہ کے حلقے میں عموماً اور فارسی اور عربی کی دنیا میں مخصوصاً پروفیسر آربری کا نام کسی تعداد کا محتاج نہیں۔ پچھلے ۳۰-۳۵ سال میں انھوں نے تصنیف و تالیف ترجمہ و تفسیر کے میدان میں جو قابلِ تعریف اور مستقل کارنامے سرانجام دیے، ان کی بدولت انھوں نے عالمی شہرت حاصل کر لی تھی۔ انوس کہ ان کا ۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کیمبرج میں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر آربری کے والد ولیم آربری برطانوی بحریہ میں ملازم تھے۔ پروفیسر آربری ۱۹۰۵ء کو پورٹس ماؤتھر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وہیں مقامی گرامر سکول میں ہوئی، جوا سنہ قدیمہ (کلاسیکی) کی تدریس کے سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے پیپر وک کالج، کیمبرج میں داخلہ لیا۔ یہاں اپنی محنت اور قابلیت سے انھوں نے متعدد دو نطیفے اور تمغے حاصل کیے۔ وہ اسے قدیمہ اور اسے شرقیہ دونوں امتحانوں میں اول آئے، جس کے جلد میں انھیں ولیم براؤن

تقدیر اور رائیڈ روڈ چارج براؤن وظیفہ اور دائر وظیفہ عطا ہوئے۔ اب ہر ایک کی نظر ان پر تھی۔ تبصرین کے دل میں جائزہ طر پر توقع پیدا ہو گئی کہ عربی اور فارسی علوم کے آسمان پر ایک نئے ستارے کا طلوع ہوا ہے اور خوش قسمتی سے آبروری نے انھیں مایوس نہیں کیا۔

تعلیم سے فراغت پر اولاد چندے اپنے کالج میں تحقیق کے شعبے سے متعلق رہے اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیہ کے صدر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے جب وہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان واپس گئے، تو انڈیا آفس لائبریری میں نائب کتابدار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، تو ان کا وزارت جنگ کے محکمہ رتنا بہتر (سنسٹریس) تبادول کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑے دن کے لیے وزارت اطلاعات سے بھی منسلک رہے۔ اگرچہ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اس کے نتیجے سے متعلق کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے ۴ مئی ۱۹۴۱ء میں انھیں جنگی خدمات سے سکندرش کو دیا گیا۔ اس پر وہ دوبارہ تعلیمی میدان میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد موت تک تعلیم مدرسین اور تصنیف و تدوین کا شغل ان کا اور رہنا بچھوٹا شمار۔ پہلے وہ لندن یونیورسٹی میں فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور دو سال بعد عربی کے۔ ۱۹۴۱ء میں وہ اپنے اصلی گھوڑا رز علوم بھیج بیٹھے، عربی کے پروفیسرین کو۔ یہ وہ کسی ہے جس پر کسی زمانے میں پروفیسر براؤن (ف ۱۹۲۵ء) مشکوک رہے تھے۔ اس لیے علمی دنیا میں اس ہمدے کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ آبروری کو ان کی جانشینی کا فخر حاصل ہوا اور انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔

آبروری کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ ان کی پہلی کتاب دینی عربی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دو دن جنگ کے صرف ایک سال ۱۹۴۱ء کو چھوڑ کر

۱۹۶۸ء تک کوئی سال خالی نہیں گیا، جب ان کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع نہ ہوئی ہو۔ بعض سالوں میں تو ۱۱ دو تین تین کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ آکٹھ (۸) کتابیں میرے علم میں ہیں، اور ممکن ہے کہ بعض تک میری صفائی نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے انڈیا آفس، کمبریج یونیورسٹی، چیشر بیسٹنگ کتابخانوں کی فارسی اور عربی کتابوں کی فہرستیں مرتب کیں، جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے ان کی وصیت معلولات اور وثیقہ سنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے شائع کیے، کئی کتابوں کو حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ انھیں قصوں سے بہت شغف تھا اور اسی سے انھیں قرآن کے مطالعے کا بھی خاص شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا، جو بریٹانیا سے بلند پایہ تراجم میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اقبال کی دو کتابوں — زبور مجملہ اور رموز بنجودی کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ پیام شرق میں سے لائنہ طور کا اور بانگ درا میں سے شکوہ اور حجاب شکوہ کا ترجمہ بھی کیا۔ اسرار خودی پر مفصل حواشی بھی قلمبند کیے تھے۔

بسیار گو اور زود نویس مصنفین کا تمام کام ایک معیار اور پائے کا نہیں ہوا کرتا، مجتہد کی وجہ سے وہ اس کی نوک یا کمرے کے لیے وقت صرف نہیں کر سکتے، جس سے ان کی تحریروں میں طلبہ کے ساتھ باس کا بھی اچھا خاصہ حصہ داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ اتنے کثیر التصانیف ہونے کے باوجود آبروی نے کہیں معیار کو گونے نہیں دیا۔ میری ان سے پچھلے دس بارہ برس سے خط و کتابت تھی، لیکن پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی، جب میں بلجیم میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقات میں اتوار ی اور دوست اور قربت پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے میری فرمائش پر نذر عرش اور نذر ذاکر کے لیے مضافین قلمبند کیے، جو ان کتابوں میں شامل ہیں۔ نذر ذاکر کی ترتیب کے زمانے میں ان کی تندرستی بہت خراب تھی اور اہل خانہ نے کام کاج سے منہ کر رکھا تھا۔ اس کے

مذکر معاصرین

ہر وجود انھوں نے میری درخواست پر انکار دیا اور ایک مختصر مضمون بھیج دیا۔ میں گزشتہ جون میں لندن گیا تھا۔ قدرتا ان سے ملنے کی تئیں تھی۔ لہذا اللہ وقت مقرر کرنے کے لیے میں نے کیربج ٹیلیفون کیا، تو ان کی ہنگام (سیٹا) نے بتایا کہ ان کی طبیعت بہت علیل ہے، ڈاکٹروں نے کسی سے ملنے جلنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ لیکن آپ اتنی دد رس اور مانتی مدت کے بعد کئے ہیں، چاہیں تو آجائے۔ ایسے میں مجھے انھیں زحمت دینے میں تکلف محسوس ہوا۔ میں نے کہا، نہیں، میں ابھی چند دن اور یہاں ہوں، پھر کسی دن، جب ان کی طبیعت بہتر ہوگی، حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ چار پانچ دن بعد پھر معلوم کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ہنوز ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی اور ڈاکٹروں کی پابندی بھی بدستور قائم ہے۔ غرض ان سے ملاقات کی فرصت نہ مل سکی اور میں واپس چلا آیا۔ اب حواطلاع ملی، کہ ان کا انتقال ہو گیا، تو مجھ کو قلع ہو۔ ان کی عزت گزشتہ، انکسار، لطف و کرم، عالماہ گفتگو۔۔۔ غرض ایک ایک بات وہ وہ کے یاد آتی ہے اور دل سے اٹھکتی ہے۔

اولاً جہانی میں ایک بیٹی 'انا ہے' وہ اپنے گھر بار والی ہیں۔

محمد اجمل خان

اصل میں ایک افتخار خانان کے چشم و چراغ تھے جن کا پیشہ سیاہگری اور کشادہ دلی تھا ان کے والد کا نام اسماعیل خانی تھا۔ محمد اجمل خانی صاحب کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کے جنگائے سیاحہ میں حصہ لیا تھا جس کی یادداشت میں وہ انگریز کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے۔ محمد اجمل خانی ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو یوپی کے قصبے گوتسی (ضلع پرہار گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک دوڑھائی سال الہ آباد یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے شعبے میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی لیے کبھی کبھی بعض لوگ ان کے نام کے ساتھ پروفیسر کا لفظ لکھتے تھے۔ اس کے بعد چند وکالت بھی کی، لیکن یہاں وہ جہم رہ سکے۔ ۱۹۳۵ء میں ٹیگور کی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے چلے گئے۔ دو سال بعد ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے انھیں اپنا سکرتھر مقرر کیا اور پھر ان کی وفات تک وہ اسی حیثیت سے ان کے وابستہ رہے۔

عربی زبان پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ مطالعہ قرآن سے بہت شغف تھا اور ترتیب ان حسب نزول قرآن ان کا خاص موضوع۔ چنانچہ انھوں نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحوی قرآنی پس منظر اور وحی کی ترتیب زمانی کے تعلق سے مرتبہ کر کے شائع کی تھی۔ اس کا مختصر انگریزی ترجمہ بھی چھپا تھا۔ دوسرے مذاہب سے بھی دلچسپی تھی، گیتا اور جیجی کے ترجمے اس کے گواہ ہیں۔ اور بھی چند چھوٹے چھوٹے رسالے ان سے یادگار ہیں۔ لیکن ان کا بہت بڑا کام ایک لغت تھی، انگریزہ حقوق میں اس سے وزارت تعلیم نے قطع کر دیا تھا۔ لیکن خدا معلوم شائع کیوں نہ ہوئی اور یہ بھی کچھ بچہ نہ چلا کہ اس کا حشر کیا ہوا اس میں رہائی استعمال کے اور دھندلی کے مرادفات دے چکے تھے۔ بڑے کام کی چیز تھی۔

میری ان سے ۱۹۳۶ء سے ملاقات تھی، آخری ان کے انتقال سے کوئی دس بارہ دن قبل ہوئی۔ ان کے سوچنے کا انداز چومکانے والا تھا، انھیں کسی بڑی سے بڑی مسئلہ رعایت کے خلاف رائے کا اظہار کر دینے میں کبھی باک نہیں ہوا۔ پھر لوگ جتنا اس پر دیکھے، وہ اس سے لطف لیتے ہوئے اور ہمیشہ تھے۔ اس کے باوجود میں نے انھیں کسی مذہب کی حمایت اور اخلاق کے احترام میں کسی سے کم نہیں پایا۔

مولانا آزاد کو وفات ۱۹۵۵ء کے بعد انھیں راجیہ بھگا کارکن نامزد کر دیا گیا تھا۔ اپنی رحلت تک یہاں رہے۔ ۱۸ اگست ۱۹۶۶ء صبح دس گھنٹہ اسپتال نئی دہلی میں انتقال ہوا اور اسی دن سپر کورپس دھیت کے مطابق بستی نظام الدین (غربی) میں احاطہ مخاندان خواجہ حسن نظامی میں دفن ہوئے۔ **بِسْمِ اللّٰهِ**

رئیس احمد جعفری

ان کا وطن سیٹا پور تھا اور ان کے خاندان کا وہاں کے عائد میں شمار ہوتا تھا۔ ان کا خیال یہی
 اصل میں خیر آباد کا مردم خیز قصبہ تھا۔ ان کے نانا نیا دا احمد صاحب مٹھیہ شاعر ریاض خیر آباد
 رف ۱۹۳۲ء کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ تین بھائی تھے (ریاض احمد، نیا دا احمد، ریاض احمد)۔
 اپنے والد سید طفیل احمد کی طرح یہ بیٹوں بھائی بھی پولیس میں ملازم ہوئے ریاض تو یہ کمزور لگا لیا اور
 دن نہ بیاہ سکے اور مستعفی ہو گئے۔ البتہ دوسرے دونوں بھائی آخر تک ملازم سرکار رہے۔
 سید نیا دا احمد (رئیس احمد کے نانا) تو ان بھائیوں میں سب سے سٹینڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز
 تھے۔ اور انہیں ملازمت سے سبکدوش ہو کر مدتوں مقیم بھی رہے۔ رئیس احمد جعفری کے والد
 کا نام ناظر حسین تھا۔ رئیس احمد ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ (ایک جگہ تاریخِ ولادت ۱۹۱۳ء
 بھی لکھی گئی ہے، جو ٹھیک نہیں ہے) ناظر حسین کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا، جب رئیس
 ابھی بہت کم سن تھے، اس لیے ان کی پرورش اور تربیت اٹا ناخیال (خیر آباد) میں ریاض
 کی سرپرستی میں ہوئی۔

سید ناظر حسین کی جوانی مارگل کے باعث جاواد کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکی اور کارندہ

مذکرہ معاصرین

کی عہد بردگی باعث تباہ ہو گئی۔ اس کا اثر رئیس احمد اہل ان کے بڑے بھائی معین احمد صاحب کی تعلیم پر پڑا۔ عیس احمد نو آٹھویں درجہ سے آگے نہ بڑھ سکے، البتہ رئیس احمد نے ذریعہ بازو سے بہت کچھ پیدا کر لیا۔ انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء فتحپور بھیجا گیا جس کا ان ایام میں ترقی پسند حلقوں میں شہرہ تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

چونکہ ان کی پرورش قلعی و ادب و احوال میں ہوئی تھی، اس لیے شروع سے مطالعے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں دارالعلوم ندوہ میں ایک انجمن اصلاح تھی۔ یہ اس کے دارالطالعہ میں جانے لگے اور یہاں کے رسائل و جرائد کے مطالعہ سے انھوں نے اپنی استعداد میں خاص اضافہ کیا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ خود انجمن کے رکن بن گئے اور ایک ہفتی قلعی رسالہ بھی جاری کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ انجمن کے نائب ناظم اور ۱۹۳۰ء میں ناظم منتخب ہوئے۔ ان کے دورِ نظامت میں انجمن نے بہت ترقی کی۔

اپنی قابلیت اور محنت کی حادثات کے باعث وہ اساتذہ کے بہت چہیتے تھے۔ خصوصاً شیخ الحدیث مولانا حمید حسن خان ٹونگی (۱۱۶۴ھ) شاگرد شیخ حسن بن حسن یانی و خلیفہ حاجی امداد اہل حاجرنگی انھیں بہت چاہتے تھے۔ اپنے قیام ندوہ کے زمانے میں انھوں نے جن اساتذہ سے پڑھا، ان میں مولانا حفیظ اللہ رشاد گرد مولانا عبدالحی (فرنگی مغل) مولانا عبدالحکیم صدیقی، مولانا عبدالرحمن نگرانی (ف) (۱۹۲۶ء) مولانا عبدالودود حیرا چوری، مولانا سید علی زینبی، مولانا شبلی نقیہ اول کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صرف دستوں میں مولانا حکیم احمد بھٹائی اور مولانا محمد سلیم کنٹوری ان کے استاد تھے۔

۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوہ کے طلبہ میں ایک سخت احتجاجی تحریک پیدا ہوئی تھی، طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ بعد کو چند طلبہ کمرے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ رئیس احمد بھی ان غلط باتوں میں تھے۔ چونکہ اب ان کا ندوۃ میں تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں تھا، انھوں نے جامعہ اسلامیہ دہلی میں داخلہ لے لیا۔ وہ جامعہ میں تین برس (۱۹۳۰-۱۹۳۳ء) رہے۔ اس زمانے

میں انہوں نے انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور کے جلاسا تذکرہ کرام سے انہوں نے بڑھا اور استفادہ کیا۔

مضمون نویسی اور اصلاح کے زمانے سے کر رہے تھے یہاں رسالہ جامعہ کی موجودگی نے گویا جہیز کا کام دیا۔ انہوں نے اس کے لیے متعدد علمی مضامین لکھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے بعض عربی چیزوں کا ترجمہ بھی کیا مثلاً منقولہ علی کا افسانہ الی اکوان الفقداء؛ مرحوم نے اس کا عنوان غریب خانہ لکھ رکھا تھا۔ یہ ترجمے کا حقوق اور تجربہ بعد کو ان کے بہت کام آیا۔

۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی نے لندن میں انتقال کیا، تو حامد علی خان میونسپلہ جامعہ فٹ دسمبر ۱۹۶۳ء نے ان کی سوانحی لکھوانے اور شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی نظر انتخاب ذوجان رئیس احمد پر پڑی جو ان کی مردم شناسی کی روشن دلیل ہے۔ رئیس احمد مولانا محمد علی سے غیر معمولی عقیدت تھی؛ انہوں نے اپنی سوانحی اور سوانح پر کاری کے باوجود یہ کتاب ایسی محنت سے قلمبند کی کہ صحیح معنوں میں آج تک بھی محمد علی مرحوم کی کوئی سیرت اس سے بہتر نہ درکنا، اس کے برابر بھی نہیں لکھی گئی۔ یہی کتاب ان کے مرکزی خلافت کمیٹی کے روزنامے خلافت (بھٹی) کے ایڈیٹر نے کا باعث بن گئی۔

اس نے اس خلافت ہاؤس اور خلافت اخبار بلکہ آل انڈیا خلافت کمیٹی عبارت تھی مولانا شوکت علی سے۔ اس کی بہار اور شباب بک کا رخصت ہو چکا تھا، لیکن مولانا شوکت علی اسے سینے سے لٹکانے بیٹھے تھے۔ آمدنی کم، خندہ نمادہ اور خرچ بہ دستور۔ ملازموں کی تنخواہیں چڑھنے لگیں اور قرضوں بھول کے تقاضے بڑھنے لگے۔ اخبار کی اشاعت ببقاعدہ ہو گئی اور دھڑلہ مٹنے لگی اور کارکن آہستہ آہستہ باری باری کنارہ کرنے لگے۔ سوانحی ایڈیٹر جہاں سے گئے، وہ آہستہ آہستہ مراد آبادی تھے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا آدمی نہ ملے، مولانا شوکت علی اسے جاری رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ دو ایک نئے ایڈیٹر کی تلاش میں تھے کہ

کسی نے انہیں سیرت محمد علی کے مصنف نہیں احمد حنفی کا ہتہ دیا۔ شروع میں رئیس احمد نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بالآخر وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ جون ۱۹۳۳ء کی بات ہے، جب ان کی عمر مشکل ۲۶ برس کی رہی ہوگی۔

جب انہیں خود یہاں جم گئے، تو انہوں نے اپنے بعض قدیم دوستوں کو بھی بھیج دیا۔ ان میں مولانا عبدالسلام قدوائی (حال شیخ الحدیث جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) بھی اس طور قابل ذکر ہیں۔ یہ صاحب دیر مقرر ہوئے تھے۔ غرض تبدیلی انہوں نے نہ صرف اخبار کا عمل مضبوط کیا، بلکہ خلافت کو از سر نو صاحب اثر روزنامہ بنا دیا۔ لیکن پرچہ مسلسل نقصان میں جا رہا تھا، انجام کار مولانا شوکت علی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ حنفی صاحب نے ان سے کہا کہ اگر آپ اخبار اور مطبعہ کا انتظامی شعبہ بھی کھلیں میرے سرپرست کر دیا تو میں اس کا صحیح و خوب برابر کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ مولانا شوکت علی نے بغیر تردد و تامل کے یہ جلیغ قبول کر لیا اور حنفی صاحب نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھا یا پرچہ نہ صرف اپنا خوب چلنے لگا، بلکہ اس سے منافع ہونے لگا۔

مولانا شوکت علی کے انتقال (دسمبر ۱۹۳۸ء) تک حنفی صاحب خلافت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے اور اپنا مستقل دار پرچہ جو ہر جا جاری کر دیا۔ اس نے بہت کم عمری ہی؛ غالباً آخر شمارے نکلے تھے لیکن اس دوران میں انہوں نے متعدد کتابیں، ناول وغیرہ لکھے اور ان کا نام ایک کامیاب صحافی اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

وہ شروع سے مولانا محمد علی سے بہت متاثر، بلکہ مرعوب تھے۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، وہ خلافت کی ادارت کے زمانے میں تو وہ خلافت کے داعی اور کانگریس کی مخالف سیاست کے گویا نقض باطلع بن گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ملک تقسیم ہوا، تو وہ بھی پاکستان چلے گئے۔ یہاں پرانی ادبی ساکھ ان کے بہت کام آئی۔

کراچی سے انھوں نے ایک روز نامہ خورشید اور ادبی ماہنامہ ریاض جادی کیے لیکن مالی مشکلات کے طفیل انھیں بند کرنا پڑا۔ اداۃ ثقافت اسلامیا لاہور نے جس کے صدر پہلے خلیفہ عبداللہ لکیم تھے اور ان کی وفات (۲ جنوری ۱۹۵۹ء) کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد کرام مقرر ہوئے، انھیں لاہور طلب کیا اور وہ اس سے وابستہ ہو گئے۔

وہ ندوئیس اور سبباد نوئیس تھے۔ بلکہ عام اطلاع یہ ہے کہ چند اصحاب ان کے ہاں ملازم تھے جب کسی عربی یا فارسی کتاب کا ترجمہ مطلوب ہوتا، اس کے پیاس پیاس ساتھ ساتھ صفحات ان میں تقسیم کر دیتے، یوں بڑی سے بڑی کتاب کا ترجمہ دس پندرہ دن میں مکمل ہو جاتا۔ پھر وہ اسے ایک نظر دیکھ کر کتابوں کے حوالے کر دیتے اور جیسے جیسے میں کتاب شائع ہو جاتی، بلا سانس ان کی مطلوبہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے کم نہیں ہوئی، اور بعض ان میں سے اچھی خاصی ضخیم ہیں۔ پھر ان کے موضوعات بھی بید متنوع ہیں، ناول، افسانہ، علم، ادب، سیاست و معیشت، اسیرت و سوانح نامہ، تاریخ و تذکرہ، حدیث و فقہ غرض تراجم و تالیفات کا ایک انبار ان سے یادگار ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنی محنت، شاقہ اور جنگ و دو میں صحت کب تک ساتھ دیتی! تندرستی خراب ہو گئی اور مہبت، بیاد رہنے لگے۔ لاہور میں وہ اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے کراچی میں تھے۔ یہاں دوسریہ دل کا دورہ پڑا۔ اس سے کچھ احتیاط برتنے لگے تھے، لیکن مدتوں کی مجبوری ہوئی صحت کیسے بحال ہو جاتی!

کراچی جانے کے لیے ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن گئے۔ یہیں دل کا دورہ پڑا اور آٹا ٹاٹا نا جان بخت ہو گئے۔ آٹا لٹھ ڈاتا امیر راجپوت۔

واقعہ مراد آبادی، سید یعقوب الحسن

۲۷ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدثری کا پیشہ اختیار کیا۔ طبیعت میں مزاج کا مادہ تھا اور پڑھنے کا انداز بہت ڈرامائی اور مبالغہ آلود تھا اور اسی پہلو سے ان کی شہرت تھی، اسی باعث فلم داں کی نظر علی ان پر پڑی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں یہ فلموں کے گانے اور گیت اور مکالمے لکھنے کے سلسلے میں بھی پہنچے۔ تقسیم ملک کے بعد علی بہت دن پریشان اور بیکار رہے۔ ۱۹۵۷ء میں بعض دوستوں کی مدد سے کمپ کا بیج اور دیال سنگھ کا بیج، دلی میں اردو پڑ جانے کی ملازمت مل گئی۔ ابھی چند برس ہوئے، وہاں سے الگ ہوئے تو اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان کا پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ تحقیق مقرر کر دیا تھا۔

بہت دن سے بیمار تھے، غالباً کینسر کی شکایت تھی۔ یہ موزی مرض لا علاج ہے۔ اسی میں ۱۶/۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کی درمیانی شب میں انتقال ہوا اور ۱۴ دسمبر کو کوئٹہ فیروز شاہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انہوں نے کسی زمانے میں ربا عیات عمر خیام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا؟ یہ حجب چکا ہے۔

اور کلام بھی مقدار میں بہت ہوگا، جو غیر مطلوب عدد ہو گیا۔
نمود کلام میں دو نقطیں ملاحظہ ہوں:

سُزِ گزشتہ سال کا ناول کا شمار

اس ترقی کے زمانے میں بڑی خوش فعلیاں
دیکھ کر ہر گھر میں بے یوں تو بجائے کہ ہاں
کاغذات شوق ہے، یا وقت کی سوغات ہے
کیا کہنی سمجھے، جو اس کا فیض بجا غلہ ہے
عشق کا میٹر ہے یہ تب تو گلے کا بار ہے
شالے پر دکھائے آنکھیں بند اس کی دھڑکی
کتنے موسیقار کا ہے اتنے سے ڈبے میں گھر
خند ہیں اس میں رنج و زہرہ و طلعت نکیش
چلتے پھرتے سنتے دیکھئے، طلحہ، سارنگی، ستار
ہوسو کی، نوریت ٹھکانا، بانسری اور جلیترنگ
دادا، بھری، غزل، ہنگامہ، شمع و سخن
کرات قرآن، اماں بھی اور تو آئیاں
اس سے ہلکا ہوا گیا ہے بھر کا کالا خنسا
یار کی آواز میں جلوہ منائی دیکھنی
زن سے نکل سائیکل، کافی بجائی شان سے
کاش اپنے ہوش میں ہوں، سر پھرے لہو چلا
کب بڑی بی جا رہی تھیں، مجھک چکی جن کی کمر

لڑکے ایسے تھے ہیں، لڑکیاں بلبلیاں
دیدنی پر کچھ سڑکوں پر نئی اگر بھڑچال
آج جس دنیا کو دیکھیں، سُزِ گزشتہ سال ہے
ہر حوالہ کا جو سُزِ گزشتہ سال سے ناز ہے
تجارت کا ہے، اب دھشت کی کیا فضا ہے
بہر میں بھی وصل جاتاں کا کیسے ہے جندوت
گیتاوت، شمشاد، کاشا اور نسا منگیشکر
ہیں تریا، نور و شمع اور آقبال دُسر لیش
و آملن، ہر رنگ، شبنامی، بکلا، روشتا، علی
ڈھولا، لوشکی و کبری، آہا اور ڈول کے رنگ
گیت اور مینہ، اتحاد، دوسے، میرا کے بھن
لہر، ہنس، تاج کی گھٹ، گھونگرہ اور آئیاں
ہے اکی ڈبے میں اب آواز اور تصویر پر بار
اک ذرا اکھٹا دیا، گردن جھکائی دیکھنی
چونکنا تھے، بھگت اک دم اس چاکلٹن سے
دیکھ لیں موقع محل، گانا ہے کیسا، بی کہاں
اور رادھ چائو ہے گانا، آج کے سچ رنگ پر

”یا تو تم ہم کو جناؤ پھر مزہ ہے سپا رکھا“
 آنکھیں اُن کو سہسی، پٹنی وہ خواری کے لیے
 اپنی تانی سے کرے یاری تو ہو گا دل بھی شا
 مگر سے کیوں نکلا ہے باہر کے بھینا کا فراق
 ساتھ میت کے اوڑھنیں محسوس عینا کی
 پھر صدائی کی مذمت بُردی سے ہو کر نا
 راجہ نامی چلو اُنوں میں ٹرافک، کانٹین
 بے تحاشا چلو اُن نے مرے گھر دن دابل
 طالبہ کا بچھا کر کے پھٹ پڑیں دسوائیاں
 جا رہی ہے ساتھ دلہن کو لیے کوئی برات

دیکھا منہ بڑھیا نے پھر کو عشق کے بہار کا
 کیا نہیں ہے تیری مینا، گھر میں یاری کے لیے
 واہ مے بے شرم بوٹے کچے شہدے ہزار
 میں تری دلی کی عروں کی ہوں بچہ ہے بھی
 ہنوا اس کو دھر گئی، دھن دھن دھن کی
 ساتھ سرحد پر سرگڑ ساتھ تم مت چھوڑنا
 سن کے ٹھکانا، اوسے راجہ کی کیٹیلے تو نے مینا
 اور پھر اُن کو پھکا ڈالے، گرا رے کا بلی
 پیادگی بچے لگیں بازار میں شہنائیاں
 اور ادھر فخر سرا سا ٹیکل پر کوئی ساتھ ساتھ

”ٹاک ڈالو اس خوشی پر جب کہ جی گھرا رہا
 دھوم سے دیکھو محبت کا جنازہ جا رہا“

مستقبل کی تعلیم و تعلیم گاہیں

اس ترقی کے زمانے کی جو کچھ رفتار ہے
 آج کی تعلیم گاہیں، ہونگی مستقبل پر بار
 ہونگی اپنے دیش میں تعلیم کی دنیا بھال
 سنکر ترقی دیش کی جبرجی اٹھیں گی ایک بار
 اک انوکھے ڈھنگ پر بریگ تعلیمی نظام
 کورس سے خارج رہ سب، بیچارہ جو بچک ہو
 مہتری یا تھیالوجی، سائنس، کامرس دینا
 وہ بتاتی ہے کڑاب کلر کا بیڑہ پار ہے
 آتی جبریشن تک جائیگی، اک تازہ بہار
 حساب اندازہ ہے، وٹنگ پریڈ پچھپچال
 شوق سے ڈالے گلے میں، دیٹ کے کلر کا مار
 ایسے تہذیب نو کے، کالجوں کے صبح و شام
 ناؤرن کلر میں، اسٹوڈنٹ سب پرفیکٹ جمل
 جاگرتی، انجینئرنگ اور سیالوجی، دور از نصا

ٹھیس، دینگ، بانگ، اور انڈنگ کپسری
 ہر پر و فیر بھی ہو گا ڈانس، ڈگری، ہولڈر
 مینو، آشا، بھوٹے، موقی، آوے، شکر، مریش
 جس میں ہوگی دوڑ، پوری، بھوٹ، مسنگ کے لیے
 بھیکس، ڈنڈ، پلینا، خوش، فعلیاں، جھنگ
 چل کٹی، نئے، چھپا، چھپ، ہر طرف، تال، ہو
 کپیش، ساز، گانے میں، یہ، پریاں، وہ، پری
 پھر، انکھے، ڈھنگ سے، تہذیب کی، ہو، چو
 میر، دیر، دین، دین، اور، دیکھے، سب، مشعل
 ماڈرن، کلچر کے، اپنانے، پر، ہو، گا، باڈو، روس
 گڑ، جو، آدوی کے، ہیں، سامے، کھائے، جائیگے
 ننگی، ٹیک، بیاہ کے، سارے، تھیلے، طاق، پر
 میں، کلچر، نو، لہجے، انوکڑ، سپن، آف، کاسٹ
 یوں، نظام، نو، سہولت کے، موافق، آئیگا
 سب، بھلا، دیکھا، وہ، کالی، دواس، اور، غار، کے، نام
 پھر، تو، دنیا، سے، محبت، میں، مزہ، دواس، کا
 آئے، دن، لڑکوں، سے، ہوگی، لڑکیوں، کی، محبت
 گڑ، بوئے، عاجز، تو، تھانے، میں، رٹ، لکھو، اٹیگے
 اور، غنا، بہت، ہی، ادب، سے، جھپ، کر، فرائیگے
 گھر، یہ، اپنے، بھائی، سے، فرائیگے، ایسا، مذاق
 ہوگی، بدنامی، ہاری، ہر، کوئی، سسٹر، ٹیگا

ڈانس، میوزک، ایکٹنگ، سٹنگ، سوئیٹنگ، سٹری
 ٹھیس، اور، گانے، میں، ماہر، ہونگے، سارے، کلچر
 ہو، گئے، پھر، جیسے، دار، انکھ، اور، طعلت، کیش
 پیر، پیر، چلا، یہ، در، دش، اور، دینگ، کے، لیے
 لڑکیوں، لڑکوں، کی، کشتی، نگہ، راد، رحمان، ٹنگ
 در، گھنٹ، بیجا، پانی، میں، دالی، بال، ہو
 تیسرے، گھنٹے، میں، میوزک، سٹنگ، اور، کٹر
 ہر، گا، جو، تھے، پر، یہ، میں، ڈانس، بھی، کپسری
 پا، جو، میں، گھنٹے، میں، فلی، ایکٹنگ، کے، سب، فرے
 پھر، چھپے، گھنٹے، میں، سوشل، اسٹیڈی، کا، خاص، کوس
 کیا، فریڈم، کے، ہیں، معنی، وہ، بتائے، جائیگے
 ہر، طرح، آزاد، سب، ہوں، خود، چپس، رائے، پیر
 پائیگے، دیش، میں، کوئی، نہ، سائن، آف، پائٹ
 آخری، گھنٹ، نقط، تسلیم، کا، رہ، جائیگا
 کار، لائی، انکسپر، رینالڈ، ڈیشن، کا، کھام
 ایٹ، کے، کلچر، کا، فیسر، بھی، نہ، ہو، گا، پاس، کا
 ذہینت، پھر، ٹیکس، کی، بدے، وہ، ہو، گا، پائٹ
 لڑکیاں، لڑکوں، کو، چھپر، بیگی، تو، وہ، ٹرائیگے
 ان، میں، کچھ، جیدا، اور، اگر، ہو، گئے، تو، وہ، ڈٹ، جائیگے
 دیکھنے، میں، صاحب، ہم، کو، ہنس، ایسی، ہے، شان
 گڑ، گسی، نے، دیکھ، پا، یا، آپ، کا، کیا، جائیگا

ہم کو آوارہ بھوکہ آپ کرتی ہیں خلیفہ
ہم بھی باعزت ہیں جی بال اور گھرانے کے شرف

اب کچھ خیاام کی دباہیوں کے ترجمے کا خونہ ملاحظہ ہو۔ مقابلے کی ہولت کے لیے خیاام کی
اصلی دباہیاں بھی دے رہا ہوں

دی کو نہ گرسے بدیم اندر بازار
مٹی کو ستھر رہا تھا جولا توں سے کھونڈ کر
بربادہ نگلے مکدہ ہی زولسبیا ر
مٹی زبان حال باوی گفت
وال نگل زبان حال باوی گفت
من بچو تو بدوہ ام، مرا نیکو دار

تا بود و دم ز عشق محروم نشد
کچھ کہتے کہ میں تحقیق سے محروم نہیں
کم بود اسرار کہ معلوم نشد
اک نکتہ اسرار بھی معلوم نہیں
اکنوں کہ بھی جنگم اذر سے خود
اڈر سے خود اب جو یہ سب دیکھتا ہوں
معلوم شد کہ بچ معلوم نشد
معلوم ہوا، خاک بھی معلوم نہیں

گر من زبے مغاضہ مستم، ہستم
بدست شرابی ہوں، دیوانہ کہ سودائی
در کافرو گبرویت پرستم، ہستم
کافر ہوں کہ مشرک ہوں، موسائی کہ عیسائی
برہائے ہم گمانے دارو
کیا میری بد اعمالی پیشگی زمانے کو
من راں خودم چنانکہ ہستم، ہستم
لاکھوں مرے مذہب ہیں، مسلک ہر جاتی

غیر بادہ خوری تو باخورد منڈاں نور
جو سے کا حقوق ہے، پی جا کے ذی شعوروں میں
یا باصنے سادہ رخ و خنداں نور
گلوں کی چھانوں میں، یا ناشگفتہ خودوں میں
بسیاد نور و در ممکن قاش مساز
دذ گہہ ٹاکے، جو عادت پڑے بھرم جانے
اندک نور و دیگر کہ خور و پینان نور
چھپا کے تھوڑی سی، وہ گلابی حضوروں میں

تذکرہ معاصرین

گرے نخوری، طعنہ مرزاں متاں دا
گردست دہا تو بہ گنم زرداں دا
تو فخر دیں کنی کہ من تے نخورم
صد کار کنی کہ تے غلام است کئی

ہے فخر اسی پر کہ توئے خوار نہیں
رندوں کی بھی تو بہ کوئی دشوار نہیں
اعمال وہ بترے ہیں کہ شر ہے شراب
صد شو کہ ہم رندو یا کار نہیں

پیرے دیدم بنائے خمار سے
گفتم نکنی زردنگاں اخبار کے
گفتا: تے خور کہ ہمہ من بیاں کے
دقتد کے باز نیار بارے

میں لے اک بوڑھے کو میخانے میں دیکھا تو کہا
واہ کیا کہنا، یہ سن آپ کا، یہ ریش و قبا!
بولا نادان! غنیمت ہے یہ جہلتا پی لے۔
پھر کوئی ٹوٹ کے آیا ہے، یہاں سے جو گیا؟

زاہد بہ زنی فاحشہ گفتا: سستی
کہ خیر گسستی و ہنس پرہیوستی
زن گفت: چنانکہ کا نام ایم بہتم
تو ہر چنانکہ می نمائی، ہستی

اک پیر حبی نے فاحشہ عورت سے یہ کہا
بیشرم! تجھ کو خوفِ خدا ابھی نہیں ذرا!
کی عرض اُس نے: جیسی بھی ہوں، ہوں حقیقتاً
فرائینے کچھ اپنے بھی باطن کا ماحضر؟

جامی حیدر آبادی انور شید احمد

حیدر آباد کے ایک علی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کا سقوط اس دراصل پر بھی (ہمارا آخر) تھا، جہاں سے ان کے نانا قاضی صدیق احمد فہیم تخلص نقل مکان کر کے حیدر آباد آئے اور یہاں دیکھ لیا کہ یہاں سب کا مقدر ہو گئے۔ جامی کے والد مولوی محمد یعقوب بھی عالم دین تھے۔

جامی حیدر آباد میں ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہو گیا۔ اس کے بعد تعلیم و تربیت اپنی والدہ اور نانی کی نگرانی میں پائی۔ عربی فارسی اور دینیات کی تعلیم گھر پر ہوئی اور بعد کے زمانے (۱۹۳۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انجمن کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ کسب معاش کے لیے چندے محکمہ آبکاری میں ملازم رہے اور اس میں انسپکٹری کے عہدے تک ترقی کی؛ لیکن جلد ہی دل اچاٹ ہو گیا اور اسے سنبھال دے دیا۔

انھوں نے ۲۲ برس کی عمر یعنی ۱۹۳۷ء میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں فصاحت

جنگ جلیل، ہیکچوری سے مشورہ رہا۔ ان کی وفات کے کچھ دن بعد علی اختر حید آبادی اور جوش ملیح آبادی سے کبھی اصلاح لی۔ وہ شاعری میں اقبال، فراق اور فیض سے بہت متاثر ہوئے۔ جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں، غزل اور نظم دونوں سے کچھ کچھ تھی۔ ادارہ ادبیا اردو کی طرف سے ان کی متعدد کتابیں چھپیں، جن میں نچوں کے لیے بعض کتابچے بھی ہیں۔ ان کے تین ابتدائی شعری مجموعے اشرا سے، نشان راہ، منزل کی طرف تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے رنگِ سخن بدلا۔ اس کے بعد دو مجموعے اور شائع ہوئے؛ خاصا چرخہ، انھیں ترقی اردو فاؤنڈیشن کی طرف سے ۱۹۶۳ء میں چھپا؛ اور دو سرا بگ، ادارہ ۱۹۶۸ء میں۔ تیسرا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا؛ لیکن اس کے چھپنے کی قربت نہیں آئی تھی کہ اس سے قبل خود ان کی کتاب زندگی کا ورق اٹل دیا گیا۔ یہ ان کی وفات کے بعد یاد کی خوشبو کے عنوان سے چھپا (حیدر آباد ۱۹۷۱ء)

لیکن جتنا کلام شائع ہوا، اس سے کہیں زیادہ انھوں نے دوسروں کی نذر کر دیا۔ ان کی بدولت کئی لوگ صاحبِ دیوان ہو گئے، ان میں سے بعض آج غاصے مشہور شاعر ہیں۔ آندھرا پوتیش سہیتیا اکاڈمی نے ۱۹۷۰ء میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف انعام سے کیا۔ پانچ سال ان کے تراجم اور قدردانوں نے جشنِ جاں منانے کی تیاری شروع کی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'قیمتِ عرضِ ہجر' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں شاعر اور غلامِ ادب تھے، لیکن خود غنائش سے کوسوں دور۔ مدتوں انھوں نے شاعروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا، بلکہ احباب کی نجی مجالس تک میں بھی شعر سنانے کے روادار نہیں تھے۔ ادھر پچھلے دو چار سال سے احباب کے اصرار پر کبھی کبھی شاعرے میں چلے جاتے، لیکن اس طرح جیسے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہو۔ تاہم کار و گلا پایا نہیں سادی عمر بھر دیں گراڑی۔

صحت ہمیشہ بالعموم اچھی رہی۔ اگرچہ آخری ایام میں مختلف عوارض کی شکایت کرنے لگے

نہے، اور بد قسمتی سے کوئی آٹھ مہینے ہوئے، اکیس کے مووی مرض کا شکار ہو گئے، جیب ان کی حالت کشمکشناک شکل اختیار کر گئی، تو ۱۸ فروری کو انھیں بغرض علاجِ دوا خانہ عثمانیہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہیں ۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو اور شاہ کے وقت جان جان آفرین کے سپرد کی۔ ہوش دھواں آخو تک درست رہے، بلکہ چند منٹ پہلے تک بات چیت کرتے رہے۔ لاش ہی دن اسپتال سے ان کے مکان (علاء سلطا پنور) منتقل کر دی گئی، جہاں سے اگلے دن (۹ مارچ کو) بعد عصر جنازہ اٹھا۔ نماز جنازہ مسجد کھڑاویں داے شاہ صاحب میں ادا کی گئی اور ساحلہ چوٹی شاہ کے قبرستان (عثمان پورہ) میں سپردِ خاک ہوئے۔ نورانی بیگم نے قطعات تاریخ وفات کہا:

شور ہے ملکِ معنیٰ میں بسا بے کیا جای کو ہم نے کھو دیا
سالِ مشق و طہ یہ نورانی! نکھو حیف کی غور مشید احمد نے قضا

(۱۹۷۰)

جای کے کلام پر، بنجیدہ نظر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے مسائل پر انوکھے اخلاذ میں سوچتے ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہ و استعارہ کی تازگی بھی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور کے ممتاز نگینے داے تھے۔

پہچان بھی سکی نہ مری زندگی مجھے اتنی وہ اردی میں کہیں سا مٹا ہوا
حرفِ قریب پہنچ کر بھی کم نہیں ہوتے غمِ حیات نے جو حاصلے بڑھائے ہیں
ہنگامہ حیات میں اسے تسخیرِ دلبری! لمحاتِ دل ملے، تو بہت مختصر ملے
کتنی شبوں کا زہریلا ہے نگاہ نے اس انتظار میں کہ نگارِ سحر ملے
حالاتِ خود ہی پاؤں کی زنجیر بن گئے دردِ کچھ اتنی دور نہ تھی تیری انجمن
شعورِ غم کے سوا کچھ نہیں ہے غم کا علاج مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے
ناصحا! میرے ساتھ ساتھ ذرا تم بھی اس رنگِ رستخار آؤ

بھلا ہے کس کا ہوا لات بھر چائوں میں
 اسی نگاہ نے جینا سکھا دیا بچہ کو
 وہ حیات میں کہنے ہی پہنچ و خم آئے
 یاد دہات کہ دل مٹن کے ہو گیا اخیان
 دیکھا تو روح دل پہ اترے نام کے سوا
 کچھ دور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں
 جا ہی مرے خلوص نے سینے میں دکھ لیے
 نیم تاریک سی گلیوں میں کہیں ٹھہرا کر
 کچھ دیے اور جلاؤں کا سر راہ ہوا
 وہی روتی ہیں وہی زخم، وہی راہ گزرا
 وہ غم، شہرِ حتم کی جسے آگ مل گئی
 لرز گیا مری تنہائیوں کے شانے پر
 اک غم ساتھ ساتھ مرے زندگی رہی
 کس سے کرتا دل خود اور غموں کا سودا
 جب بھی ملے وہ مجھ سے انے وہ ہیں ملے
 غم کی دادی ہے، زیادوں کا سلگتا جھگل
 اعتبارِ نشاط سے پہلے
 بے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو
 دل کی راہوں میں کوئی سایہ لرزاں بھی
 اس طرح ترے درد کو سینے سے لگا یا
 کا نہ صوں پاتھانے مجھے صدیوں کا اندھیرا
 غور و جن بکرا اب یہ پوچھتا بھی نہیں
 مری حیات کو اب جس کا آسرا بھی نہیں
 بھرہ گیا ہے کوئی، کہاں پتا بھی نہیں
 دگر نہ تیری صدا، دور کی صدا بھی نہیں
 چلتے ہوئے نشانِ ستم اور بھی ملے
 سٹکن ہے راستے میں نہیں زندگی ملے
 یاد ان خود فریب سے جو زخم بھی ملے
 پھپھکتی گردِ کشاکش میں امیدوں کی بھر
 میں نے کچھ سوچ کے دکھائے قدم کا تھوڑا
 ختم ہو گا کہ نہیں، تیرے نصیبوں کا سفر
 میرا خیال ہے کہ مسجھائے دہر ہے
 کوئی 'خیاں' کسی دستِ ہیراں کی طرح
 لیکن کسی بھینل کی دولت، سخی رہی
 نکبت گل بھی نہیں، سایہ گیسو بھی نہیں
 برسوں میں ملے ہوئے ہیں تعارف کے چلے
 ملے "ایسے میں کہاں چھوڑ گیا ہے کوئی!
 عزمِ دوراں سے مشورہ کروں
 زندگی ہے وہ برگِ آوارہ
 ساتھ چلتا ہے، کسی چارہ گردل کی طرح
 جیسے کوئی ردِ سخن ہوئے ساتھ کو کٹا
 پھرتے ہیں سروہر کی آغوش کے پالے

امید کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے لگ کر
اور اقبہاراں کو، پھر رک بار الٹ کر
صدیوں سے اسی طرح سمجھتی ہے خدائی
وقت نے مات کے ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا
آج مفروضہ وہی دست عزیزوں کی طرح
جیسے ریشم میں پیٹے، کوئی انگاروں کو
دل میں اس طرح تراودا بھرا آتا ہے
یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے
اس طرح پھانسیوں نے پکارا ہیں کہ ہم
ہر صبحی سے اپنا پتا پوچھتے پھرے
کل ہم وہاں سے آئے، یہی سوچتے رہے
بہت کچھ، جو کتا بوں میں نہیں تھا
زندگی ظفر ہے، دشنام ستار سوائی ہے
غم کی قندیل جلاؤ گا، بہت ممکن ہے
لوگ پھرتے ہیں یہاں حوت سلامت کی طرح
بس طرف جمع احباب کھڑا تھا، جانی
اب زندگی کے نام پہ یوں چونکتا ہوں
دلے پڑے ہیں کہیں تیرگی کے مرقع میں
بڑے عجیب ہیں یہ درد و غم کے رستے بھی
زندگانی کو جھکتے ہوئے سارے کی طرح
کتنے چہروں پہ غم، ہر کی تحریر پر بھی

سوار جو سوچا ہے، وہی سوچ رہا ہوں
دیکھو تو ہیں، نام ہمارا بھی کہیں ہے
صدیوں سے اسی طرح خدا عزت نہیں ہے
صبح کے پاؤں میں حالات کی زنجیریں ہیں
میرے خوابوں سے گریزاں، مری تعبیریں ہیں
یوں حقائق کے بن پڑ ہیں خزانوں کے لباس
نرم مٹی پہ کوئی نقش کھت، پا جیسے
اور بھر بھی ہے، ہر اک شخص اکیلے جیسے
جیسے کوئی رسول تھے، اہل کتاب تھے
ہم سے جہاں میں اور بھی خانہ خواب تھے
آغوش ہر ایک چہرے پہ کتنے نقاب تھے
وہ چہروں کی بکروں میں پڑھا ہے
سب تماشا ہے یہاں، کوئی تماشا ہی ہے
کوئی ہمان سرشام، مرے گھر آئے
زندگانی کا یقیں آئے، تو کیونکر آئے
ہم پہ آئے تو اسی سمت سے تھیر آئے
جیسے نیا خیال ہے موضوع گفتگو
وہ لوگ جن کو تلوں کا قرب حاصل تھا
کہ جس کو دیکھتے، اپنا دکھائی دیتا ہے
دل کی گلیوں سے گنی بار گزرتے دیکھا
کتنی آنکھوں میں سواروں کو ابھرتے دیکھا

ہائے، اک اڈنِ تبسم کے لیے، کلیوں کو	مشورہ تلخیِ ایام سے کرتے دیکھا
تجھ کو پایا، تو دھر گئے ہوئے دل میں پایا	تجھ کو دیکھا، تو خیالوں سے گزرتے، دیکھا
وقت کی تیزی رفتار کی زد میں، آکر	ہم نے اک عہدِ روایات کو کرتے، دیکھا
احساس کے شعلے، اندامِ دہن کے سمندر	انسان ہیں، یا صرف تراشے ہوئے پتھر
حباب کے خلوص میں شاید کئی ہوئی	دل کے قریب، لاکِ بناں بھی نہیں کوئی
حالات کے فریب لے پتھر بنا دیا	اب زندگی تو بارگراں بھی نہیں کوئی
اپنے قبضے میں تو زنجیروں کی بڑی دوسری	کیوں نہ پھر وقت کا سب قرض بکا جائے
دل میں اس طرح ترے درد کو رکھ لیتا ہوں	جیسے گھر میں کسی بھرم کو چھپا جائے
اب زلفِ عنبریں کی پناہیں نہیں تو کیا	آوازِ گانِ غم کے ٹھکانے ہیں اور بھی
جتنا ہے ایک ذہن، ہکتا ہے ایک پھول	روزِ ازل سے، ہے یہ تخلیق کا اصول

دیارِ ہند

دیارِ ہند کی عظمت کا نام زندہ ہے
 اتر گیا ہے، نیا آفتاب سینوں میں
 دھڑک رہے ہیں شبِ دراز کا رگھونوں کے
 ابھر رہے ہیں، نئے خوابِ نرم مٹی سے
 چمک رہے ہیں، نئے حوصلے کسانوں کے
 چلے چلو، کی صداؤں سے گو بجتی ہے فضا
 روِ حیات میں ہیں قافلے جوانوں کے

تذکرہ معاصرین

ہر ایک پھول کی پتی ہے اب سببِ نشان
ہر ایک شاخ ہے کینچی ہوئی کماں کی طرح
نئی انگ نئے جوثر کا تقاضا ہے
حد پہ ٹوٹ پڑو اورگ ناگہاں کی طرح
فریب کا راند حیرتوں کے فرق پر چلو
بنامِ حسنِ سحر تیغ بے اماں کی طرح

چلے چلو کہ ابھی سہرے ہیں غم میں
پیک رہے ہیں جہنم کے چہنچہ سائے
چلے چلو کہ گلستانِ امن و آسادی
تھاری جراتِ بیباک سے نکھر جائے
نظر میں آگ، ارادوں میں بجلیاں لے کر
چلے چلو کہ ہر اک فاصلہ سمٹ آئے
دیارِ مہند کی عظمت کا نام زندہ ہے

عبد الشکور (پروفیسر)

ان کے والد عبداللطیف صاحب سرکار انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ڈپٹی کلکٹری تک ترقی پائی اور پٹنن کے بعد اپنی وفات (۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء) تک بریلی میں مقیم رہے۔ پروفیسر عبدالشکور مرحوم ہمیں بریلی میں ۳ جولائی ۱۹۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک انھوں نے تعلیم بھی بریلی ہی میں پائی۔ اس کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور یہاں سے یکے بعد دیگرے ایم اے انگریزی اور بی ائی کی اسناد حاصل کیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملازمت کا آغاز علی گڑھ ہی سے کیا۔ یہاں وہ انگریزی کے مدرس (ٹیکچرر) مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن سے دعوت ملی اور وہ علی گڑھ چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔ یہاں ۱۹۶۳ء تک ڈربن کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ اس سال واپس وطن آئے، تو بریلی کالج میں جگہ مل گئی، اس کالج میں وہ ۱۹۶۱ء تک رہے اور اسی سال یہاں سے حلیم کالج کے پرنسپل ہو کر کانپور منتقل ہو گئے، جسین اتفاق سے انھیں یہاں ترقی کا موقع میسر آ گیا، اور وہاں کالج راجہ پور کی پرنسپل کی پیشکش ہوئی، چنانچہ انھوں نے کانپور سے رام پور کی راہ لی۔ ان کا ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۵ء تک کا زمانہ راجہ پور ہی

میں گورا، دہلی پور کے زمانہ ملازمت کے بعد وہ چندے بیکار رہا ہے۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں اٹارہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ کالج سرسید کے ایک رفیق کار مولوی بشیر الدین احمد کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں صدر جمہوریہ سندھ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے بھی یہاں تعلیم پائی تھی۔ پروفیسر عبدالشکور نے اپنے زمانہ قیام میں کالج کی ترقی اور تنظیم میں بہت کوشش کی۔ یہاں جواہر سہو زیم کی توسیع میں ان کی سماجی جمیلہ بھی مفید ثابت ہوئی۔ اس عجائب گھر میں کئی بیش قیمت نادر کتب اور خطوط اور خطی نسخے محفوظ ہیں۔ خاصاً وہ خطوط کی فہرست مرتبہ جناب محمد براہ حسین فاروقی ایم اے (علیگ) تذکرہ جواہر زور ہر کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے (اٹارہ ۱۹۵۹ء)۔

اٹارہ میں چار سال رہنے کے بعد وہ ۱۹۵۸ء میں پھر علی گڑھ آئے۔ اب کے وہ ٹریننگ کالج سے وابستہ ہوئے۔ یہیں سے سال بھر بعد وہ مستقل ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد قیام بریلی میں رہا۔

مرحوم نے اپنے سراسر القیام درجن کے زمانے میں وہاں کے سماجی حالات کا غائر مطالعہ کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی پہلانگی کا بڑا سبب یہاں کی عورتوں میں تعلیم کی کمی اور گھر کی چار دیواری میں ان کا مقید رہنا ہے۔ اس سے وہ بھی پردے کے مخالف بن گئے۔ اور ان کا باعث انھیں لڑکیوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بریلی کے بعض دور وندا اور ترقی پسند اصحاب نے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ ان میں خود عبدالشکور صاحب کے والدہ ڈین عبدحلیف صاحبہ بھی تھیں۔ چنانچہ ان اصحاب نے ۱۹۳۴ء میں بریلی میں اسلامیہ گورنمنٹ اسکول قائم کیا۔ اس میں انھیں انہوں اور غیروں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے دھن کے کچے جو صلہ نہیں ملے۔ جب عبدالشکور صاحب وطن واپس آئے تو یہی اسکول کی کمیٹی کے ممبر بن گئے؛ بعد کو منیجر مقرر ہو گئے۔ یہ اسکول بہت کامیاب رہا، اب تو ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا ہے۔

تعلیف و تالیف کا شوق شروع سے تھا۔ انھوں نے متعدد کتابیں شائع کیں۔ آغا خان کاریں
 وفاقِ انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا؛ اول مشہور تاریخی قیود نامہ لکھا دہنرک ابن کے ڈوائے
 ڈالزادس کا مشرقی جہرہ لکھایا گھر کے عنوان سے شائع کیا (علی گڑھ ۱۹۲۸ء)؛ اور اس کے
 بعد شہزادوں پر انڈین پرنسز کوڈس کا ترجمہ۔ ان کے علاوہ روضۃ الرضوان (۱۹۱۵ء)؛ اصغر
 (۱۹۲۵ء)؛ تنقیدی سٹریہ حصہ اول (۱۹۲۶ء)؛ تنقیدی سرمایہ حصہ دوم
 (۱۹۲۷ء)؛ افغانی (دلی ۱۹۲۸ء)؛ حسرت موہانی اور وجدید کے چند منتخب مسند و شعرا (لکھنؤ
 ۱۹۳۳ء) شاہ غلیگین حضرت علی اور ان کا کلام، ان کی تصنیفات میں سے زیادہ مشہور میں حسرت
 موہانی سے ان کے ذہنی گہرے مراسم تھے۔ کاجور کے زمانہ قیام میں وہ اکثر ان کے ہاں آتے
 تھے۔ ان کی کتاب حسرت موہانی کے آخر میں کلام کا انتخاب خود حسرت کا کیا ہوا ہے۔
 انھوں نے سلسلہء مطلوبات اسلامیہ گزشتہ اسکول، بریلی کے عنوان سے کچھ کتابچے بھی شائع
 کیے تھے مثلاً گرام سدھار، ضروری باتیں (مزاحیہ خاکے)؛ یارانِ میکہ (دو حصے) وغیرہ
 اردو نصاب کی کچھ کتابیں بھی مرتب کی تھیں خود اکیلے بھی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی مدد
 میں بھی۔ رسالوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، ان میں طبع واد مضمون بھی ہوتے تھے اور انگریزی
 سے ترجمہ بھی۔ علی گڑھ میگزین میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ آخری مضمون
 فضل الرحمن اسلامیہ کالج، بریلی میگزین کے غالب بنبر (ابست ۱۹۶۶ء۔ ۱۹۷۰ء) جب
 بعنوان غالب کی انسان دوستی چھپا ہے۔ ان کے یہ مضمون ہنوز کتابی صورت میں
 جمع نہیں ہوئے۔

شروع میں صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن آخر آخو میں مختلف امراض کی آماجگاہ بن
 گئے تھے، بلکہ ایک مرتبہ موت سے چند سال قبل حالت بہت خراب ہو گئی، تو مقامی شہن
 ہسپتال میں علاج کے لیے داخل ہونا پڑا۔ جسم ہوتا پے کی طرف مائل تھا، اس پر گھٹنوں اور
 ٹخنوں میں درد رہنے لگا؛ نمازیں رکوع و سجود سے بھی معذور ہو گئے۔ مجبوراً یہ فریضہ بیٹھے

تذکرہ معاصرین

بیٹھے ادا کرتے تھے۔ بہر حال موت کا ایک دن معین ہے، اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بھی درکار ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو سینے کے بائیں حصے میں درد کی شکایت کی اور یکایک جان بحق ہو گئے۔ بریلی ہی میں اپنے آبائی قبرستان واقعہ محلہ بھوڑ (شاہ آباد) میں دفن ہوئے۔ اتنا شہ واپسہ راجہوں -

اولاد جمالی میں چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑی۔ بیٹیاں سب یہاں ہندوستان میں ہیں۔ اور بنیاد پاکستان میں ہے، وہ وہاں کسی بنک میں ملازم ہیں۔

تاج، سید امتیاز علی

میری عمر کے جو لوگ آج سے ۵۰-۵۵ برس پہلے مرے میں پڑھتے ہونگے، ناممکن ہے کہ انھوں نے رکوں کا مفہم دار پرچہ پھول "اور لڑکیوں کا تہذیب نسواں" دیکھے ہوں یا یہ دونوں ہائے دالالا شاعیت، لاہور کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے کرماتہا تھے، مولوی سید محمد علی جو بعد کو شمس العلما کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔

وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے۔ ان کے اجداد وہنگ، ذیب، مالگیر کے عہد میں پنجاب سے ہندوستان آئے۔ آئی خاندان میں سید محمد علی، ۱۸ ستمبر ۱۸۸۶ء کو دیوبند (ضلع بہار، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ذوالفقار علی حکومت میں ملازم تھے۔ محمد علی خود مولوی محمد قاسم نانوتوی کے ابتدائی شاگردوں میں تھے، چنانچہ انھوں نے قرآن، حدیث، فقہ کی تعلیم ان سے اور مولوی محمد یعقوب سے پائی۔ اس کے بعد اپنے طور پر کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور گئے اور کچھ ایسے کہ پھر عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ وہ سرسید کے گھر سے دوست اور رفیق بن گئے۔ ۱۸۹۸ء میں، انھوں نے عورتوں کے لیے مفہم دار پرچہ تہذیب نسواں جاری کیا۔ اس رسالے نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ اسم باسنی

پرچہ ہمارے ملک کی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترقی میں بہت محدود معاون ثابت ہوا۔ یہ اسی کی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے لڑکوں کے لیے کچھ 'پھول' جاری کیا۔ ہمارے بعض بہترین ادیب اور شاعر اسی 'پھول' کی دین ہیں۔ انھوں نے دو دنوں پرچے تقسیم ملک کے بعد بند ہو گئے۔

سید ممتاز علی خود بھی معتقد تھے۔ منجملہ اوروں کے ان کی مرتبہ تفصیل البیان فی مقاصد القرآن (جلد) معرکے کی چیز ہے۔ اس میں قرآن کی مختلف موضوعات کے تحت تبویب کی گئی ہے اور یہ قرآن کے مضامین کا بہت مفید اور آسان اشاریہ ہے ان علمی اور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انھیں شمس الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کا ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کی بیوی محمدی بیگم بھی اردو کی اچھی ادیب تھیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ۲۲ نومبر ۱۹۰۸ء کو شیلے میں انتقال ہوا اور لاہور میں دفن ہوئیں۔

ان کے دو صاحبزادے تھے حمیدہ بیگم چلی بیوی سے، حمید علی اور محمدی بیگم سے امتیاز علی۔ میں امتیاز علی ہماری زبان کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج تھے۔ مولوی ممتاز علی کے کا رہا جس نے بہت برکت دی۔ لاہور میں ان کے بہت سے مکانات تھے، مطبع تھا، کچھ زرعی زمین بھی تھی۔ اس تمام جادو کی دیکھ بھال بڑے بیٹے سید حمید علی کے سپرد تھی، تعلیم یافتہ تو وہ ضرور تھے، لیکن انھیں تصنیف و تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مکانات کا کرایہ اگاہنے اور دارالاشاعت کے تجارتی حساب کتاب میں لگے رہتے تھے۔ اس کے بالکل برعکس سید امتیاز علی تاج کو سوائے علم و ادب کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔ وہ ابتدا ہی سے خاندان کے مالی معاملات سے کم و بیش کنارہ کش رہے۔

سید امتیاز علی ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کینڑ اسکول میں پائی جو اس زمانے میں شہر میں انگریزی ذہن کا ممتاز پبلک اسکول تھا۔ دسویں درجے کی سند سنٹرل

تذکرہ معاصرین

ماڈل اسکول لاہور سے ۱۹۱۵ء میں اور بی اے کی گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۲ء میں حاصل کی۔ بی اے میں انھوں نے فائبرس میں امتیاز (فائزر) پایا۔ مزید تعلیم غیر ضروری خیال کرتے ہوئے، وہ دارالاشاعت کے علمی اور ادبی شعبے کی نگرانی کرنے لگے، وہ تقریباً رُبع صدی تک ”ہندوستان“ اور ”پھول“ کے ایڈیٹر رہے۔

انھیں بچنے کا شوق بہت ابتدائی زمانے سے تھا۔ جب ان کا پہلا مضمون ”دیگر اکبر آبادی کے مشہور رسالے نقاد (مگھ) میں چھپا ہے، تو ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجے میں پڑھتے تھے۔ ان کی پہلی مطبوعہ کتاب موت کا راگ، بھی زمانہ طلبگی کا کارنامہ ہے، یہ بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ماہنامہ ”ہفتک“ کی جاری کیا۔ یہ پرچہ حسن ظاہری و معنوی کا نمونہ تھا اور اردو کے بہترین ادیب اس کے معاونین اور مضمون نگاروں میں شامل تھے۔ تاج کوڈرامے اور تمثیل اور اداکاری سے شغف کالج کے زمانے سے تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامیٹک کلب کے سرگرم رکن اور اداکار تھے۔ ان کا مہر کرار ڈراما، انارکلی ہے اس کا آغاز انھوں نے بی اے پاس کرنے کے بعد کیا تھا۔ جب یہ ڈراما اگلے برس ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوا، تو تاج نے اسے آغا حشر کوسانیہ۔ آغا حشر دہلوی اپریل ۱۹۲۵ء کا ڈرامے کی دنیا میں جو مقام تھا اور ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو ”ٹیکسیر منہ“ لکھا کرتے تھے۔ حشر نے انارکلی کو دیکھا اور سنا تو بہت خوش ہوئے اور کہا (۱) ”مکمل ملاحظہ“،

”میں سمجھتا تھا کہ حشر کے بعد ڈراما ختم ہو جائیگا لیکن اردو ڈرامے کے بہادر کے

دن تو اب آ رہے ہیں۔“

یہ ڈراما مکمل شکل میں پہلی مرتبہ دارالاشاعت کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ ظاہری شکل و صورت میں بھی یہ استاد یہ ہندوستان کے جس نے دیکھا، اس افسانہ کو اٹھا۔ حکومت پنجاب نے اس پر انعام دیا اور یہ کتاب مدتوں بی اے ایم اے اور مشرقی علوم کے امتحانات میں

بطور نصاب شامل رہا نتائج ایک زمانے تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور آزاد دی ملک کے بعد پاکستان ریڈیو کے ڈوگریا بانوں ہی میں تھے۔ دونوں جگہ انھوں نے ڈراما کی قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ انھوں نے اسی شوق کی تسکین میں اردو کے کلاسیکی ڈرامے کی ترتیب بیڑین ہاتھ میں لی۔ ان ڈراموں کی تلاش کے سلسلے میں وہ چند برس جوئے، سہنہ تان بھی آئے تھے۔ جہاں سے بھی انھیں یہ ڈرامے ملے، انھوں نے حاصل کیے۔ اگر ملک نے کتاب لڑکا ناچم الگ کرنا منظور نہ کیا، تو اس کی نقل کر والے اس کے بعد انھوں نے ان ڈراموں کا متن جمع کیا؟ ان پر جوش ملے اور انھیں اپنے تنقیدی تبصرے کے ساتھ شائع کر دیا۔ اردو میں ڈرامے کو کبھی قابلِ اعتبار نہ سمجھا گیا جو ڈراما نگاروں نے بھی اپنی تحقیقات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ڈرامے شائع بھی ہوئے وہ خود مصنف کی تصحیح اور نظر ثانی سے محروم رہے۔ قصہ مطبوعہ ڈرامے عین ناقص اور ان کا متن عین غلط تھا۔ اس لیے جب نتائج نے ان ڈراموں کو سچو معیارِ صحت متن و تنقید کے بعد شائع کرنے کا فیصلہ کیا، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا جان جو حکم کا کام تھا۔ لیکن ان کے مصروفِ اشتغال کی داد دینا چاہیے کہ ان سب مشکلات کا باوجود جہت نہیں ہارے۔ انھوں نے ان ڈراموں کو تیس جلدوں میں تدوین کیا، اور ان میں سے مزید دو ذیل کو ایک ڈراما نویسوں کی تخلیقات سات جلدوں میں شائع کر دیں :

(۱) سبھی میں اردو کا پہلا ڈراما۔ خورشید مسیح اور دودھامے کا تاریخی جائزہ (۲) آہام کے ڈرامے (۳ جلد) (۳) نظریات کے ڈرامے (۴) ارتقے کے ڈرامے (۵ جلد) (۶) حباب کے ڈرامے۔ سات مزید جلدیں مطبع کے لیے تیار تھیں۔ بقیہ جلدوں کا مواد جمع تھا اور ان کے لیے یادداشتیں بھی تھیں۔ انہیں کہ ان کی ناگہانی موت کے باعث یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ ان کی سی نظر اور تجربے کا ادبی کہاں ملے گا کہ اسے پورا کر سکے :

ڈراموں کے علاوہ انھیں افسانہ اور عورتوں اور بچوں کے ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے، خدا جھوٹ نہ بلوائے عورتوں اور بچوں کے لیے کوئی سوچا ہی تو ضرور دیکھی ہوگی جیسا کہ

ادھر ذکر ہوا، ان کی سب سے پہلی کتاب موت کا رنگ، ابھی بچوں کے لیے تھی۔ ان کتابوں کی فکر تعلیم نے بھی قدر کی، ان میں سے شبیر نصاب یا معادن نصاب قرار پائیں۔

افسانے سے دلچسپی کے باعث ہی انھوں نے کہکشاں جاری کیا تھا۔ اس میں وقت کے بہترین افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہو کر تے تھے۔ یہی زمانے میں انھوں نے مشہور انگریزی مزاح نگار جیمز کے ایک خاکے (*Three men in a Boat*) سے عنوان کر کے مشہور افسانہ نیرنگ خیال لاہور کے لیے ایک ہلکا پھلکا مزاحی افسانہ لکھا، بچا چھپکن نے تصویر بنائی۔ اس کے بعد انھوں نے اسی رنگ کے چند طبعزاد خاکے اور بھی لکھے۔ یہ سب بچا چھپکن کے عنوان سے ایک کتاب میں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ہی کتاب (منشکل) صفحات کئی ضخیم کتابوں اور مجموعوں پر بھاری ہے۔ جس طرح سرشار کے سادہ آواز کا کردار خوبی ہمارے ادب میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح تاج صاحب کا کردار بچا چھپکن ہے۔

تیار دہلی تاج نے کئی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے جن میں کسپیر کا ڈول، مینز ٹش، ایم لاڈلٹن کا بیلایا، ناصر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کسی دن نے میں لاڈلٹن کی اس کتاب کا ترجمہ جسٹس محمود دھلف سربید مرحوم نے تہذیب الاخلاق کے لیے شروع کیا تھا۔ لیکن چند قسطوں کے بعد یہ کہہ کر اس سے ہاتھ اٹھا لیا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔

کا ترجمہ پورا کتاب کا ہے۔ انھوں نے سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کی شرکت میں جارج برنارڈشا کا ڈول، آرمینڈ دی میٹھی، ایس ایلیٹنگا *The Man at the Popomack*، کیرل چپیک کی

R. U. R. اور متعدد ایک ایکٹ کے ڈرامے اور میں منتقل کیے اور پھر انہیں کھیلا بھی۔ ان کے علاوہ دیگر جوگ، ایڈ گرائیو، آسکوڈ ایڈ اور کئی اور یورپی اور امریکی مصنفوں کی ہنگامہ رشات کے ترجمے بھی ان کے مجموعہ میں منت ہیں، پوری فہرست کہاں دی جا سکتی ہے!۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ تاج ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے نہ ہزیم کہ بچپن میں ان کی والدہ انھیں پیار سے تاج کہہ کر پکارتی تھیں، جو گویا ابتداء کی تحریف تھی۔ رفتہ رفتہ گھر کے سب لوگ اور پھر ان کے احباب بھی انھیں اسی عرف سے پکارنے لگے، اور بالآخر انھوں نے خود بھی اسے اپنے نام کا جزو بنالیا۔

ان کی بلغم اردو کی مشہور افسانہ نگار حجاب ہیں۔ جو شادی سے پہلے حجاب انھیں کے نام سے لکھتی رہی تھیں۔ اولاد جسمانی میں صرف ایک لڑکی (پاسین) ہوئی۔

وہ پچھلے دس برس سے لاہور کے مشہور ادارے انجمن ترقی ادب کے ڈائریکٹر تھے۔ اس ادارے کی طرف سے اردو کا کلہ کی ادب جس اہتمام اور آبے تاب سے شائع ہوا ہے، اس کے لیے بہت حد تک خود تاج صاحب ذمہ دار تھے۔ حکومت پاکستان نے ان کی گونا گوں علمی خدمات پر تہنیتی خدمات کے صلے میں انھیں ستارہ امتیاز کا تمغہ عطا فرمایا، جو ان کے نام کی مناسبت سے گویا انھیں کے لیے وضع ہوا تھا، اس کے علاوہ اعلیٰ ادبی کارکردگی کا انعام بھی ملا تھا۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی جب میں انٹر کے بعد مزید تعلیم کے سلسلے میں لاہور چلا ہوا ہوں۔ لہذا تھا کہ میں تبدیج جہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہنچتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور چونکہ وہ ان حلقوں کے کُل سرسبد تھے، لہذا ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء دو سال گرامر اسکول میں کرائے کے مکان میں مقیم رہا تھا۔ یہ مکان انھیں کی جادو کا حصہ تھا۔ اسی محلے کی پشت پر دیوے روڈ ہے، جہاں دارالاشاعت کا دفتر اور ان کے خاندان کے کوئٹی مکان تھے۔ اس زمانے میں بھی ان سے ملنا جتنا مل۔ ان سے مل کر دل منتر ہوتی۔ ان میں ہمیشہ علمی وقار اور علم دوستی کی طناری کا جذبہ پایا۔

انھوں نے کہ علم ادب کے اس دیرینہ خادم کا انجام بہت المیہ کن ہوا۔ ۱۸ اپریل کی شب میں دونوں میاں بیوی اپنے مکان کی چھت پر سو رہے تھے کہ دو نقاب پوش شخص آئے اور انھوں نے تاج صاحب پر تھامنا حملہ کر دیا۔ آواز سے بلغم کھینچا گیا، انھیں اور انھوں نے بچ بچاؤ

تذکرہ معاصرین

کی کوشش کی، لیکن بیہودہ دونوں میاں بیوی زخمی ہو گئے۔ تاج صاحب کو بالخصوص بہت
دھم آئے۔ اسی حالت میں انھیں اسپتال پہنچایا گیا۔ علاج معالجے میں کوئی فروگزاشت
نہیں ہوئی، لیکن موت سے کس کو مستکار ہی ہے؟ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے اور
اگلے دن (۱۱ اپریل) صبح کو جان بحق ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

جنازہ کو اٹھا اور انھیں مومن پورہ (سیکھوڑا روڈ) کے قبرستان میں اپنی والدہ محترمہ کی جگہ کے
پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ کلب علی خان قاضی کی کہی ہوئی تاریخ ہے:

کہو باپہ سال رحلتہ "تاج

تاج خلد بریں میں جا پہنچے

۶ + ۱۳۴۳ = ۱۳۹۰

شکیل بدایونی، شکیل احمد

۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تارنخی نام غفار احمد تھا جس سے سنہ ہجری ۱۳۳۴ (۱۳ شوال) برآمد ہوتا ہے۔ ان کے دادا فشی ہدایت اللہ سوختہ محلہ، سروے میں ملازم تھے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ ان کے دیکھنے والے ان کی کدنگی، خوش مزاجی اور دینداری کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کا خاندان سوختہ کہلاتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں کوئی صاحب آگ سے جلے ہوئے تھے، اسی سے یہ نام پڑا۔ اس سے ایک بات یاد آگئی، کانٹوئیس کے لیڈروں میں ایک صاحب منظر علی سوختہ ہوئے ہیں، وہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے دادا فشی مبارک علی سوختہ پنڈت موتی لال ہنردرمی کے محقر تھے اور آئندہ بھون، الہ آباد میں رہتے تھے۔ پنڈت جی ان پر بہت مہربان تھے اور ان کے خاندان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ منظر علی کی تعلیم و تربیت بھی بہت حد تک پنڈت جی کی مرہونِ منت تھی۔

شکیل کے والد موسوی جمیل احمد قادی سوختہ نے مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں تعلیم پائی۔ ان کے دماغ میں بڑی کشش تھی، چنانچہ دور دور سے ایسے دعوتِ بقریب و تفتیش ملتی رہتی تھیں۔ اسی سے ان کے سبھی میں بہت آگ قد و ان ہو گئے۔ اور باآ خود مستقل طور پر نقل مکان کر کے وہاں

تذکرہ معاصرین

چلے گئے۔ یہاں وہ کم و بیش اٹھارہ سال تک خواجہ اہلسنت (خوجہ سنی) مسجد میں پیش امام اور خطیب کے منصب پر کام کرتے رہے۔ یہ ان کی اسی مذہبیت کا نتیجہ تھا کہ ٹیکسل کی ابتدائی تعلیم بھی اردو، فارسی اور عربی تک محدود رہی اور وہ اس سلسلے میں کچھ زمانہ اپنے والد کے پاس بھی میں بھی رہے۔ یہ مراحل طے ہو گئے تو انھیں مشن اسلامیہ ہائی اسکول شیخوہ و ہدایہ میں بھیج دیا گیا یہ اسکول اب حافظہ صدیق اسلامیہ انٹر کالج کہلاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں یہاں سے وہیں واپس کی ٹیکسل کی اور اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۳۹ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی، لیکن مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری اور قیس حسین قادری کی دھنگیری اور داؤد بھائی فضل بھائی ٹرسٹ (بھائی) کے ذیلیف نے یہ مشکل آسان کر دی۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۲ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مرکزی حکومت کے محکمہ سہلائی میں کلرک بھرتی ہو گئے اور وہاں دو تین سال تک رہے۔

ان کا دلی کے قیام کا زمانہ دوسری جنگ عظیم کے متوازی ہے۔ حکومت کو لوگوں میں امن و فضا پیدا کرنے اور انھیں جنگ میں حصہ لینے پر ابھارنے کی خاطر طرح طرح کے پارٹیلینا پڑے تھے۔ انھیں میں ایک سانگ پبلش کا محکمہ تھا۔ اس کے کرتا دھرتا مشہور شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ یہ محکمہ شہر، شہر اور قریہ بقریہ طائفے سمیتا رہتا تھا، جہاں ڈرامے تو ایسا شاعرے لگانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ لوگ جمع ہوتے اور تفریح کے پردے میں انھیں جنگل سامی سے ہمدردی کا سبق سکھایا جاتا۔ اس زمانے میں ٹیکسل نے بھی بہت نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ اس سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔

ٹیکسل اسم بائمی تھے، شکل و صورت اچھی تھی اور آواز بھی دلکش پائی تھی۔ شر خوب پڑھتے تھے اور سننے والے اس کی تعریف کرتے تھے۔ اکثر حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام پڑھتے جو شوق و خروش سے سنایا کرتے تھے۔ یہ ان کے لیے پسندوار کام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

انھیں خود بھی شاعری سے دلچسپی تو بہت دن سے تھی، لیکن اس سے صحیح شغف علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ وہ دور ہے، جب جنگ مراد آبادی مرحوم کاؤٹکلیج رہا تھا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حلقوں میں بہت ہرولعزیز تھے، یہاں اکثر آتے اور جہیزوں مقیم رہتے۔ اسی زمانے میں شکیل ان کے ایک شاگرد مراد آبادی کی وساطت سے جنگ کے زیر اثر آئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے والد کے جنگی دوست مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری سے شہرہ سخن کرتے رہے تھے۔ ضیاء القادری تفصیل بدایوں میں ناظر تھے۔ ان کے تعلقات شکیل کے والد مولوی جیل احمد سے اتنے گہرے اور مخلصانہ تھے کہ عام لوگ انھیں بھائی بھائی خیال کرتے تھے۔ شکیل بھی انھیں چاہی کہہ کر پکارتے تھے۔ ضیاء خود مولوی غلام احمد خان اسیر بدایونی (پروفیسر عربی و فارسی سنت جاسس کالج، آگرہ) کے حقیقی بھائی اور شاگرد تھے۔ دونوں اسوں بھائی بنے نصرت رسول صلیم رکھتے تھے۔ ضیا کی بلا مبالغہ سینکڑوں نعیت میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کی مرقبہ اکمل اللہ چھپ چکی ہے (بدایوں ۱۳۳۲ھ) اس کے دو حصے ہیں۔ دراصل یہ انھوں نے اپنے مرشد مولانا فضل رسول کی سوانحی کے طور پر لکھی تھی اس کے پہلے حصے میں بدایوں کے اہل دل اور اہل علم کا بہت اچھا تذکرہ محفوظ ہو گیا ہے اور دوسرے میں مولانا فضل رسول کے مفصل حالات ہیں۔ ضیا صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ معلوم نہیں ہنوز حیات ہیں یا اپنی منزل آخر کو روانہ ہو گئے، جہاں ہم سب کو ایک ذائقہ دن جانا ہے۔ ادھر دو تین برس سے ان کی کوئی چیز بھی نظر سے نہیں گزری۔ بشرط حیات وہ اس وقت ۹۰ کے پیشے میں ضرور ہونگے۔

ایک تو شکیل کا اپنا خاندان ہی مذہبی خیالات کا اور استاد قادر یہ کا مرید و متفق تھا، اس پر ضیا، القادری کا تلمذ گویا سونے میں سہاگ ہو گیا۔ خود شکیل نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بارک اللہ، فیض تعلیم ضیاء نے لے سکیں!

خود بخود رنگ تفری حار فاد ہو گیا

ایک اور شخص کہتے ہیں :

لفظ غلط آج پر فیض ضیا ہے اے شکیل !

وقت رفتہ شاعر کامل ہوا جا رہا ہوں میں

جنگ کے کسی کو اپنا باقاعدہ شاگرد نہیں بنایا، اگرچہ ان سے کئی اصرار بنے وقتاً فوقتاً استغاثہ ضرور کیا۔ تکمیل بھی اسی گروہ میں شامل تھے جنگ کے اس تعلق سے انھیں یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ جلد اور آسانی اور فی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ اور باہر کے شاعروں میں بھی شریک ہونے لگے۔

فروری ۱۹۴۶ء میں شکیل ایک شاعر کے سلسلے میں پہنچ گئے۔ یہاں اس کی مشہور فلم ساز مسٹر کاہدار سے ملاقات ہوئی۔ وہ شکیل سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان سے اپنی بعض فلموں کے لیے گیت لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ دعوت شکیل کی زندگی کا موثر ثابت ہوئی۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ان کا شاہرہ صرف ساتھ روپے تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے کاہدار کی فرمائش یہ کہہ کر روک دی کہ جب تک ملازمت میں ہوں، میں کوئی پرائیوٹ کام نہیں کر سکتا۔ اس پر کاہدار کا اصرار بڑھا۔ بالآخر انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کاہدار کی چار سو روپے کی پیش کش قبول کر لی۔ خوش قسمتی سے انھیں ایک اور طرف سے بھی کمک ملی۔ مشہور موسیقار ڈاکٹر سید نوشاد علی نے اعلان کر دیا کہ آئندہ وہ صرف شکیل کے لئے گیت لکھیں گے۔ سب سے پہلی فلم ’دودا میں شکیل کے گیتوں اور نوشاد کی موسیقی کی دھوم مچ گئی، جس نے کامیابی اور بڑے ترقی کے تمام دروازے کھول دیے۔ شکیل نے اپنی زندگی میں سو سے زیادہ فلموں کے لیے گیت لکھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دودا اس میدان میں بہت کامیاب رہے۔ انھوں نے اردو (ہندی) کے علاوہ پراچین زبان میں بھی گیت لکھے۔ لکھے کو تو فلموں کے لیے گیت بھی لکھے اور اس گروہ میں چار سے بعض صنفِ اول کے شاعر بھی ہیں۔ لیکن ایک بات کا اعتراف

ضروری ہے کہ بیشتر دوسرے حضرات کی طرح شکیل نے اپنے گیتوں اور غنوں میں اجمہال اور سوویت کا نظا ہر کبھی نہیں کیا، بلکہ زیادہ صیح یہ ہے کہ بہت حد تک ان کے گیتوں میں ادبیت اور مذہبی شاعری کا چاؤ ملتا ہے۔ انھوں نے اس سے بہت روپیہ کمایا۔ بسبئی میں ان کے دور و مکان ذاتی حلیے تھے۔ ادبی دنیا نے بھی ان کی بہت قدر کی۔ ابھی پارساں غالب صدی تقریباً تھ کے زمانے میں گورنر یوپی (شری گوپال ریڈی) نے ان کے وطن بدایوں میں شکیل روڈ کا افتتاح کیا تھا۔ تین چار سال ہوئے، بسبئی اور دق میں خلاصے بڑے چانے پر چٹن شکیل منایا گیا تھا۔ اور اب ایک ادیشن کی بسبئی میں داغ بیل پڑ چکی تھی کہ موت کا بلا آگیا۔

وہ بسبئی کے ممتاز شہری تھے، وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں شاعر کہنے کا بھی شوق تھا، بالعموم یا تو اس کی صداقت کرتے یا افتتاح، غرض عجیب داغ جباً شخصیت تھی۔

شکیل کو بہت دن سے ذیابیطس کی کلیف تھی، یہ مرض انھیں درشے میں ملا تھا، ان کے لپہ مولوی جیل احمد کا بھی ۳ جولائی ۱۹۳۶ء کو بسبئی میں اسی موزی مرض سے انتقال ہوا تھا۔ بہت سی شکیل کو ذیابیطس کے ساتھ دق کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ تب دق عام حالات میں بہت چمک نہیں رہا، لیکن ذیابیطس نے انھیں بہت کمزور کر رکھا تھا جس سے تب دق کا بھی ٹھیک سا علاج نہ ہو سکا، بلکہ آخری ایام میں گلے میں بھی کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی اور بعض لوگوں نے اس پر کینسر کا شبہ کیا ہے۔ غرض پوری دوا دوش کے باوجود حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ۲ اپریل ۱۹۳۷ء صبح کے وقت انھیں خون کی تہ ہوئی، جس پر بسبئی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن وقت معین آگیا تھا، علاج معالجے کی اب کیا گنجائش تھی! اسی دن وہیں اسپتال میں سرپر کو ساڑھے چار بجے انتقال ہو گیا، لاش مکان پر آئی۔ عشا کے بعد جنازہ اٹھا، اور سینکڑوں دوستوں، انداؤں، ہمکاروں اور سوگواروں نے

تذکرہ معاصرین

انہیں عجیوارہ بیچے شب باندہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا، خدا مغفرت کرے۔ کئی دوستوں نے تاریخ دفاتر کہا ہے۔ صاحبزادہ صفی نے عیسوی تاریخ کہا: غلام شاہ صاحب شکیل (۱۹۷۰ء) ہجری میں ۵۲ کے قہر کے ساتھ ہے:

’حیدر کے نام کا جو سہارا زرا ظا

ہے غلام میں قیام خاں شکیل کا

نشیہ ہریت اللہ سوختہ کے دو بیٹے تھے: ایک مولوی جلیل احمد سوختہ یعنی شکیل کے والد بزرگ سے ان سے بڑے نشیہ حضور احمد جن کی بیٹی ریاضہ تولد ہوئی تھیں جس کی دہری کے عقد نکاح میں تھیں (ان کا اوپر ذکر ہوا ہے) انہیں قیصر حسین کی صاحبزادی ’سلما‘ سے شکیل کی شادی ہوئی تھی (۱۹۳۶ء) اپنے پیچھے پانچ بچے: تین لڑکیاں (رضیہ، صفیہ، نجمہ) اور دو لڑکے (جواد، طارق) اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

مروم کے پانچ شہری مجوسے شائع ہو چکے ہیں۔ رعنائیاں (دہلی ۱۹۴۲ء) صنم دھرم دہی (۱۹۴۶ء) رنگینیاں (لاہور ۱۹۴۹ء) اور شبستان (لاہور ۱۹۵۰ء) نقد و فردوس (دہلی ۱۹۴۹ء) نعمتوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی سوانحی بھی مرتب کر لی تھی، جو ہندو چھپی نہیں۔ خدا نہ کرے، اس کا مسودہ کہیں ضائع ہو جائے:

اب چند شعر دیکھئے

حال دل، احوال، غم، شرح، تنہا، عرض، شوق
پارسائی، خندہ زدن، اودھ، خلافت، طعنہ زدن
آگے، خدا ہی جانے، انجام، عشق، کیا ہو
در اس آدمی نہ سمجھاؤ سے شکیل!

دہلی کی ’دھنکڑ منزل‘ کی کہ ۱۷ ہوں میں ہیر دی دل کی

مے دل نے مجھے ’غربت میں‘ شکیل کی یہ کہ کہ کہ
وہ منزل ہے، وہ گریہ رواں معلوم ہوتی ہے
۲۰۴

تذکرہ معاصرین

ہر ایک عنوانِ درد و فرقت ہے اجتر شریحِ تدعا کی

کوئی بتائے کہ یہ فائدہ سنائیں ان کو کہاں سے پہلے

قسم فریبِ نگاہ و دل کی، ہیں تو اس جستجوئے کھویا

وہیں تھی وہ اہل اپنی منزل، قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ادل سے شاید، سکے ہوئے تھے انکیل بقتلِ جینا پیہم

کھلیں جو آنکھیں اس آنجن میں، نظر ملی آسماں سے پہلے

بے تعلق ترے آگے سے گزر جاتا ہے یہ بھی اک حزنِ طلب ہے ترے دیالے کا

جمع احباب و ادب و وفا جمع اخیار ہے ترے بغیر

دھنائی بہار گل و گلستاں کتنی وہ کیا تجھے کو رونقِ بزمِ جہاں گئی

غم ہو کہ ابسا ط، کسی کو نہیں قرار فصلِ بہار آئی، تو فصلِ غم واد گئی

دل بے نیازِ آرزوئے اتفاقات ہے سدا یہ اسی کا نام سکونِ حیات ہے

و اسے حیرت کہ بھری غفلت میں مجھ کو تنہا نظر آتا ہے کوئی

چاہے خود یہ یقینِ کامل حوصلہ کس کا بڑھاتا ہے کوئی

لمحاتِ یاد و دوست کو صرف دھاد کر آتے ہیں زندگی میں یہ عالم کبھی کبھی

قریبِ وفا، وعدہ ہے سلسل بھی پر یہ مشقِ عنایات کیوں ہو

اب صرف حکمِ ہوا تو نظریں ہیں کہیں اور ان باتوں سے جو تپا ہے، محبت کا یقین اور

وہ بھی دل گرفتہ ہیں، اپنی کیا کہوں ناامح! مجھ سے گفتگو کرنا، ان سے گفتگو کر کے

ہزار قیدِ غم واد سے چھٹ کر، بہاد کا آسرا کر بیٹھے

بہار بھی ہم نفسِ زووں کو نہ داس آئی، تو کیا کر بیٹھے

جہاں کی نیرنگیوں سے یحجر بدل گئی آفتاب کی صورت

نفس سمجھتی ہیں جن کو نظریا، وہ درحقیقت نفس نہیں ہے

تذکرہ معاصرین

جمن کی آزادیاں موثر، تصور آشتیاں مقدم
 غم اسیری ہے نامکمل، اگر غم خار و خن نہیں ہے
 نہ کر بھے شرما، تا صبح! میں دل سے مجبور ہوں کہ جبر کا
 ہے یوں آؤں دھماکاں پہ قابو، مگر محبت پہ نہیں ہے

اڑائی و اعطائے چپ کے بہیم، چٹھائی رنڈل نے مل کے بہیم
 یہاں تو یہ سوچتے ہی گزری کہ بادہ نوشی حرام کیوں ہے؟
 نہ ذکر عنوان نہ حرفِ مطلب، بدھ خوشی، اُس طرف تھافل
 تو پھر یہ افسانہ محبت زباں زدِ خاص و عام کیوں ہے؟

دل نے غم سے شکست پائی ہے مہر رفتہ تری دہائی ہے
 میرے بعد نہیں ہیں دیر و حرم احتیاطاً جہیں جھکائی ہے
 وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی ہلے، کس وقت نیند آئی ہے
 گلِ فسرہ! چمن اداس، شکیل! یوں بھی اکثر بہا ر آئی ہے

کلروایاں کی سیاست ہے ناکا و وجہ آدمی کام کا ہوتا، اگر انساں ہوتا
 کھل گیا تجزئے غم سے ہر اک دازبیاں زیت بہیم کھیں، اگر دل نہ پریشاں ہوتا
 تو نے سوچا کبھی دامن کو بچانے والے کچھ سکھاتھ میں ہوتی، تو یہ داماں ہوتا

سچی تشریف آرزو کی قسم! محرم آرزو، نہ تم، نہ ہم
 سوچ افلاسِ زاداں، تو بہ! بکھ نہ جائے کہیں چراغِ حرم
 دل کو نہ ہوگی تاب غم بے تو چھی لڑ، داستانِ محبت نہ پر چھی

تذکرہ حاضرین

یوں دیکھتے ہیں، جیسے ادھر دیکھتے نہیں اس لطف بے طلب کی نزاکت نہ پوچھیے

کیسی بہار، کس کے تارے، کہاں کے پھول
جب تم نہیں، تو دیدہ و دل میں سائے کون
ذوقِ عمل، ذوقِ جنوں، ہر طرف سکون
جنت اگر یہی ہے، تو جنت میں جائے کون!

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگہ کہاں! حسنِ ازل تو عام ہے، حسنِ نظر کہاں!
اے شکیل، ان کی محفل سے جاتے تو ہو اور اگر دل نے پوچھا، کہاں چل دیے؟

منور لکھنوی، نشی بشتور پر شاد

منور صاحب جن کا ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء کی صبح دلی میں انتقال ہو گیا، بشتین شاعر تھے۔ بختور پر
 لکھنوی
 نشی ادوے راج مطلع لکھنوی
 نشی ایشو پر شاد شاعری لکھنوی
 نشی پورن چندا ڈرہ لکھنوی

انشی رام سہائے بشتین لکھنوی (ف ۱۹۳۲)
 نشی اس پر شاد نیاں لکھنوی (ف ۱۹۳۸)
 نشی ڈاکٹر شاد لکھنوی

نشی بشتور پر شاد منور لکھنوی

ہی نہیں، نشی جگد مبار شاد قیصر لکھنوی ان کے ماہوں تھے اور مشہور تاریخ نگار اور شاعر ہی گو
 نشی لکھن پر شاد منور لکھنوی ان کے غسر۔ اگر ان حقائق کے پیش نظر منور کے ہونا:

شاعری سے منور کو جو کیونکر رنجست

پانچ پشتوں سے ہی شوق چلا آتا ہے

تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے مبالغہ کیا، یا غلط لکھا؟

منور سکینہ کا نسل خانہ ان کے فروختے۔ وہ ۸ جولائی ۱۸۹۰ء کو اپنے آبائی مکان محلہ زوبستہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان سے بڑے ایک اور بھائی تھے، بابو رام شنکر پرشاد۔ وہ بھی خاندانی روایات اور ماحول کے زیر اثر صفت اور شوگوئی میں دھسپا لیتے تھے۔ تعلیم کے بعد اودھ اخبار (دکھن) کے شعبہ امداد میں ملازم ہو گئے تھے، اور ایک اپنا مہنت دار اخبار تفریح بھی شائع کرتے تھے۔ برہمنی سے وہ یکایک فروری ۱۹۱۳ء میں پلیگ کا شکار ہو گئے۔ ان کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور تھے اور ایک بہن۔

منور کے والدین بڑے پرگوشا اور ادیب تھے۔ انھوں نے ہماری زبان کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ برہمنی سے انھیں شراب نوشی کی تلامذت تھی۔ اگرچہ ان کی آمدنی ترجہ اور مصافحے سے، اچھے شریفانہ اخراج کے لیے کافی تھی، لیکن جس بلا کے وہ چنے والے تھے یا کے لیے کسی طرح کی انتہا نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا بیارام شنکر پرشاد ان کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوا تھا کہ وہ بھی جو انارنگی کا داغ دے گیا۔ اس حادثے کا منور صاحب کی تعلیم پر بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس وقت یہ آنکھیں درجے کا امتحان دے چکے تھے۔ لیکن اب گھر کی مالی حالت اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ یہ آگے تعلیم جاری رکھ سکے، لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی، ابھی خاندان کے اس رزم شنکر پرشاد کی یہ وقت موت کے صدمے ہی سے ٹھکانے نہیں آئے تھے کہ اس کے ۸۰۰ مہینے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود افاق بھی بعمر ۲۳ سال انتقال کر گئے، جس سے وہ رہا سہا آمدنی کا ذریعہ بھی منقطع ہو گیا

یوں کم عمری میں پورے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری منور صاحب کے کمر و کندھ چھوڑ کر پڑ گئی۔ ان کی عمر اس وقت ۱۵ سال کی تھی۔ بہت بڑا مال بھر دھدا؟ یہ اودھ اخبار کے نام نہ تو اپنے بھائی کی وفات کے بعد ہی مقرر ہو گئے تھے، اب انھوں نے کوشش کر کے دلی کے حبیب کے دفتر میں عارضی ملازمت کرنی (ستمبر ۱۹۱۳ء) شاہراہ ۱۸ ڈی پے مقرر ہوا۔ خوش قسمتی سے خود ان دن بعد یہ ملازمت مستقل ہو گئی۔ اسی ملازمت کے دوران میں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں پرائیویٹ

امتحان دے کر دسویں درجے کی سند حاصل کر لی، اس سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ لیکن غفلت نے ذاتی مطالعے اور محنت سے اپنی استعداد میں بہت اضافہ کیا اور فارسی اور سنسکرت میں بھی اتنی اچھی لیاقت جتیا کر لی کہ بعد کے زمانے میں وہ ان زبانوں کی کتابیں باسانی ترجمہ کرتے رہے۔

منور صاحب عمر بھر دیوے کے اسی ٹکڑے سے وابستہ رہے اور مختلف مقامات دلاہور، بکھنوا، دلی وغیرہ آبادی پر گئے۔ آخری مرتبہ وہ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں دلی آئے اور اس کے بعد یہیں کے ہو رہے۔ یہیں سے جنوری ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے نشین پر سبکدوش ہوئے۔

انھیں شعر و سخن سے لپٹی بہت ابتدائی زمانے میں پیدا ہو گئی تھی اور ہونا بھی چاہیے تھی۔ مگر کمال فضا میں اس کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ شروع میں ان کا کلام اپنے بڑے بھائی کے پرچے تفریح اور ادوم اخبار میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں بھیجنے لگے۔ ان کے چچا منشی رام سہائے متا بھی ایک ماما ز پرچہ دار بار اشائع کرتے تھے؛ اس میں نظم و نثر دونوں ہوتی تھیں۔ منشا صاحب کتابوں کے مشہور ماحولیات گزین اینڈ سنز کے ملازم تھے اور اسی باعث بیشتر دوسے پردتی سے باہر رہتے تھے۔ پرچے کی دیکھ بھال اور ترتیب و تدوین میں ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر گواری سہائے اور منور صاحب کے سپرد تھی۔ نثر کا حصہ ڈاکٹر صاحب دیکھتے اور نظم کا منور صاحب۔ ان کے ایک عزیز دوست شیونرائن جھٹا گودی کے مشہور روزنامہ تیج کے ایڈیٹر تھے۔ منور جب دلی آنے تو ان کے اصرار پر باقاعدگی سے اپنا کلام تیج کو دیتے رہے کئی سال بعد شیونرائن نے تیج کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفتہ وار اخبار سہارا جاری کر دیا اور پھر ۱۹۳۷ء میں ایک روزنامہ بھی وطن کے نام سے چھاپنے لگے۔ منور صاحب کا کلام ان دنوں میں بھی چھپتا رہا، بلکہ کئی سال تک وہ وطن کا فنکا بیہ کالم اکچھڑ کچھ کے عنوان سے بھی لکھتے رہے۔

دلی میں پنڈت امر ناتھ ساحر کی شخصیت ایک ادبی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہر ماہ اپنے زیرِ اہتمام مشاعرہ کرتے تھے جس میں اردو اور فارسی دو مصرعہ طرح دیے جاتے تھے۔ مٹکا شعرا کے علاوہ باہر سے بھی اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ جیب منور دلی آئے تو وہ ان مشاعروں میں جانے لگے۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ اردو میں اگرچہ شروع میں انھوں نے چند سے اپنے والد اور پھر چچا نشی رام بہانے قلم سے مشورہ کیا، لیکن صبح معنوں میں وہ ۱۹۱۵ء سے نشی زبنت داغے نظر آ رہے۔ اپریل ۱۹۲۳ء سے اصلاح فیتے رہے۔ اب فارسی کا شوق ہوا، تو اس میں داس سدھ ناتھ بلی فراتی دریا یاد دی سے مشورہ کرنے لگے۔ منور کا فارسی کلام اطرافِ حجم، تنقید، ایک دیوان کے صحیح ہے، لیکن اس کے چھپنے کی ذمہ دہ نہیں آئی۔ کچھ کلام مندی میں بھی ہے۔ منور کو مندی، سنسکرت، فارسی تینوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی اور اسے انھوں نے اردو ادب کو نوبل ایوارڈ پر ترازو میں لا کر جانچنے کی کوشش کی۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا حریف و ہم نہیں تھا۔ آخر میں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی فہرست دی جا رہی ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس پہلو سے ان کی خدمات کتنی وسیع اور پائیدار ہیں۔

میں انھیں ۱۹۴۷ء سے جانتا تھا۔ چونکہ اس کے بعد میرا کوئی رُخ صدی کا زائد ملک باہر گزرا، جہاں کہیں برسوں کے بعد آنے کا موقع ملتا تھا۔ اس لیے ہمارے تعلقات میں بے تکلفی کا رنگ تو کبھی نہ پیدا ہوا، لیکن دوستانہ مراسم تھے اور ہم ایک دوسرے سے ملاقات میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ ان سے جب کبھی ملنا ہوا، مجھے ان کی شرافت، نفس اور انسان دوستی اور وضع داری نے متاثر کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب رہنے لگی تھی۔ چچکیوں (خناق) کا عارضہ تھا، ذیابیطس کی شکایت بھی ایک زمانے سے تھی جس نے جسم گھلا دیا تھا۔ آخری ایام میں بینائی بھی بہت

مکمل ہو گئی تھی۔ ان سب عوارض کے باوجود یہ گمان تک نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب گیا ہے۔ وہ کہیں دیکھیں کسی مجلس میں نظر آجاتے تھے۔ درحقیقت انھیں کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ بس ۲۲ مئی صبح پانے سات بجے اسی خاوشی سے ۱۹۶۱ء کے مزاج کی افتاد تھی ابدی سفر بردار ہو گئے۔

۱۹۱۸ء میں ان کی شادی منشی لکھن پرشاد صدہر کی صاحبزادی چندرکلا دیوی سے ہوئی تھی۔ انھیں بھی شہرگوئی کا شوقی درختے میں ملا تھا۔ قسرت غفلت کوئی ہیں۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۷ء میں یکے بعد دیگرے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی کوئی ہفتہ بھر کے بعد داغ مفارقت سے گئی۔ دوسری سال بھر کے بعد چل بسی۔ کوئی چار برس ہوئے، انھوں نے اپنے باپ پر نسبتی کے خور و مال پیتے کو گودے لیا تھا، غرض ان کے اٹھ جانے سے علم و ادب کی وہ مسج جلاخج ت سے روشن تھی، اسد کے بے گلی ہو گئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

تصانیف

- (الف) مطبوعہ: (۱) نذرِ ادب (مجموعہ رباعیات) ۱۹۲۹ء؛ (۲) کائناتِ دل (مجموعہ نظم) ۱۹۳۹ء؛ (۳) کائناتِ دل (انتخابِ نظم) ۱۹۵۵ء؛ (۴) نوے کفر (مجموعہ غزلیات) ۱۹۶۱ء؛ (۵) اسے کفر (مجموعہ غزلیات) ۱۹۶۲ء؛ (۶) دو ادھر دو (سوانحوی نشر) ۱۹۶۱ء؛ (ب) غیر مطبوعہ: (۱) سوز و دھن (رقی نظموں کا مجموعہ) (۲) جگرائے نعتِ نعت (نظموں کا مجموعہ) (۳) دیرِ نگاہ (مجموعہ رباعیات) (۴) ساثراتِ بنور (نظموں کا مجموعہ) (۵) چراغِ ذہن (۶) ہنمِ خانہ (۷) جہرِ بنور (غزلوں کے تین مجموعے) (۸) زعفرانِ زاد (مزامیرِ کلام) (۹) شگفتہ عقیدے (۱۰) شعری خاکے (۱۱) خون کے آئینہ (نوحے) (۱۲) دشتِ دیدنا (مندی منظومات) (۱۳) طوافِ عجم (فارسی کلام کا مجموعہ) (۱۴) معروضات (نثری مضامین کا مجموعہ) ۲۔ تراجم:

- (الف) مطبوعہ: (۱) رامین و امیک (نثر) ۱۹۳۵ء؛ (۲) بھگوت گیتا موسومہ نسیمِ عرفان (منظما

(۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۵ء) (۱۹۹۱ء) (۳) کا ترجمہ - منظوم (۱۹۵۳ء) (۴) دھیمہ یا گچہ راء - منظوم (۱۹۵۴ء) (۵) درگا پیت ششی - منظوم (۱۹۵۵ء) (۶) دجانی جافکا - منظوم (۱۹۵۶ء) (۷) گبنیدر کھش - منظوم (۱۹۵۶ء) (۸) دھوت کا ترانہ - منظوم (۱۹۵۶ء) (۹) راء راء کھش ڈراما (۱۹۵۸ء) (۱۰) روحانی مکالمہ - منظوم (۱۹۶۰ء) (۱۱) منگن نے کہا - نثر - (۱۹۶۰ء) (۱۲) ڈٹکے آفتاب - نثر (۱۹۶۱ء) (۱۳) ایلیز روز ویلٹ - نثر (۱۹۶۲ء) (۱۴) ساگر سنگیت - نثر (۱۹۶۲ء) (۱۵) گیتا خلی - نثر (۱۹۶۳ء) (۱۶) شکنتلا - نظم و نثر (۱۹۶۳ء) (۱۷) گیت گودنہ - منظوم (۱۹۶۴ء) (۱۸) سندری جوان اور دوسرے نادرجس افسانے - نثر (۱۹۶۸ء) (۱۹) فاؤسٹ - منظوم (۱۹۶۹ء) (۲۰) آریہ اجدے منظوم (۱۹۶۹ء) (۲۱) سوزاقبال - منظوم (۱۹۷۰ء)

(ب) غیر مطبوعہ: (۱) چادودت (سکرت ڈراما) (۲) صبا سے دوام در با حیات عزیزام) (۳) تبیر منظوم (قرآن کریم کی کچھ سورتوں - کے مطابق منظوم) (۴) گیتا خلی (منظوم) (۵) اذکار بلند دشابیر کے اقوال کا منظوم ترجمہ؛ (۶) الہامات ایرانی (۷) یوگ سار (جین دھرم کے مقدس صحیفے کا منظوم ترجمہ)؛ (۸) الہامات مغرب (انجیل کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ)؛ (۹) نالایکیس (تلسی داس کی بنے پڑ کا نثری ترجمہ) (۱۰) سری روپ کلا (ہمار کے ایک بالکان بھگت کی سوانحوی کا نثری ترجمہ) (۱۱) باوکیا گن متر (کالی داس کے نانگ کا ترجمہ) (۱۲) مائٹی مادھو (بھو بھوتی کے نانگ کا ترجمہ) (۱۳) میری یادداشتیں - نثر (خود نوشت)

(ج) نامکمل تراجم: (۱) رگھونش (کالی داس) منظوم؛ (۲) دام کھٹیا (ارامائی) منظوم - ہر کلام کا انتخاب ملاحظہ ہوا۔

ہر گلاب اس سے اور سو کیا کرم ترا ! بے خوش نصیب جس کو میسر ہے غم ترا !
ہوتا ہے کچھ عجیب بھی عالم ہر جب کا کرتے ہیں ذکر جب بھی متور سے ہم ترا !

دل کا دشمن بنا داغ اپنا	کاشمیں لے اڑیں فراغ اپنا
کیا دکھائیں کسی کو داغ اپنا	کیوں کریں دل کسی کا افسردہ
مرنے کی طرح مرنے، جینے کی طرح جینا	ہے کچھ اگر سلیقہ، ہے کچھ اگر قرینا
دکھائیں جو ارض و سما، دیکھ لینا	بڑا دیکھ لینا، بھلا دیکھ لینا
جہاں اس کی ہوا انتہا، دیکھ لینا	یہ دنیا سلامت، یہ آنکھیں سلامت
یہ ہو جائیگا بے صدا، دیکھ لینا	نہیں بے صدا، گواہی سادہ سستی
سکوں نہ پھر بھی طاعن شیاں بناؤ دیا	بلانے جانِ منادوں ہے برقی دباؤ کا خوف
سفر کے قصد سے ہوتی ہے کب گرد سفر پیدا	گہنگاہی کی نیت کو گہنگاری نہیں کہتے
قاعدے سے گناہ بھی نہ ہوا	ضابطے سے ثواب کیا ہوتا
دشمن کا نباہ بھی نہ ہوا	دوستی کا تو خیر ذکر ہی کیا
دل اس کا اہل نہ تھا، دل کو غم نہ دینا تھا	اب اس سے ضبط کی ناکامیہ سوا شکوہ کیا؟
مرے فنا نہ دل پر یہ کس نے صا کیا؟	یہ مجھ کو دیکھ کے آنکھیں جھپک گئیں کس کی؟
قدم قدم پہ مقامات آئے ہی کیا کیا!	یہ زندگی کا سفر بھی ہے کچھ عجیب سفر
سامنے آپ سے لیکن کبھی آیا نہ گیا	سینکڑوں جلوہ نمائی کے نکالے انداز
دور نہ کھلی ہیں خلد کی ماہیں ہزار آج	دو زبور اکا ہو چو کوئی منتظر، تو ہو
انہیں انہیں، کہیں میری نظر نہیں ملے	ہر ایک رسم کی امت کی اتوری ہیں جتو
میں رکوع میں شال، میں شریک ہجو	نہے نشستِ مصلیٰ نہ گردِ شربِ تسبیح
میری نظر سے ہے پیدا تمام چرخِ بکود	میری نظر سے بچا ہے تمام بسترِ خاک
کھلی ہے میرے لیے ہر طرف رو بہ ہجو	مناقصوں کا بھی حامی ہوں و دشمنوں کا بھی دوست
نہ ہندو ام، نہ مسلمان نہ کافر م نہ ہجو	مرا مال مستور! نہ جانے کیا ہوگا
تاکجا سلسلہ عمر رواں یہ آخر!	تاکجا پاؤں میں زنجیرِ محران یہ آخر!

تاکجا لبیک کم و بیش میں بر باد دی عمر! تاکجا مسئلہ سود و زیاں یہ آخر!
 تاکجا سستی بیبود میں یہ طول اہل! تاکجا خواہش اسباب جہاں یہ آخر!
 تاکجا یہ چین آرائی جذبات جس میں! تاکجا ساز گئی فکر و خیال یہ آخر!
 تاکجا تم کو گوارا یہ، منور! تو ہیں تاکجا بہر طلب خون زبان یہ آخر!
 یہ کہہ رہے تھے فرشتوں سے میکہ سے اٹنے! تاکجا جناب نور ادھر سے گزریے ہیں!
 دنیا کی عشرتیں ہوں کو مجھے کی راحتیں تم پاس ہو اگر، تو مرے پاس کیا نہیں!
 خدا پرست بھی ہیں، کچھ خدا کو از بھی ہیں خدا کے واسطے صورت گروں کو دیکھو تو!
 یہ حرف و شکل کے قائل ہیں کس قدر بیاک خدا سے کھیلے ہیں کافروں کو دیکھو تو!
 لازم ہے کچھ گناہ کی عظمت کا پاس بھی اتنا گناہ کر کے، کوئی منفصل نہ ہو
 ہم نے دریاؤں کو بیتاب ہی دیکھا ہے ہم دل جو پوسر وہ محروم فراغت کیوں ہو!
 اہل! اخیر کیا کوئی مصیبت آنے والی ہے؟ جو ان دنیا سے کھینچا ہوا وہ بھر پھر کیا کیوں ہو!
 مری صبح و اسیبہ شام کیوں ہو؟ مری سہی کو قبلہ اغصام کیوں ہو؟
 شکایت کی حد تک شکایت بجا ہے شکایت میں پہلوئے الزام کیوں ہو؟
 جو ہو صبح حسرت، جو ہو شام حواں مری صبح کیوں ہو، مری شام کیوں ہو؟
 تم سے ممکن ہو گفتگو نہ اگر میرے غم میں زبان ہی کیوں ہو؟
 جس کے سننے سے ہو تمھیں انکا وہ وہ مری داستان ہی کیوں ہو؟
 ان خوش نوائیوں سے منور حصول کیا کچھ غم بھی سخن میں ہو طرہ اول کے ساتھ
 درد کی نعمت سے محرومی نہیں درماں در! کہہ رہے ہیں دوست بیدار ہی غمخوار کی گفتگو
 کیا کہ بیٹھے آئے منور، چارہ گریز علاج ہیں دھانے دھجکتے دل کی بیماری کے ساتھ
 نہ آگ لیں بھرا گئی رہے اگر ہر وقت نہ دوستی کا مزہ ہے، نہ دشمنی کا مزہ

ہے مشرطہ سجدے سے بے نیاز ڈی، دگر نہ معلوم ہر فرادی
جہیں سے دھولے جو ہاتھ اُس کو اجازت بندگی ملیگی

ہے دل کا رونا غضب کا رونا ۱۱ سے چھپانا ہے سخت مشکل

ہزار آنکھیں ہوں خشک پھر بھی پلک پلک میں نئی ملیگی
تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے تخیلات کی جہنا حسین ہے کتنی !
جمال و انشیس کی شانِ رعنائی نہیں جاتی بحرِ جزا گو ہیں جلوے بھر بھی کینا کی نہیں جاتی
بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں دکھتا ہوں یہی بہت ہے کہ منزلِ نظر میں دکھتا ہوں
دراستہ سبیل کے منور ہے مرحلہ نازک خودی کے جوش میں اگر خدا نہ ہو جانا
چاند سورج ہیں یا تار سے ہیں یہ محد و خال سب تھار سے ہیں
ان کی تفسیر کیا کرے کوئی کتنے خاموش یہ اشار سے ہیں
بہرہ و گل نے کر دئیے کر نقش کتنے حسین انہار سے ہیں
دکھ لیا غیرت ناموس جنوں کا پردا نہ بیا باں سے ہٹ کر کبھی گھر تک پہنچے
جو شکل چاہتے تھے منور! نہ بن سکی کچھ دل سے کچھ نگاہ سے بھی کام لے لیا
تسخ ہونے پہ بھی غمِ دل کی دوا ہے تو ہی خواہ مر مر کے ہو جینے کا مزا ہے تو ہی
پڑھ کے افشا نہ دل کیوں چپ ہو؟ کوئی مطلب تو عبادت کرتے
تم کو تردید سے اُٹھن ہوتی ہم جو اظہارِ بخت کرتے
کفر سے دین کی غفلت بڑھتی عشق کو بُجھو عبادت کرتے
اور بھی دل کو اذیت ہوتی تم سے کیا نوکر مصیبت کرتے
تم مخاطب ہوا تو کھولی ہے زباں ہم تو اس کی بھی نہ جرات کرتے
شاعری وحی سے، الہام سے آگے نہ بڑھی اک قدم میں روشِ عام سے آگے نہ بڑھی
کار فرمائی سہارِ تخیل کھیا ہے؟ کوئی تعمیرِ در و بام سے آگے نہ بڑھی

تذکرہ معاصرین

وقت کی رُو تھی بہر حال حڈوں کی پابند
 صرف مرغاب گرفتار پہ ڈھانا تھا ستم
 اک قدم بھی سحر و شام سے آگے نہ بڑھی
 ایکہ بھی رگ بام سے آگے نہ بڑھی
 داستان جب بھی دل بڑا دے اپنی چھتری
 ذکر بے ہری ایام سے آگے نہ بڑھی
 وہ گیا کعبہ دیں اس سے منور! محروم
 دہری حلقہ احصاء سے آگے نہ بڑھی



ضیاء القادری بدایونی، مولوی محمد یعقوب

خدا کی شان میں نے ابھی پچھلے شمارے ہی میں شکیل بدایونی کے حالات میں ضمناً مولانا ضیاء القادری بدایونی کا ذکر کیا تھا، اور دکھا تھا کہ معلوم نہیں، وہ کس حال میں ہیں، اور زندہ بھی ہیں یا اپنے آخری سفر بردوازہ چمکے۔ اس کے چند ہی دن بعد خبر موصول ہوئی کہ ان کا ۱۵ اگست ۱۹۷۷ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ انشاء اللہ آبا الیہ راجعون۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ بلحاظ کمیت ان سے براعت گو، اچھوت و درکنار، اچھی اور زبان میں بھی مشکل ہی سے ہوا ہو گا۔

ان کا نام محمد یعقوب تھا۔ ۲۷ رجب ۱۳۱۵ھ (۲ جون ۱۸۹۳ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ محمد فضل الرحمن "سوانحی نام ان کے خالہ مولانا علی احمد خان اسیر بدایونی نے دکھا تھا اور ذکر "مصیر" ان کے والد نے۔ ان کے والد شیخ یاحسین بدایوں کے مشہور مصلحانہ ان کے نزدیک ان کے بزرگوں میں اکبری دود کے مشہور مولیٰ اللہ شیخ عبداللہ بدایونی کی مہتی قابل ذکر ہے۔ جن کے شاگردوں میں تقی عبدالقادر بدایونی (دف ۱۰۰۲/۵/۱۵۹۱ء) کی سنانورہ روزگار بہن تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جیسا کہ خواجہ نظام الدین نے طبقات اکبری میں لکھا ہے،

شیخ عبد اللہ دراصل سنہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک ن گھٹان کا سبق پڑھ رہے تھے کہ اس میں رسولِ اسلام کا ذکر آگیا۔ استاد سے ان سے متعلق تفصیل پوچھی اور انہوں نے جو مناقب بیان کیے، ان کے سننے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنی ریاضت سے علمِ فضل اور ورع و تقویٰ سے وہ مقام حاصل کیا کہ خلقِ خدا نے ان کی برکریہ کی کا احترام کیا۔

محمد یعقوب کوئی چار سال کے تھے کہ ان کے والد راہگزر گئے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ سوال ۱۳۰۴ھ اس کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے خالہ آسیہ کے زیر سایہ ہوئی۔ اسیر کی جہانی اولاد صرف ایک بیٹی تھی؛ انہوں نے محمد یعقوب کو اپنے بیٹے کی طرح پرورش کیا؛ انہوں نے غالباً فارسی بھی آئیر سے پڑھی تھی۔ پھر دارالمعلوم شمسہ، بدایوں میں باقاعدہ تعلیم پائی۔

۱۸۹۷ء میں اردو نڈل پاس کیا۔ اس کے بعد چپا کے ساتھ رہ گئے اور وہاں چار سال تک محکمہ سرورے میں رہے۔ واپس پر محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ اسی سلسلے میں ترقیوں گتور میں مقیم رہے۔ سبک آخر ۱۹۱۳ء میں بدایوں تحصیل میں بطور جنرل رگر دار اور قانڈوگ تعینات ہو گئے تھے۔ اگرچہ مشاہرہ کچھ زیادہ نہیں تھا؛ لیکن طبیعت قاضی اور سادہ پائی تھی۔ انہوں نے جبر و شکر سے بسر کرتے رہے اور جیسا سے بالآخر ۱۹۲۰ء کو سکندرش بھی ہوئے۔ اسیر نے انہیں ۲۰ سال کی عمر میں حضرت مولانا عبد القادر بدایونی کا مرید کرادیا تھا۔ جب ان کا وصال ہو گیا، تو انہیں کے فرزند رشید مولانا عبد القادر قادری سے خود بیعت کی شعری مشورہ بھی آئیر ہی سے رہا۔ آئیر اور دارا سی دونوں زبانوں میں کہتے تھے اور دعوت پر خاص توجہ تھی۔ ضیاء صاحب نے بھی ان کے متبعین میں عمر بھر نعت نبی یا بھر شخصیت ائمہ و صحابہ کے سو اور کچھ نہیں کہا۔

ہیاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض اصحاب نے آئیر کو غالب کا شاگرد دکھایا ہے؛ یہ ٹھیک نہیں۔ وہ ایچ حسین امجد و کلینڈلار علی مذاق بدایونی کے شاگرد تھے۔ علی احمد خان اسیر کے دادا جنگ باز خان بریلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں اسیر ۱۸۵۲ء تا ۱۳۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور

تذکرہ معاصرین

ابتدائی تعلیم بھی بریلی میں پائی۔ ان کے والد شعیب داری کا کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے کام کے سلسلے میں انھیں کچھ لاگھاٹ پر قیام کرنا پڑا، جو بدایوں سے ۱۰-۱۱ میل دور ایک قصبہ ہے۔ اس دوران میں ان کی بدایوں کی آمدورفت بہت ہو گئی اور بالآخر انھوں نے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ امیر کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی۔ سب سے آخر میں مدرسہ عالیہ دہلوی میں مولانا عبدالحق خیر آبادی (دف ۱۳۶ھ/ ۱۸۹۹ء) سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔ تعلیم کے بعد انھوں نے اولاً ایک صاحب کی شرکت میں بدایوں میں مطبع نسیم سر قائم کیا اور یہاں سے اسی نام کا اخبار بھی نکالنے لگے۔ جب ۱۳۷ھ میں حکمہ تعلیم میں لازمت مل گئی تو مطبع اور اخبار اپنے شریک کار کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔ امیر اپنی لازمت کے لئے زمانے میں بدایوں سے باہر نہیں گئے، اور یہیں سے ۱۹۱۲ء میں نیشن پائی۔ پھر اسی سال آگرے کے سینٹ جوزف کالج میں عربی پڑھانے پر مقرر ہو گئے، یہاں وہ ۱۹۱۵ء تک رہے۔

۱۹۲۷ء میں حج کے لیے گئے۔ انھیں ایک زمانے سے روضہ بنوی کی زیارت کی توفیق چنانچہ حج کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور مدلی مراد پائی۔ آٹھ دن بعد پنجشنبہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء (۱۲۸۷ محرم ۱۳۴۶ھ) کو عین نمازیں اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جناب ضیاء افتاداری ہی نے تاریخ بھی۔

کیسے ضیاء! سال وصال جناب

خاتمہ یا بخیر ہوا بے حجاب

(۱۹۲۷ء)

بہت سا کلام نظم و نثر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اپنی یادگار چھوڑا۔ ان میں ایک کتاب مشہور مرثیہ عبدالعقاد بدایونی کی سوانح عمری بھی تھی۔ ضیاء صاحب کو جب کی ولادت ہونے کے باعث دہلی شریف منانے کا خاص شوق تھا۔ اپنے میلان طبع کی تشکیں کے لیے وہ ہندستان میں

جہاں جہاں بھی اودیا اللہ کے مزار ہیں دہاں عرس کے موقع پر حاضری دیتے رہتے تھے۔ بلکہ اسی دھن میں وہ عراق بھی گئے اور یہاں بھٹ، کاظمین اور کر بلا میں عقبات عالیہ کی زیارت سے شرفیاب ہوئے رنج بھی کیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مستقل طرح اقامت ڈال دی یہاں انھوں نے ایک نمبر ”مجلس شیدائیان نبی“ کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد میلاد النبی، معراج النبی، یوم خلفائے راشدین، یوم شہید کر بلا اور زہراؑ کے عرس کے مرتبے پر جلسے کرنا تھا۔ ان اجتماعوں کے ساتھ فقیر اور شفیق شاعر بھی منعقد کرتے رہتے تھے۔ اس سے لوگوں میں شعور شاعری سے بچی کے علاوہ دینی شغف و شعور بھی پیدا ہوا کر گیا۔ اس ان کے شاگردوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے تلامذہ نے ایک ”زمین“ کی تشکیل کی تھی۔ غالباً کچھ بری مریدی کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔

ان کے فقیر کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نظم و نثر میں ہیں مثلاً ”دیار نبی منظوم“ یعنی سفر نامہ (سج)؛ مرتبہ شہادت (منظوم واقعات کر بلا)؛ جواب خوف اوری (منظوم سفر نامہ عراق)؛ نذر زبانی (منظوم میلاد شریف)؛ راج مضامین (منظوم مناقب اودیا)؛ قادریہ بدایوں؛ ستارہ جنت وغیرہ۔

لیکن میری نظر میں ان کی سب سے اہم تالیف اکمل التوازی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں بدایوں کے مشائی خاندان کے علما اور بزرگوں کے حالات ہیں؛ اس طرح بہت سا مواد جو منتشر حالت میں تھا، یکجا ہو گیا اور مضامین ہونے سے بچ گیا۔ دوسرے حصے میں حضرت مولانا فضل رسول کی مفصل سوانح عمری ہے جو کتاب لکھنے کی علت بنائی تھی۔ ان کی ایک اور کتاب مجموعہ ہفت احمد (بدایوں ۱۹۶۲ء) بھی قابل قدر ہے۔ اس میں بدایوں کے سات اودیا، اللہ

سے لفظ ہے کہ مضامین مشائخ کی درجہ جو کہ اس پر ایک صدی کی دگر بخت بھوک اٹھی۔ چنانچہ تاحی فصیحین (نہ دم ۱۱) کے ۴۵ سے سیرۃ الخیرۃ احوال سید شائع ہوئی (۱۳۳۳ھ)

کا ذکر ہے جن کے نام کا جزاء احمد ہے۔

یادگار جہانی ایک بیٹی اور ایک بیٹا یوسف حسن تو راہم کہے ہیں، یہ پاکستان حکومت میں ملازم ہیں۔ قطعہ تاریخ وفات ان کے شاگرد صابر برادری نے لکھا ہے جس کا آخری شعر ہے:

سال رحلت کو ہے، صابر بہز گنبد کی صدا

والہام اللہ ضیاء القادری جنت بکھاں^(۱۹۹۰ء)

ہجری تاریخ میں بھی انہیں کا مصرع ہے: آہ ولی زمان ضیاء القادری بدایونی (۱۳۹۰ھ)
اسان کی مختلف رنگوں کی نظموں کا نمونہ ملاحظہ ہو:

مناجات

اے خدا، اے مالک کل کائنات	اے کریم و اے رحیم و حق صفات
خالق و قیوم، بتری ذات ہے	روشنی ہر جا تری دن رات ہے
تو نے ہی پیدا کیے ہیں ہر دماہ	تیرے ہی انوار ہیں شام و گھاہ
تو نے ہی پیدا کیے جن و بشر	تو نے ہی پیدا کیے ہیں بحر و بر
تو نے مخلوقات کو پیدا کیا	بنہم موجودات کو پیدا کیا
اور میں تہا آسمان ہے تیرا نور	تیرے جلوؤں کا ہے عالم میں ظہور
تو ہے خلاق مالک اے کریم!	ہے ترانہاں پر احسانِ عظیم
تو نے ہی پیدا کیے لوح و قلم	عرش و کرسی ہیں ترے زبرِ قدم
حور و عیلاں ہیں ترے تسبیح خواں	محرطاعت ہیں ترے سبوحیاں
تو نے آدم کو بنایا خاک سے	روح ڈالی اپنے نور پاک سے
حضرت آدم کو یہ رتبہ دیا	سجدہ ان کو سب فرشتوں نے کیا
منور ابلیس سجدے سے ہوا	راندھا درگاہ نوراً ہو گیا

آدم دتھا کو جنت کی عطا ہو گئے خواہے آدم پھر جدا
 آفران کی ہو گئی تو بہ بنوں
 سلسلہ اولاد کا جاری ہوا
 اُن سے پیدا انبیاء لاکھوں ہوئے
 سب سے آخر رحمتہ طالعائیں
 ملت برحق کا چکا آفتاب
 عرش سے چکا یہ بجے کا سراج
 دور دورہ مسلم و عرفاں کا ہوا
 ملت حق کی ہوئی تقسیم عام
 اے خدا! جب تک رہے قائم جہاں
 دل بالا ملت حق کا رہے
 ہر نہاں پر یترانام آتا رہے
 پرچم اسلام لہراتا رہے
 یترقا طاعت اور عبادت عاک ہو
 کام ہو دنیا کا یتھہ اتام ہو

منیکوں کا ہو خدائی میں راج

ہو فقط تیری حکومت، یتر راج

نعت

ایمنہ کعبہ رب! آپ پر ہزاروں سلام
 حام کرتے ہیں سب آپ پر ہزاروں سلام
 خیمہ حجاز و عرب! آپ پر ہزاروں سلام
 ہوں آپ پر شبہ والا حب! ہزاروں سلام
 سلام آپ پر غنبر و شبہ امری
 سلام آپ پر شاہنشاہ شبہ امری

وہ آئے مجھے سے دم بھر میں جانبِ اقصیٰ بنے امامِ رسل اور پڑھا یہاں خطبہ
سب انبیاء سے طاقات کی یہاں خبر یہاں بلند یہ نعرہ ہوا سلاموں کا

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

یہاں سے لے کے براق آپ کو رواد ہوا ہر حضور پہ رحمت کا شامیانہ ہوا
بساطِ عرش پہ اک جشنِ خسروا نہ ہوا ادا فرشتوں کے لب سے یہی ترانہ ہوا

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

کھلے حضور پہ ساتوں فلک کے دروازے سلام شوق کے ہر آسماں پہ تھے نعرے
ادب سے اہلِ فلک اور رسول ملتے تھے سلام کہتے تھے سبِ رسلین خوش ہو کے

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

حضورِ رواہی مہنت آسماں کیوں گذرے کہ جیسے نور گذر رہا ہے پادشہی سے
ہر اک فلک پہ تھے سامانِ خیر مقدم کے سب انبیاء و گرامی سلام کرتے تھے

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

خدا کا نورِ خدا کے حضور آ پہنچا حبیبِ پیشِ خدا سے حضور آ پہنچا
قریبِ رب، شبِ اُسرئ کا نور آ پہنچا حدِ نظر سے وہ ماہِ پارہ دور آ پہنچا

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ حضورِ شبِ اُسرئ

حجاب اٹھ گئے، وہ بے حجاب حق سے ملے حبیب حق، شہ عالی جناب حق سے ملے
 نقاب دوڑ ہوئی، بے نقاب حق سے ملے ہو اسلام، سب اک خطاب حق سے ملے
 سلام آپ پہ حضورِ شبِ آسریٰ
 سلام آپ پہ شامِ شبِ آسریٰ
 لطافتِ شبِ آسریٰ کا واسطہ یارِ بیا جمالِ نورِ سراپا کا واسطہ یارِ بیا
 وقارِ گنبدِ حضرتِ کا واسطہ یارِ بیا مدینہ، کعبہ و اقصیٰ کا واسطہ یارِ بیا
 سلام آپ پہ حضورِ شبِ آسریٰ
 سلام آپ پہ شامِ شبِ آسریٰ
 حضورِ شاہ میں مقبول ہو سلامِ نیاذ سنو سلام، غلاموں کا اپنے بندہ نوازا
 غلام کچوں شبِ آسریٰ اگر یث آپ کے نان سنو سلام، بھالیں حضورِ تبارِ حجاز
 سلام آپ پہ حضورِ شبِ آسریٰ
 سلام آپ پہ شامِ شبِ آسریٰ

نعت

السلام اے چراغِ عرشِ بریں! فخرِ کن و کلاں، رسولِ اُمیں!
 السلام اے بنائے ارضِ سلا! بحرِ خلقِ آسمان و زمیں
 السلام اے مرادِ قدرتِ حق! بدترنِ پیکرِ جمل و حمیں!
 السلام اے نگارِ محفلِ کون! جانِ ہر علم و روحِ حسنِ یقیں
 السلام اے امامِ بزمِ رسلا! خاتمِ الانبیاء یا تمکین
 السلام اے تجلی و آئینہ! ذوالنہیٰ حیرا عکسِ لوحِ جبین
 السلام اے مہرِ حسرتِ بی! ادا دل تا ابد حقیقتِ دین

اسلام، اے فروغِ بخشِ حیات! تاجِ عرفان و معرفت کے نیگیں
اسلام، اے رفیقِ غمزدگان! تختِ جاؤں کے عمن اور معین

آپ سرِ مایہ ہدایت ہیں آپ ہوائِ لطفِ درخت ہیں
آپ ہیں تاجدارِ مخلوقات آپ نبیاءِ آدمیت ہیں
آپ کے مقتدی تمام رسول آپ سرچشمہٴ رسالت ہیں
آپ پیغمبرِ خلیق و شفیق قاسمِ دولتِ شرافت ہیں
آپ پر ہے مدارِ حسن و جمال عشق کی جاوداں حقیقت ہیں

دور پہ آئے ہیں وارِ غم پانے آپ کے رونے پاک کے شیدا
تلف ہے جن کی داستانِ حیات ہو چکے ہیں الم سے چکنا چور
روزِ آتی ہے مگر دشمنِ ایام جن کو اپنا خیال کرتے تھے
ذخِ خور وہ ہے پیکرِ ہستی خادزاروں میں ہو گئے تبدیلی
موتِ گوشہ میں بن گئے دل کے کفر و باطل کے لاکھ بت خانے

المدد، المدد! رسولِ انام
مٹ نہ جائیں حضور کے یہ غلام

منقبت امیر خسرو

صد دہریہ عرفاں، حضرت امیر خسروؒ
 ولدادۂ نظام و قطب و فرید و خواجہ
 لذت کش وصال پیر مغان و بحر
 تم ہو بہشت مسکن، تم خلد آشاں ہو
 خیر البشر کی امت، خیر البشر کے شیدا
 مہبلے بھری کا اک دہر ہو ادھر بھی
 فیدائے حسن ذات محبوب پاک، یعنی
 کھنڈرِ جہان شعر و ادب، مسلم
 عالم و لی۔ شائع۔ عارف ادیب شاہ
 احسان سلطنت کے مانے ہوئے معلم
 بد و سپہر یاں، حضرت امیر خسروؒ
 قلب حبیب رحمان، حضرت امیر خسروؒ
 مست ثرا ب عرفاں، حضرت امیر خسروؒ
 تم ہو جہاں بہا ماں، حضرت امیر خسروؒ
 قدسی صفات انشاں، حضرت امیر خسروؒ
 اسے پیر بزم و داناں، حضرت امیر خسروؒ
 فشا و حبیبش خوباں، حضرت امیر خسروؒ
 میر صفت سفند اں، حضرت امیر خسروؒ
 سب آپ کے شاخوئل، حضرت امیر خسروؒ
 فطرت شناس شاہاں، حضرت امیر خسروؒ

دھت جگادغ اجڑا، یعنی ضیائے بیکس
 غربت میں ہے پریشاں، حضرت امیر خسروؒ



ہاجی کھنوی، میرزا محمد اقبال

گوشہ ۲۶ اگست کو مشہور مزاج نویس ہاجی کھنوی کا کھنوی میں انتقال ہو گیا، اور یوں ہجری نثرم شعرا و ادب سے ایک بانغ و بہار شخصیت اٹھ گئی۔

حجۃ کا پورا نام میرزا محمد اقبال تھا۔ اسی لیے لوگ عرفیہ عام میں انھیں ایم ایم اقبال بھی کہتے تھے۔ اپنے آبائی مکان محلہ کا طین گیٹ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب اودھ کے شاہی خاندان سے ملتا ہے۔

سلطنتِ اودھ کے تیسرے فرمانروا محمد علی شاہ تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت پر بیٹھے، اور ان کے بعد واجد علی شاہ، جنھیں انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا اور اودھ کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی پر سلطنتِ اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔ رہے نام الٰہ کا۔

محمد علی شاہ کے امجد علی شاہ کے علاوہ بھی متعدد اولادیں تھیں۔ ان میں دو بیٹے میرزا رفیع اللہ شاہ لاہور فرزندِ بخت بھی تھے۔ میرزا فرزندِ بخت کے پوتے میرزا امجدی حسین (ابن میرزا رضا علی) ہاجی کے والد تھے۔ دوسرے شاہزادے میرزا رفیع اللہ کے بیٹے میرزا ابراہیم علی

عیش غفلت کی بیٹی (سلطان جہان بیگم) میرزا ابراہیم علی حسین کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ یہی آپس کی والدہ تھیں، اگرچہ ابراہیم علی عیش ان کے نام تھے۔

ایک شاہی خاندان میں اولاد کی کمزورتی تھی، اس پر ذمہ دار وہ بھی کہ ایسا ہی تھا، غرض شاہزادوں کی تعلیم کی طرف سے بہت غفلت برتی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ اگر کسی کو ادویں شہ بد جو گئی، یا قرآن کا ایک آدھ پارہ ناظرہ پڑھ لیا، تو گویا تعلیم کی معراج حاصل کر لی۔ لڑکوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ انہیں کہیں تو کوری یا کوئی پیشہ تو اختیار کرنا نہیں تھا، اس لیے شاہی خاندان کے بچے عام طور پر جاہل رہتے تھے۔ اس ساجد کے بھائی عیش کو پڑھنے بچنے سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی اور فارسی کی معقول تعلیم حاصل کی۔ خیر، یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے طب پڑھنے پر توجہ کی جب اس کی خبر ان کے والد میرزا رفیع اتشان کو ملی تو وہ بہت غصا ہوئے کہ ہمارا بیٹا ہو کر طب پڑھنا کیا معنی؟ یہ تو ہماری شان و کھیاں کے منافی ہے۔ میرزا ابراہیم علی نے اس کے باوجود چوری چھپے اپنی تعلیم جاری رکھی اور رفتہ رفتہ اسے مکمل کر لیا۔ جب رفیع اتشان کو معلوم ہوا کہ صاحبزادے نے میرے کچے کی پروا نہیں کی اور حکیم بن گیا ہے تو حکم دیا کہ گناج سے ابراہیم علی ہمارے سامنے آئے، ہم اس مرد کو کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے، اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کر کے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے نام کو بیڑہ لگا لیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد عمر بھر باپ بیٹوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور بچے نے صرف ان کی مٹی میں شریک کی۔

لیکن نام بڑا اور دشمن چھوٹے۔ نام کو تو یہ شاہی خاندان تھا، لیکن دانشوں کا یہ حال تھا کہ سب رفیع اتشان کا انتقال ہوا ہے تو ابراہیم علی کو ساٹھ روپے اور کچھ آنے و دینے کے ملے اور تیس روپے کی پوٹلیکیشن باپ کے ترکے میں سے ملی، بڑے کے کل ساٹھ روپے۔ ان کا ذریعہ معاش طبابت کا پیشہ تھا۔ اگر یہ نہیں ہوتا، تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ کیا گذرتی۔

میش اپنے زمانے میں خاصے مشہور ہوئے۔ اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں رحلت کی۔ اچھی لمبی عمر پائی۔ وفات کے وقت ۹۰-۹۵ برس سے کم کے نہیں ہونگے۔

ماچس کے والد سزدا مہدی حسین نے عین جوانی میں ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا۔ محمد و ذوالحجہ معاش کے باعث، فراغت کا وقت کیا ذکر، گزراوقات بھی شکل سے ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے بچوں کی معقول طریقے پر تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ ماچس بھی مدرسے میں نڈل سے اگے نہ بڑھ سکے۔ وہ تلمذ ذابتہ کے اسکول میں پڑھتے رہے جو ان کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ اس کے بعد کچھ انگریزی کی شہد گھر پڑا اور عربی فارسی اپنے نانا میرزا ابراہیم علی میش سے پڑھی لیکن دونوں سے واقفیت اور محوری رہی۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میش کبریا کے باعث ضلع ہو چکے تھے اور زیادہ محنت کے قابل نہیں رہے تھے۔

۱۳۰۱ھ میں کاسن تھا جب ماچس کو شاعری کی چٹنگ لگی، اور اس میں وہ انور حسین آرزو لکھتوی مرحوم (ف ۱۹۵۱ء) کے فارغ الاصلاح شاگرد آئمن صاحب دقار سے مشورہ کرنے لگے جو انیس کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ ابتدا میں اتنا بال تخلص کرتے تھے، اور سنجیدہ غزلیہ کلام کہتے اور مشاعروں میں شائع تھے۔ ۱۹۳۶ء میں دقار کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد آرزو صاحب کلکتے سے وارڈ لکھنؤ ہوئے، تو ماچس ان کی خدمت میں حاضر ہوئے دقار سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا اور ان سے اصلاح کی درخواست کی۔ آرزو نے کلام یا اصلاح دنیا منظور کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جتنے دن لکھنؤ میں ہوں، شوق سے آؤ، لیکن میری عدم موجودگی میں سید اکبر رضا اینڈ وکیت (تلمیذ آرزو) بحال مقیم کراچی) سے مشورہ کر دو کیونکہ خط و کتابت کے ذریعے سے نہ مکمل استفادہ ممکن ہے، و کلام پر اصلاح ہی، نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

سید اکبر رضا سے یہ تعارف ماچس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ان کی وساطت سے یہ نہیں بہادر ارباب لکھنؤ کے رکن بن گئے جس سے ادبی حلقوں سے ان کی شناسائی کا دائرہ وسیع تر

ہو گیا۔ اسی زمانے میں آل رضا صاحب یتیم خانے کے سکتر مقرر ہو گئے، تو انھوں نے آپس کو یتیم خانے کے لیے کمیشن پر چندہ جمع کرنے کا کام سپرد کر دیا۔ جب تک آل رضا سکتر رہے یہ کام ان کے پاس رہا، بلکہ شاید ان کے الگ ہونے کے بعد بھی کوئی سال بھر یہ کام کرتے رہے۔ غالباً ۱۹۴۴ء میں ماچس کا پنور کی مشہور ہارس فیکٹری میں ملازم ہو کر وہاں چلے گئے۔ یہاں کی نوکری دو سال رہی۔ اس کے بعد راشن کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ جب یہ محکمہ تخفیف میں آگیا، تو یہی ۱۹۴۸ء میں سلیس ٹکس کا محکمہ قائم ہوا، اور راشن دہے بشیر ملازمتوں کو اس میں جگہ دی گئی۔ چنانچہ ماچس بھی جون ۱۹۴۸ء میں اس دفتر میں عارضی ملازم ہو گئے۔ مشکل یہ تھی کہ مستقل اس وقت تک ملن نہیں تھی، جب تک ان کے پاس اپنی اس کی کاشفٹ نہ ہو۔ جس (اور ان کے بعض اور ساتھیوں نے بھی) خاص طور پر انگریزی سیکھنے کا انتظام کیا اور بورڈ کے امتحان میں بیٹھے اور یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ یوں ۱۹۵۱ء میں وہ ملازمت میں مستقل ہو گئے۔ وہ کا پنور میں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اس سال والدہ کے اصرار پر بھنڈو تبادلو کر لیا۔ والدہ کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

آر زو اور ان کے تلامذہ کی فنی جہارت مسلمہ ہے اور اس کا سب سے اعتراف کیا ہے۔ دتارادہ آل رضا کے علم و فضل سے ماچس نے بھی استفادہ کیا اور فن عروض و شعر میں خاص و اقصیت ہم ہنجاری تھی۔ لیکن بہت جلد اپنی طبیعت کے امتضا سے وہ اقبال سے ماچس ہو گئے۔ اور مزاحیہ رنگ میں کہنے لگے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ کسی مشاوسہ میں طرح ہوئی، ادلی ناداروں تھے ہوا کیا ہے؟ جب کسی نے یہ مصرع اقبال صاحب کے سامنے پڑھا، تو انھوں نے گہر لگا کر اسے یوں پورا کیا:

دل ناداں اتھے ہوا کیا ہے

حق تک آ کے جھانکتا کیا ہے!

اس پر ان کے برادر بزرگ میرزا محمد عزیز معزز کھنوی نے کہا کہ تم اپنی غزل اسی مزاحیہ رنگ

میں مکتل کرد اور مشاعرے میں پڑھو۔ اس کا میانی پر وہ مستقل مزاجیہ شاعر ہو گئے۔ انہوں نے کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں کیا، غالباً باقاعدہ بیاض بھی نہیں لکھی۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ کہا، از برتقا۔ دوست احباب کی مجلسوں میں گھنٹوں کا کلام سناتے اور کہیں غلطی نہیں کرتے تھے۔ مدتوں ان کی نظمیں اور دھپچ (دورثانی) اور شوکت بخاری کے سرفی میں چسپی رہیں۔ شوکت مرحوم ہمیشہ ان کے نام کے ساتھ ظریف الملک کا خطاب لکھا کرتے تھے۔

انہوں نے بعض مشہور نظموں کی کامیاب پیروٹی لکھی ہے مثلاً ان کی اقبال کے شکوہ کی پیروٹی "شکوہ شکر" معرکے کی چیز ہے، اس میں راشن کے زمانے میں شکر کی قلت کی شکایت کی ہے چاند کا، یثرب و آئین، ہنگامی، خاندانی منصوبہ بندی بھی ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ان کا کچھ سنجیدہ کلام بھی ہے؛ خاص طور پر نو حے اور سلام۔ ان میں وہ بہت مستین رہے ہیں۔ موضوع کی سنجیدگی کے پیش نظر ان میں مزاج بھل بھی ہوتا۔ اس کلام میں تخلص سوختہ کیا ہے۔

ان کے احباب کو فوراً توجہ کرنا چاہیے، منتشر کلام لکھا کر کے چھاپ دیا جائے۔ طنز پر مزاجیہ شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ہماری زندگی کی جو افتادہ ہے اور کشاکش حیات حرفت سے تیز و تند ہوتی جا رہی ہے، اس کے پیش نظر اب کسی اچھے مزاج نگار کے پیدا ہونے کی امید کم ہے۔ اس لیے ریادہ کی خدمت ہوگی کہ جلد ان کا کلام محفوظ ہو جائے۔ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے لیے بڑے سلیقے اور فطری اور جذباتی ضبک کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے اسی کا مار ہاں فقدان ہے۔ اگر شاعر کو اپنے اوپر قابو نہیں ہے، تو اس کا استدال کی طرف مائل ہو جانا لازم ہے۔ باپس مرحوم کے مزاج میں بڑی سنجیدگی اور شگفتگی اور نہجنگی ہے اور ان کا کلام بہت پُر وقار ہے۔ اردو ادب کی یہ نہایت قیمتی ہوگی، اگر یہ ضائع ہو گیا۔

پچھلے جون میں انھیں کینسر چڑ گیا۔ وہ زمین جینے بہت تکلیف میں گزرے۔ آخر وقت موعود

آگیا اور وہ ۷۵ سال کی عمر میں ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء شام آٹھ بجے راجی ملک بٹھا ہوئے۔ انہوں نے شادی بھی بڑی عمر میں ۱۹۶۴ء میں کی تھی اپنے پیسے بری کے علاوہ تین یا کھل خوش سال بچے (دو لڑکے اور ایک لڑکی) جہانی یا نگار چھوٹے۔ اگلے دن کربلائے امین لدولہ (کھٹن) میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے بھتیجے فرخ نواب سنگار کھنوی نے تاریخ کجی ہے:

مصرع بادبج بھری میں یہ لکھ دلائے سگاوا

یسکتہ خلد بری اقبال ماچس کھنوی

نودہ کلام میں سب سے پہلے شکوہ شکر ہی دیجئے، جو اقبال علی شاہ و نظم شکوہ کی پڑوسی کیوں نمک خواہوں، زور فراموشیوں فکر زور نہ کر دوں، غور غم دوشس دیوں گڑ کے طعنے بھی سنوں اور بہ تن گوش دیوں۔ ہنسی میں کوئی مودہ ہوں کہ خاموش دیوں نفع اندوزوں سے الفت کی جلن ہے مجھ کو

شکوہ شکر سے یہ خاکم بدہن ہے مجھ کو

خاص وجہ کے محاسن میں تو مشہور ہیں اب کہ جنتی سے مرتبے سے بھی مجبور ہیں ہم مرتباں کہتے ہیں زیادہ سے مجبور ہیں ہم۔ مالہ آتا ہے اگر بپا تو معذور ہیں ہم

اے شکوہ اگر اب خدا بھی سن لے

تو کما مومن سے ذرا اپنا گلہ بھی سن لے

تجھ سے بیگانہ تھے سلوک بھی تو رانی بھی اہل چیں چین میں ایران میں ایرانی بھی

تھے بڑے خیرہ آفاق تو یونانی بھی ایک سے ایک سپردی بھی تھے انصرانی بھی

کی ہے بل ہیل سے کیتوں پر چڑھائی کس نے؟

ہو کے گلے کو، تری بات بنائی کس نے

تھے ہیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ۱۰۰ پر لاد کے بھیجا تجھے دریاؤں میں

ایک میں ڈھال کے ہتھیار یا کلیوں میں گاڑے جھنڈے ترے ہر شہر میں اور گاؤں میں

کہیں فرست میں ہوتے جو جہانداروں کی
تیرا دم بھرتے یونہی بھاؤں میں تلواروں کی

اب بھی ہے دل میں ہمارے وہی سوز اوڑھی ساڑ
"بندہ صفا میں بکھرے ہو گئے محمود ایاڈ" "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نوا"
"بندہ صاحبہ محتاج وطنی ایک ہے"

آکے دکان پر راشن کی بھی ایک ہوئے

اور وہ دکان سے راشن کی جو ناکام پھرے حسرت واصل میں تنگے ہی یے دام پھرے
بڑی دکانوں پہ لے لے کے ترانام پھرے مضطرب پھر میں تیرے سحر و شام پھرے
چھوٹے چھوٹے بھی دکاندار نہ چھوٹے ہم نے

چوبازا میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

آکے دکانوں پر گھبوں کے مقابل تو نے اک اشارے پہ ہزاروں کے یے دل تو نے
سر پٹول کو کیا عشق کا حاصل تو نے بھونک دی گرجی دیدار سے محفل تو نے
کیا کہا سینے ہمارے مشک آباد نہیں

تیرے بڑوں پر لڑے پڑتے تھے کیا یاد نہیں؟

یاد کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکعت نغمہ کو کو بیٹھے
ہیں جو دکان پر راشن کی ہر اک ٹو بیٹھے تیرے دیوالے ہیں سب منتظر بٹو بیٹھے
گلاب منشی کو پیام رقم افروزی ہے

تو نے دلے کو فرماں نظر سوز کا ہے

صنعت نازک لے کیا فاش جو تھک جھکا راد لے اڑا بلبل بے پروا کو ذائقہ پروا نہ
میزا درگیاں ہیں مرکز صد ناز و نیاز ہونٹوں میں ہے وہ پھرنے کو ترے نام کا سا
چاہے بیتاب ہے، بندل سے نکلنے کے لیے

کھینچی رکھی ہے بھینچ چاہنے کے لیے

شکلیں ہم سے شریفوں کی تو آساں کر دے یہ نہیں کہتے کہ ہمدرد سلیمان کر دے
جنسِ نفرت کو باہمی حال اب اوزاں کر دے بلکہ ہر ذائقہ دشمن کو مسلاں کر دے

پھر بعدِ جدت یاد رہی دیر سینہ ما

ہی رسد در شکم ما ز رہ سینہ ما

میری بلکم بھی جو: بڑ بھی حیلان بھی نہیں جانے اپنی کے نمک کی وہ پریشاں بھی نہیں
بھاد میں جانے شکوہ ہمہ کے گزراں بھی نہیں کینٹی ٹوٹ گئی پیادیاں ویراں بھی نہیں

غم ہے شوہر کو کہ دولت ہوئی برباد اس کی

خوش ہیں بلکم کو سنی کوئی نہ فریاد اس کی

چاک پھر شاہز بیکس کی فنا سے دل ہوں جا گئے والے اسی بانگِ در سے دل ہوں

پُروں بیوی کا تو شوہر کی وفا ٹٹل ل ہوں بدلے غصے کے محبت ہی کے پیار سے دل ہوں

اب جس اس واسطے گلِ شعلہ طرازی ہے مری

لاکھ غصہ ہے پہ بیوی تو خنا زہی ہے مری

مندرجہ ذیل نظم خوار یادہ نیچو کی ایک نظم کی پیروی ہے:

یونانی پتلو گئے، مجھے معلوم نہ تھا (۱) نام سے میرے چڑو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

گھایاں کو سنے دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا یوں مری قدر کر دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

کیا کہوں میں نے محبت کی جہالت کیوں کی (۲) کیا کہوں ہر روز تغافل کی شکایت کیوں کی

کیا کہوں 'عرضِ تنہا کی حماقت کیوں کی یہ سوالات کر دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

بات ہے کل کی، کہ پہنچے ہوئے چھوٹی سی فراک (۳) پونچھ دیتی تھی کھلائی، جو ٹپک پڑتی تھی تاک

کچھ یہ ذیل 'یہ ڈول، اور یہ ٹی پو شاک شل ٹکڑی کے بڑھو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

یاد ہے یاد ہے، بچپن کا وہ عالم کو نہیں؟ (۴) منت نئے کھیل جو کرتے تھے باہم کو نہیں؟

چو کیوں 'تختوں پہ رہتی تھی دھادھم کو نہیں؟ بڑھ کے اس طرح کھلو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

ایک ہی مولوی صاحب سے چڑھا کرتے تھے (۵) ایک سے ایک شرارت میں بڑھا کرتے تھے
 کھینٹنے کو دے کو تھے پر چڑھا کرتے تھے بات بھی اب مذکور ہو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 مگر سے پیسے بھی چرا کر تھیں دے جاتا تھا (۶) بے تمہارے نہ کوئی چیز کبھی کھاتا تھا
 تم جو روتے تھے، تو میں ساتھ میں لو آتا تھا میرے رونے پر منہ ہو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 من اور عشق میں رہتے ہیں ازل سے جھگڑا (۷) ہاں اگر تم سے سیانے کبھی دیکھے نہ سنے
 داغی بھی دیے، ہاتھ بھی کچھ جھاڑ دیے اس طرح جم کے لاؤ گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 جس طرح باپ کا ڈر ہے تھیں بھائی کا خیال (۸) جس سے بے خلق کی انگشت نانی کا خیال
 کاش آجائے دہنی وعدہ و نانی کا خیال عہد سے اپنے پھر و گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 ایسے بھڑکے کہ بالکل ہی بدل جاؤ گئے (۹) آکے آغوش تمنا میں اچھل جاؤ گئے
 اس طرح دام محبت سے نکل جاؤ گئے پھر دوبارہ نہ کھنسنو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 تھی خوشی اس کی کہ تم میرے بنو گئے عمن (۱۰) جید کے ہاتھ سے خود اپنے سیو گئے اکون
 اسی امید پر پھاڑا تھا گویاں، لیکن سوئی تا گا بھی نہ دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 طب پڑھی میں نے کہ تم کو جو شکایت ہوگی (۱۱) میرے ہی زیر علاج آنے کی حاجت ہوگی
 اب جس نے غیر کرے ہاں، یہ ضرورت ہوگی ایسا بیمار پڑو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 مختصر یہ ہے کہ جس کی کوئی امید نہ تھی (۱۲) وہی آنکھوں سے، مقدمے دکھائی پے گھر
 آخری وقت بھی تم جیتے کے بائیں پھری کھیاں بکد جھل گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 تم کہاں ہو یہ میں کیا کرتا ہوں تم سے شکوہ (۱۳) ہاں، مجھ کو تو جوائی نے مٹری کو ڈالا
 یہ خبر ہوئی، تو واللہ میں پہلے مرتا مجھ سے تم پہلے مرو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 داہ پر ملک کے بھی منہ سے اکھڑا جاؤ گئے (۱۴) گوی عشق کے موسم میں اکرا جاؤ گئے
 اس طرح منزلہ انکار پر اڑ جاؤ گئے اک قدم بھی نہ بڑھو گئے، مجھے معلوم نہ تھا
 آخر میں ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مذکرہ معاصرین

شیخ آئے جو خسر میاں کو اعمال ندارد جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد
 ماں باپ بھائی ان کے کبھی ساتھ ہیں کبھی اب گھر میں سرال ہے، سرال ندارد
 معلوم کیا ان کا جو شجرہ، تو یہ پایا کچھ اینجی سی نہیاں ہے، دودھیاں ندارد
 ماچس ہانڈیکس آتش سوزاں سے لگے آگ
 ہوجائے نہ پنڈال کا پنڈال ندارد



سیلمان اریب حیدر آبادی

پہلے سال بھرمی حیدر آبادی ادیبوں پر یہ موت کا تیسرا حملہ ہوا ہے۔ ہنوز محذوم محی الدین اور نور شیدا احمد جہاں کی دائمی مفارقت ہی سے چارے اوسان بجا نہیں ہوئے تھے کہ، شہر کو سیلمان اریب کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

دہیسنے نسبتاً بہت کم عمر پائی۔ ان کا صحیح نام محمد تھا اور وہ سیلمان بن عبدالرزاق کے بیٹے تھے۔ وہ ۵ اپریل ۱۹۳۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد یاغی قبیلے کے عرب تھے۔ بزرگوں میں کوئی صاحبِ حضور سے ہجرت کر کے حیدر آباد آگئے تھے۔ سیلمان بھی بیشتر دوسرے عربوں کی طرح حیدر آباد کی فرج (اسے سی گاؤں میں دس سالہ وار تھے۔ ابھی پانچ چھ برس ہوئے) انتقال کیا۔ اریب کی والدہ اکوڑی ٹھکان خاندان سے تھیں۔

گھر کے حالات تو جیسے تھے، وہ ظاہر ہی ہے، لیکن اریب کو کم عمری ہی میں شرگوئی کا شوق پیدا ہو گیا اور ۱۹۴۲ء سے تو انھوں نے اسے اپنا اوڑھنا بھوننا ہی بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی تعلیم سے بے توجہی برتی اور دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہی سہی سسر سیاست نے پوری کر دی۔ وہ ۱۹۴۸ء میں کیونٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس میں قید و

گیا، تو وہاں کے جلسوں میں انھیں موجود پایا۔ ابھی تین چار مہینے ہوئے، یہیں دکن میں ایک ادبی اجتماع میں پھر ان سے ملاقات ہوئی، وہ آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر کسی سرکاری مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔

اگرچہ علاج میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی، لیکن کینسر سنوڑا علاج ہے۔ حالت دو دو روزہ ناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ بالآخر انھیں حیدرآباد کے کینسر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۱ء کی شام تک وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے اور شب کی دوائی لے کر حسب معمول سو گئے۔ صبح رات کے قریب طبیعت کا ایک خراب موڑ گئی اور تنہوری دیر بعد ساڑھے تین بجے (علی الصباح) جان بحق ہو گئے۔ جنازہ ۷ ستمبر کی شام کو اٹھا اور انھیں خیرت آباد (حیدرآباد) کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اریب نے شروٹ میں غزلیں بھی بہت کچھ لکھا، اس میں افسانے اور ڈرامے تک شامل ہیں ممکن ہے کہ وہ کلاشعر گوئی کے لیے وقف ہو گئے۔ شعریں ان کا صرف ایک مجموعہ ”پاس گریبا“ کے عنوان سے شائع ہو سکا (حیدرآباد ۱۹۶۱ء) حیدرآباد کے شاعر ”کا دو سر حصہ“ بھی انھیں نے مرتب کیا تھا، یہ بھی ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ بہت سا کلام غیر مرتب صورت میں منظر پر آ رہا ہے۔ وہ نظر اور غزل دونوں کہتے تھے۔ حال آنکہ وہ جدید دور کے شاعر تھے اور ان کے خیالات و افکار کبھی روایتی نہیں تھے، لیکن زبان کے معاملے میں وہ بہت سخت و امین پسند تھے، اور اس میں کسی آزاد خیالی اور پیرا ہر دی کے رد اور انہیں تھے۔

پس ماندگان میں ان کا اکلوتا بیٹا حسین اور بیوہ صفیہ اریب ہیں۔ اریب کی پہلی شادی واحد خان سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک لڑکی ہوئی۔ لیکن دونوں ماں بیٹا اسکے بعد دیگرے چل بسے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی والدہ کے احقر کے باوجود سات آٹھ سال تک دوسری شادی نہیں کی۔ اب وہ مشاعروں کے ہر تعزیر شاعر کی حیثیت سے روشناس عالم تھے۔ صفیہ نے انھیں مشاعروں میں دیکھا اور سنا، اور اس کے بعد اپنے والد (جناب محمد نواز)

ایڈوکیٹ کی مخالفت کے باوجود ان سے شادی کر لی، مالی نکلان کی اپنی تعلیم دیم اے
 بج تھی اور ادیب بیا کر کچھ چکا ہوں، انٹرٹس سے زیادہ نہیں تھے۔

عشق ازین بسیار کرده است دکنہ

اباں کے چند شعر دیجیے:

بے دامن و بادیدہ تر زندہ ہوں	آئینہ بکف، خاک بسر زندہ ہوں
بھدند خراب کو دیکھ، اے دنیا!	ہر سانس پہ مرتا ہوں، مگر زندہ ہوں
گزر رہا ہوں سلسل کچھ ایسے عالم سے	حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا
بیزنگی اوقات ابھی باقی ہے	یہہری حالات ابھی باقی ہے
لے ماہ بندہ پھوڑ کے ایسے میں مجھے	میخانے میں کچھ بات ابھی باقی ہے
سوچتا ہوں دنیا کچھ بھڑک رہاں جاؤں	تیری بسے پر اس بن ہر نفس سے آتی ہے
ہر مرحلہ دہر کو آساں کر لوں	مرنے کے لیے جینے کا سا ماں کر لوں
چلتا ہوں، مگر چلنے سے پہلے، اے موت!	پیمانے کے ہر خط کو رگ جاں کر لوں
مٹ گئے جس کے لیے نام تک اس کا دنیا	کاش اس بات کی اس کو کبھی خبر ہو جاتی!
حق تو مریم کی ضرورت پر تری یاد کے ساتھ	ایک فتر سامے دل کے قریب کج بھی ہے
دہیڑ ہوں، وہی دل ہے، وہی حیر، وہی خوا	کو یہ خاک تیر دل کج بھی آتش بدماں ہے
جیسے اکٹھے کو رک جاتی ہے بعض عالم	جب سے پاس سے وہ ہو کے نکل جاتے ہیں
ردناک دامن تو کوئی تمہاں سے لے لے	شیوہ دیدہ خونبار وہی ہے کہ جو تھا
تیری خوشی سے بھدند سکتی اس کا غم نہیں	غم سے ترے بیاہ کی خواہش ضرور ہے
انجام رسم، ماہ اگر چہ ہے سامنے	پر تجھ سے رسم و راہ کی خواہش ضرور ہے
ہیم ناز شیں بھی محبت نہیں، مگر	الطاف گاہ گاہ کی خواہش ضرور ہے
غضب تو یہ ہے کہ تجھ کو کبھی کچھ خبر نہ ہوتی	ہوس کا سلسلہ کب ترے پیار تک پہنچا

حادثہ یہ ہے، پلٹ کر بھی نہ دیکھا تو نے حادثہ یہ نہیں، تو مجھ کو نظر آیا تھا
 دشت پُر ہول کا اندھیرا کیا! عشق میں شام کیا، سویرا کیا!
 زیرِ بھی اپنی نہیں ہے یہ ماز آج کھلا سمجھ رہے تھے بدائے، ہے آساں پنا
 بھیس کیا کیا نہ زمانے میں بنائے ہم نے ایک چہرے چمکی چہرے لگائے ہم نے
 تیرے جلوے بھی پہنچے نہ تیرے جلوے تک فاصلے قرب کے گو لاگو گھٹائے ہم نے
 وہ دن گئے کہ کرتی قیامت بھی انتظار ہم ہاتھ مارے ہوتے، قیامت گزر گئی
 یہ بھی شاید ترانہ ادا ز دل آرائی ہے ہم نے ہر سانس پہ جینے کی سزا پائی ہے
 تو مے چاک گریباں سے تو مجھ باند ہو میں نے کب تیری محبت کی قسم کھائی ہے
 کیا تر حال بھی اے تجھ کو اب ہے بھی مہ ترے پاس ہوں لیکن وہی تہائی ہے
 تمام عمر، میاں، اکون ساتھ دیتا ہے! جلی تھی صبح، ابھی جل رہا ہے پرواز
 پیار کا نذر دکاندہ نہیں ہوتا کوئی کعبہ دیر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی
 پچ تو یہ ہے کہ میں ہر زمیں میں تہا ہی رہا یوں مگر پاس مے کب نہیں ہوتا کوئی
 چاندنی بھول، ہوا اجام، ستائے خوشبو نہ ہر کے نام ہیں جس شب نہیں ہوتا کوئی
 مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دتی دنیا چھپ کے ملتا ہوں بھی، جب نہیں ہوتا کوئی
 نہیں نشہ، نہیں بخود ہی تو ہے مجھ کو اگر شراب نہیں، تشنگی تو ہے مجھ کو
 پرتے ہیں کب سے سر کا ہتھیل پر دکھ کے کم کیا شہر بھر میں اب کوئی قاتل نہیں رہا
 آج بھی ہاتھ پہ ہے تیرے پسینے کی تری یعنی ہے آج بھی شاخ شجر درد ہری
 دل کی بستی سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا اب نہ پتیا مبری ہے نہ کوئی نامہ بری
 ہم نے بھی چھوڑ دیا، مسلک بار باب دفنا وہ بھی اب بھول گئے شیوہ بیدار گری

کراوی خوشبو

ایک شہکار بیباک ہے ہر سو

ان گنت صدیوں سے یہ ہنگامہ
 رہتی رہتی رہا ہے ہر سٹو
 حبس میں
 میں بھی تو بھی
 اس طرح جکڑے ہوئے وسعت و بخت تک آقا بھی ہیں
 جس طرح کڑی کے جانے کے ایسر

پاس سے ہر کے مرے کوئی جوان رہنا
 جب بھی گزرا، اسے مرا بھی چاہا
 اس کو پٹا کے کٹی پیار کر دوں

ہے وہ پیکرِ ناخوردہ صد عشوہ طراز
 جب بھی آیا ہے تصور میں مرے ۔
 میں نے جینے کی تمنا کی ہے

رات چپکے سے مرے کمرے میں
 چاند کی ایک کرن در آئی ۔
 اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا،
 ”آؤ ہم چاند تک ہوا بھی نہ رہا“
 چاند کی بھر سے جب میں لانا
 گھر کی دہلیز پر سورج تھا کھڑا ۔

تذکرہ معاصرین

اُف یہ ہر ساقی، یہ ہنگام گل و گل، یارب!
عام کر دے کہ یہاں کوئی بھی
تشناب دہنے کا شکوہ ذکر ہے
ساقی کو خر سے دہاں

اب بھی ہنگام ہر ساقی ہے ہر گھو
شام سے صبح مگر کیسے جو
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے
ذہر کی ہر ہے، یا موت کی کر دی خوشبو
طرطوطی سے جی جاں سے گزرجاتی ہے
پتھڑن لینے سے کچھ دیر کو غیظ آتی ہے
زندگی

آج یہ معلوم ہوا

کچھ بھی نہیں

چھپکلی بھی نہیں

ہاں، اسکی تختی ڈم ہوگی

فرسٹریشن نمبر دس

ہم نے دو کتے پالے ہیں

ایک کو ماماے آئی تھی

جب وہ اتنا سا پلا تھا

دوسرا کتا بھی بن مانگے اک صاحب نے بھیج دیا تھا

میری بیوی دو دو کہتے (ان کے نہیں ہونے کی وجہ سے)

_____ رکھنے پر تیار نہیں تھی

لیکن میرے بچے کی ضد کی باکا خوبت ہوئی تھی

اب یہ کہتے مانتی توتی گھر کی رکھوائی کرتے ہیں

ساتھ ہمارے ہی رہتے ہیں

ان کتوں سے میری بیوی پہلے بھی نفرت کرتی تھی

اور اب بھی نفرت کرتی ہے

میرا بچہ جو تنہا ہے _____ ان کتوں سے

اب بھی پیار کیا کرتا ہے

گھنٹوں ان کو ساتھ لیے گھومنا کرتا ہے

میرا ان کتوں سے رشتہ، خوبی یا روحانی

کیا ہو سکتا ہے!

کہتے بھی واقف ہیں اس سے

میں کہ نہیں اصحاب کہف سے

لیکن اب یہ حال ہے میرا _____ رونا د

جب تک کتوں کے داتیب کا بندوبست نہیں ہوتا ہے

مجھ کو اپنا کھانا پینا جرم انسانی لگتا ہے

یہی نہیں بلکہ مجھ کو تو اکثر یہ احساس ہوتا ہے

کچھ بھی نہیں اب ذمیت کا مقصد

کتوں کی خاطر جیتا ہوں

حق حویں، توفیق الحق میرٹھی

حویں تخلص، توفیق الحق نام، حق خانہ فی نسبت، وطن میرٹھ۔ حق نسبت خاندان کے نوٹ۔
 اعلیٰ حضرت شیخ عید الحق محدث دہلوی (ف جون ۱۷۴۲ء) کی طرف ہے، جن کا نام اس ملک
 میں حدیث کی ترویج کے سلسلے میں رہتی دنیا تک یاد رہیگا جیسا کہ ظاہر ہے، یہ خاندان دہلی
 والے کا رہنے والا تھا، یہاں سے نقل مکان کر کے لکھنؤ حید الحق حق نے کیا، وہ ۱۹۰۲ء میں سلسلہ ڈوگلا
 میرٹھ چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے، وہ وہاں بکھری میں ملازم تھے۔

جناب حید الحق نے میرٹھ میں ایک بیوہ خاتون سے شادی کر لی تھی۔ حویں تقریباً ۱۹۴۱ء میں
 پیدا ہوئے۔ ابھی یکسن تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، بچپن بہت تنگی ترشی سے بسر ہوا، ان کے
 خیالی بھائی کا خنی نعمان احمد نے جو جی میں پیکار تھے، دیکھ بھال نہ کی ہوتی تو خدا معلوم کیا
 حشر ہوتا، بارے انھوں نے دیکھ کر ہی کی۔ توفیق الحق اور ان کی ڈو بھولی بہنوں کی پرورش
 اور تعلیم و تربیت انھیں کی گوالی میں ہوئی۔ ابتدا میں تعلیم مذہبی علوم، یک محدث دہلی قرآن
 حفظ کیا اور مدرسہ اسلامیہ (گندری بازار)، میرٹھ میں عربی اور فارسی پڑھی، گویا اچھے خاصے
 نیم تان ہو گئے۔ لیکن قدرت کو بہتر منظور تھا۔ مدرسہ اسلامیہ کے زمانہ تعلیم ہی میں انھیں

غزوی معنوی اور دلیان حلقہ نے بہت متاثر کیا اور یہ خود بھی کچھ غوں غاں کرنے لگے ۱۹۴۲ء میں ایک مقامی دفتر میں معمولی ملازمت بھی مل گئی، جس سے سبزدقات کا کچھ سہارا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہی نہیں، بلکہ ذاتی کاوش سے نگارگری میں بھی خاصی استعداد پیدا کر کے فیض حامی انٹر کالج سے دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔

اور رفتہ رفتہ ۱۹۴۷ء میں انگریز یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ شعر میں کسی سے اصلاح و مشورہ کی ضرورت نہیں آتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے، لیکن غالباً یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمت معمولی کلرک کی شرحہ کی تھی۔ ایم اے کی سند سے بھی کچھ مادی منفعت نہ ہوئی۔ اور صفر ۱۹۴۸ء میں (بھری سال) اشادی ہو گئی اور اعلیٰ ذمہ داریاں بڑھنے لگیں۔ چھ تھے تھے (جا) لڑکے اور دو لڑکیاں) یہ گرانی کا زمانہ اور آناکم مشاہیر، پریشان رہنے لگے اور آہستہ آہستہ دلخ کا توازن بگڑنے لگا۔ بات بات پر الجھنا اور زود رنجی ان کا شیوہ ہو گیا۔

بدھ کے دن ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء دوسرے وقت گھر آئے۔ یہاں کوئی خلاف پسند بات پیش آئی، تو بھجولا کر باہر چلے گئے۔ پہلے تو کسی نے خیال نہیں کیا، لیکن جب دیر تک واپس نہیں لوٹے، تو سب کو تشویش ہوئی۔ بہت تلاش کے بعد ان کی لاش جامع مسجد (میرٹھ) کے صحن کے کٹھنوں سے برآمد ہوئی۔

اگلے دن دیکھ اکتوبر کو چشتیہ قبرستان دزد و عید گاہ میں دفن ہوئے۔ ۴۹ برس کی عمر پائی۔ بالعموم غزلی ہی کہتے تھے۔ کوئی مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں کچھ کلام مختلف رسائل سے جمع کر کے دیا جا رہا ہے۔

حلق کا ہو گا یہ چچا، مجھے معلوم نہ تھا تم بھی ہو جاؤ گے رسوا، مجھے معلوم نہ تھا
مجھ سے پھر جا نیکی وہ چشم توجہ بھی احواس! یوں بدل جا نیکی دنیا، مجھے معلوم نہ تھا
ذوق طلب مرا حویں کام کج یہ کر گیا ان کا ہی سانس ہوا، آج تو میں جدھر گیا

آج بھی بہرِ غرض غم میری زباں نہ کھل سکی
 جیسے کہ تیری ذات سے دور کا واسطہ نہ ہو
 لیے لے تیری یاد جو بن گئی جزوِ زندگی
 انگڑیوں میں یہ غم ہے کیوں نہ ہے بڑا لکھا
 عشق ہے، بخود ہی کا نام، خود ہے جو لبتِ تہا
 جب کہ کسی کا انتظار آئے دل کو جب نہ
 غیور، عشق ہے یہی، مان پہندہ ہو زندگی
 اگرچہ کوئی نہیں رہتا ہے کوئے حبیب
 دھڑکنِ حال، تابِ نظر، دھجائے شوق
 اُسی کی اک نگہِ لطف کا کہ جسمیر ہے
 شامِ جاں ہے سطرِ جو ہر نفسِ میرا
 کیوں ابھی سے ہے دل پہ دعبِ جمال
 آپ نے سن لیا، یہ بات ہے اور
 کس سے اب ماجرا ہے دردِ کہیں
 روزِ شب کی اذیتیں، تو بہ!
 دشواری ہے نہ بھگتا نہ کوئی شوقِ سنا
 نظر کو جب تو سے کیفِ نظر رہا بھی لیکن
 ماسِ روا تو مرا حالِ فقیرانہ ہے
 محوِ ان کی یاد میں ہوں مجھ کو اس سے کیا غرض
 کیا بتاؤں کس قدر احساسِ جمہوری ہوا
 بتعلق ان سے ہو کے جانے یہ کیا ہو گیا
 آج بھی اُکے وہ مرے حال سے بے خبر گیا
 یوں بھی کبھی کبھی ترے پاس سے میں گزر گیا
 اُن رے ترا خیال جو دل سے نہ غم بھر گیا
 مجھے بھائے آج اُن کو مرا خیال کیا
 عشق کو اس سے کیا غرض، ہر ہے کیا صاف کیا
 لہو یک نفس بہت، عرصہ ماہ و سال کیا
 جان بھی دی اگر خوشی تو نے کیا کال کیا
 مگر قدم میں اگر خود اٹھ رہے ہیں مجھے حبیب
 نہ جلنے کوں سا عالم ہے رو بروئے حبیب
 کہاں ہم اور کہاں دردِ آرزو ہے حبیب
 بسی ہونے سے مرے پر یہی میں لے حبیب
 پڑاؤ دڑا بھی اُٹھا تو نہیں
 آپ سے ہم نے، کچھ کہا تو نہیں
 اب کوئی دردِ آشتیا تو نہیں
 زندگی ہے، کوئی سزا تو نہیں
 ہیں اسے زندگی، تجھ پر گماں کچھ اور نہیں
 حوزی، بلفحِ حجاب درمیان کچھ اور نہیں
 اس نے دیکھا تو باندا نہ کر یا نہ تجھے
 لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ 'فرزاد' تجھے
 یاد جب آئی تری، بے اختیار اُدھ گئے
 اب تو اک دنیا نظر آتی ہے جگہ اُدھ گئے

ہو گئے دل پر منکشف، تھے جو رموز زندگی
 عشق تمام مگر ہی، حسن تمام سرکش
 حق مسرودہ میں کجا کچھ پانی نہ حق کی گسی
 اپنا ہی سو کر باطنی، اکام نہ جب تک سکا
 گاہ وہ بیرنجی میں بھی ایک اداسہ اتفاقات
 اور بھی جو غمی لہروں، عشق کی بیتیاریاں
 آج تو ان کی یاد کا دل پہ اثر نہ پوچھیے
 کہ آئے جبر عشق کا کتنا عجیب حکم ہے!
 جس کا خیال بھی حویں، نشتر جاں سے گرم
 یوں پر ہر خاشا لگی ہے عشق میں مگر
 ہزار شک ہے کہ ہم نثار عشق ہو گئے
 نظر انکی نہ لب بلبے آکا خزان کی زمہ ہے
 ترے لیے دل جوتی: کہیں مگر سکون نہیں
 یہ کس منزل پہ آخو آگئی وادعت کی اپنی
 بتائیں کیا محبت کا اثر! بس یہ سمجھ لیجئے
 نہ ہے جذب کش دوری بھی اب عین حضور کی
 وہ جب سے واقف غم ہو گیا ہے
 خوشی سے خوش نہ غم سے ہو یہ قلیں
 وہی ہر ایک سے بچا لگی سسی
 ہمراہ اپنے گردشِ شام و سحر تو ہے
 کیسے کہیں کہ عشق کی دولت نہیں رہی

اُتھنے ہی باخبر ہوئے، بڑھ گئی جتنی بخودی
 سارے جہاں سے دشمنی، اُتھ رہے جنوں آگئی
 اُس دُش پر طال کی، بڑھ گئی اور دشمنی
 کم نہ ہوئی کسی طرح دیدہ و دل کی تیرگی
 گاہ وہ انصاف میں، ایک املے سے بیرنجی
 پوچھیے اور حالِ غم، کیجیے اور دل ہی
 آج تو زخمِ کہنہ میں آگئی جیسے تازگی
 دل میں ہو گو ہو ہم غم، دُش پہ رہے شعلگی
 یاد نہ آئے اب سب کا خُش، وہ دور زندگی
 نفسِ نفس ہے دردِ دل کی داستانِ لیے ہوئے
 نہ جانے کتنے رہ گئے، متاعِ جاں لیے ہوئے
 ہم اٹھ گئے خیالِ سہی راہِ گاہ لیے ہوئے
 پھر کیے ہیں ہم تجھے کہاں کہاں لیے ہوئے
 کہ اکثر خود ہی محسوس ہوتا ہے کسی اپنی
 بہت مجبور ہو کر رہ گئی ہے زندگی اپنی
 رسائی سے حویں! کچھ کم نہیں اب ناسی اپنی
 تو پنا خود بخود کم ہو گیا ہے
 عجب کچھ دل کا عالم ہو گیا ہے
 جو ان کا تھا، وہ عالم ہو گیا ہے
 اس زندگی میں کوئی مرا مسفر تو ہے
 دل میں وہی غلش، وہی دردِ جگر تو ہے

دہرے اگلاں نہ ہو، کہیں اُس طبعِ ناز پر
 سر پا درد و غم جب زندگی تھی
 وہ اُن کا مُطقت تھا، یا بر بھی تھی
 بیاہن گنگو ہو تی تھی اُن سے
 جو چ پچھو، تو اس جہل خود سے
 یا نہیں بامِ دور نہ تھیں جن کی خسوفِ انیس
 یوں تو جہاں میں ہے کسے موت پرانی، سن کر
 بتاؤں تم کو کہ رُخِ طلعے پر تجھ سے تم کیا کیا کر دے
 ستارے کا جب غم چلائی، کر گھا کوئی نہ ہنوائی
 ہزار چلنے پر سے دوری رہی، تم نے نا صبر ہی
 یہ کُجھ ظاہر ہے قریبِ وطن کھلیے، تم پر بھی کی اُنکے
 جسے مری ادا سے ویرانی مری دیوانگی تھی
 یاد ہی بامِ دور ہیں، جو تیرہ دنا دہ گئے
 کہ وہ خوش نصیب جوان پر نشا دہ گئے
 کسی کا کیا ذکر خود سے بھی کچھ غمِ خفا سے پا کر دے
 مجھے یقین ہے نہ ہو سیکھا، جو پاس بڑھ چکا کر دے
 مجھے خیال ہے تم اپنے ابتداء کیوں کر جدا کر دے
 مری نظر سے بھی دور، و کمری نظر میں بھرا کر دے

جس کو آسان نہیں بھلا، کر دے تم ضبطِ یہ تو مانا
 جھینٹے دل میں وہ خار ہے کہ جو اشکِ غم تمہا کر دے

بیدل بیکانیری شیخ محمد عبداللہ

شیخ مولابخش کے فرزند ارجمند شیخ محمد عبداللہ جن کا رجسٹرڈ کالج کراچی کے سربراہ اور وہ بنگال میں شمار ہوتا تھا، ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو اپنے مولا سے حقیقی سے جا ملے شاعر تو وہ تھے ہی، اور شاعر بھی بزرگ، یہ، لیکن وہ اس سے بھی زیادہ بحیثیت انسان بہت بلند تھے۔ ان کے تمام لکھے والے ان کی شرافت، نفس، دیانتداری، انسان دوستی، جذبہ خدمتِ خلق کے تباہ و معترن ہیں۔ اگر زبانِ مطلق، نقاد خدا کا مقررہ دست ہے، تو یقین ہے کہ خدا اپنے فضل و کرم سے ان کی مغفرت فرمایا۔

شیخ محمد عبداللہ جنوری ۱۸۸۷ء میں بیکانیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان جبپور اور بیکانیر کی صنعتی روایات کا وارث تھا؛ یہ لوگ مصوٰی اور بھول پتی بنانے کا کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کام کی مانگ میں انحطاط پیدا ہوا اور ان کی اپنی مالی حائرہ بھی سقیم سے سقیم تر ہوتی چلی گئی۔ گھر کا حوالہ سزا سزا نہیں تھا، اس لیے ابتدا میں دینی تعلیم اور عربی نادر کی پڑھائی انہی طور پر ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں (یکم جنوری ۱۹۰۰ء) باقاعدہ تعلیم کے لیے دوبارہ ہائی اسکول (بیکانیر) میں داخلہ لیا۔ ذہن کی بڑا قی کا یہ کرشمہ تھا کہ انہوں نے ۱۹۰۳

دو درجے ایک ایک سال میں پائے کیے اور ۸۰-۱۹۰۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو اسکول بھر میا دل آئے مختلف مضامین میں اول آنے پر انعامات تو مل ہی تھے والی ریاست ہما درجہ گنگا سنگھ نے اپنی طرف سے سونے کا تھو عطا فرمایا۔

گھر کے حالات مزید تعلیم جاری رکھنے کے موافق نہیں تھے اور یہ مجبور تھے کہ کہیں ملازمت کریں۔ ان کے میٹا مشر جناب کرشن سنگھ تیواری نے جوان کی ذہانت اور ہونہاری کے قائل تھے، مشورہ دیا کہ تم یہیں اسکول میں پڑھی کر لیا اور پرائیوٹ طور پر تعلیم بھی جاری رکھو۔ اس پر اپنے اسکول ہی میں پڑھانے پر مقرر ہو گئے اور ساتھ ساتھ امتحانوں کی تیاری کرنے لگے۔ بالآخر ۱۹۰۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند ملی۔ وہ ریاست بیکانیر میں پہلے سلطان گرجوت تھے (بلکہ اس زمانے میں یہاں غیر مسلم گرجو ایسٹ میں صرف دو ہی شخص تھے) ہما درجہ گنگا سنگھ مرحوم تک خبر پہنچی، تو بہت خوش ہوئے اور اس کا عملی اظہار یوں کیا کہ انھیں ریاست کے چیف کورٹ کا جسٹس مقرر کر دیا۔ اسی تھے محنت اور دیانت دار، آقا قدردان ملا، تو انھوں نے اور بھی تندہی اور اخلاص سے اپنے فرائض کو سرانجام کیا جیسا کہ چیف جج ڈاے بہادر نہال سنگھ انھیں اپنا دوست راست سمجھتے تھے۔

ہما درجہ نے ان کی کارگزاری دیکھ کر ۱۹۲۲ء میں انھیں اپنی وزارت کا سکٹر بنا دیا۔ یہاں وہ تقریباً دو سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ جلد جلد ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ اس دوران میں ریاست کا امتحان قانون بھی پاس کر لیا۔ ابھر ذہانت میں مدد و بدل ہوا، تو چونکہ ۱۹۲۲ء میں یہ منصف مقرر ہو گئے۔ ان کے عدل و انصاف اور سہجہ دی کی تعریف میں کہ وہ سب اہل اللسان تھے۔ ترقی کر کے ۱۹۳۳ء میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ زہری ریاست میں صرف تین اخلاص تھے، جو اس زمانے میں ریاست کے عدلیہ میں بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہیں سے ۲۲ سال بعد ۱۹۵۶ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

چونکہ خدا نے فراغت نصیب کی تھی اور درود کی دولت سے نوازا تھا اس لیے خواجہ

کے کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ دو گاہہ نوگزدا پر کا مدرسہ اسلامیہ انھیں کا قائم کردہ ہے ا
بلکاس درگاہ کی عمارت بھی اپنے خرچ پر تعمیر کروائی تھی۔

فارسی کے منتہی تھے۔ اس کے علاوہ اردو انگریزی پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی قلمیت
کے جوہر خاص طور پر ترجمے میں نکلتے تھے۔ دیاست کے متعدد آثار اور مقتضات کے فیصلہ اور

اردو انگریزی ترجمان کی مہارت زبان اور اصطلاحات قانون میں اذیت کے مرحول منت میں یکایک

کے ہستی دفتر خانے کی بعض اہم فارسی دستاویزوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ شاہجہاں علی عہد کی مشہور

ساریجہ بادشاہ ناصر (عبدالحمید لاہوری) کے اس حصے کا ترجمہ جو درجہ تھان سے متعلق ہے انھیں کا قلم سے نکلا۔

ابھی انشکا امتحان بھی نہیں دیا تھا کہ ۱۹۱۵ء میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔۔۔ بیدل تخلص اختیار

کیا اور، داخلہ کے شاگرد رشید منشی وحید الدین احمد بنو، دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) سے اصلاح لینے

لگے۔ درجہ تھان کے رہنے والے تھے، لیکن زبان اسی صاف اور پرستہ و رفعت رکھتے تھے کہ استاد

کو ان پر فخر تھا۔ جن اصحاب نے بنو کو دکھایا ہے یا ان سے بات چیت کی ہے، وہ جانتے ہیں کہ

وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور کسی کا اپنی بلا پر کا شاعر نہیں سمجھتے تھے ان کا یہ طیفہ مشہور ہوگا۔

ایک دن اپنے استاد بھائی ذاب سلوچ الدین احمد خان سائل دہلوی (ف ۱۹۴۵ء) سے جو داغ

کے داغ بھی تھے، باتیں کر رہے تھے، کہنے لگے بھائی سائل! اب دلی میں شاعری کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اے دے کے ایک تم اور ایک میں، دو ہی شخص اس کے نام پر واہ گئے ہیں، ہمارے بعد بس اشد

کا نام ہے۔ اور بھی سچ پوچھو، تو تم بھی کیا ہو!

آخر، بنو نے جو سدا بنے اس شاگرد کی زبان اور بیان اور تخیل سے متعلق دیئے وہ بیدل

کے دیوان باغ فردوس کے شروع میں موجود ہے۔ بنو خود لکھتے ہیں کہ بیدل نے میری زبان پر

ڈاک ڈالا ہے۔ میرے پاس مال دنیا سے اور کچھ تو تھا نہیں، ایک زبان لکھا تھا، وہ حضرت

بیدل کی نذر ہوئی، ان کے مہبت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بھی اپنے استاد کے مداح اور عاشق تھے۔ لکھتے ہیں:

شاعر نہیں ہے حضرت بخود سادہ دہلی میں شہر ہے آج جن کا جہاں میں بجائے داغ
حضرت بخود کا ہر شاگرد ہے ساغر بکفت بخود ہی طاری ہوئی بیدل کا دیوان کچھ کر
دیوان کا نام باغ فردوس تاریخی ہے جس سے ۱۲۵۳ ہجری بموت ہے۔ لیکن یہ اس سے ایک
سال بعد شائع ہوا تھا (لاہور ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء) اس سے مختلف اصناف سخن پر قدرت کا ثبوت
ملتا ہے۔ ایک ایک صفحے سے حب رسول اور ادب سے ہمت سے عقیدت نمایاں ہے۔ عام
غزل کہتے ہوئے بھی اس میں نعت یا منقبت کے شعر کھنکھاتے ہیں۔ سلامتِ طبع اور غزل کی کلاک
کا خاص جوہر ہے۔ باغ فردوس کے علاوہ اور کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ بہت سا کلام
غیر مطبوعہ رہ گیا۔

وفات سے پہلے پانچ چھ دن تک طبرستان سے بیمار رہے۔ اس سے شفایاب تو ہو گئے، لیکن نقائص
بہت بڑھ گئی تھیں، جو کبر سن کا تقاضا تھا۔ اسی حالت میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو فجر کے وقت عالم
حیات الٰہی کا سفر اختیار کیا؛ ۸۷ برس کی عمر پائی۔ جو سرگٹھ (بیکانیر) کے قریب کے پرانے
قبرستان میں دفن ہوئے۔ اولاد میں سات بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ راجہ سید بھاکے رکن خانب
محمد عثمان عارفان کے صاحبزادے ہیں۔ وفات کے وقت مشرق پوتے پر تیاں، نوے لڑایا
اور ان کے بچے ان کے سو گواروں میں تھے۔

مختصر انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

موقع ملا ہے خود مجھے دیواں پہ ناز کا	ب پرے جو نام ہے اس کا دسا زکا
کس منہ سے شکر ہو کے بندہ نواز کا	کیا عشق نے بڑھایا ہے رتبہ ایا کا
پردہ اٹھا دیا کہیں راز و نیاز کا	جلوہ بھی پردہ بن گیا سوسنی کے واسطے
ختم ہے فضول عبرت قلیل و دراز کا	دم تو دبا ہے دم جو تری یاد میں کٹے
جھک پڑے ہم تو جدھر ابرے جانان دیکھا	کوہ دیکھا نہ کہیں قبیلہ ایاں دیکھا
در پر تیرے کوئی بس، کوئی بیجاں دیکھا	تیرا دیکھا نہ ترے تیر کا پرکھاں دیکھا

جان مضطرب ہے، جگر بوخت ہے، آنکھیں پُر نم
منہ پریشان، جمالِ وحصلِ لالی ہم ہیں
فہمِ الفت کا مزہ، اے دلِ نادان دکھا
ایثارِ تیرے بھی کبھی حضرتِ انسان دکھا
دل بھر گیا، وہ جوشِ شمع نہیں رہا
جس کی یہ کاٹیں تھیں وہ کاٹنا نہیں رہا
اٹھ کر ہمارے در سے جو کوئی چلا گیا
دنیا میں کوئی اس کا ٹھکانا نہیں رہا
اک بار اور کہیے، تجھے اختیار ہے
اب میرے دل پر آپ کا دعویٰ نہیں رہا
دل ہے شقائق، کہیں وصل کا ساماں ہوتا
آنکھ جو یا ہے، کہیں جلوۂ حبا ناں ہوتا
مدھوش ہی ہیں واقفِ اسرارِ معرفت
اس میکے میں کام نہیں ہوشیار کا
آرد اشکِ بندہ مست نے بڑھادی بیری
دُرجِ کچھ ہرے سوا دیدہ گویاں نکلا
اچھا کبھی ہوتا نہیں بے سارِ محبت
خاکِ لطفِ زندگی ہے جب تمامٹ گئی
اللہ کسی کو دے آدابِ محبت
دلِ بیابانِ افشا کر دے رازِ محبت کو
کچھ بچے گا آپ بیدل، ترکِ الفت دیکھ کر
تھکے عشق نے دونوں جہان سے کھویا
نظر رکھتا ہوں اپنے دل پر بھی میں بدگمان
اور زمانہ مخالف اُدھر خدا سے بگاڑ
اور اب کہاں ہیں، تنہا وہ اب کہاں
تھے وصل کے مزے تو دلِ نا صبور تک
شکرِ نگہزنِ شرم نے جسے دیے قدم
مڑنے کے دیکھتے رہے مجھ کو وہ دور تک
دلِ مضطرب تو الزام ہے رسوائی کا
کچھ تھیں اپنی نظر پر بھی قطرے کہ نہیں
دلِ مدبیدہ کو دنا تھا متقیں، اے بیدل
وہ دیکھا ہے، جو کچھ دکھایا خدا نے
بے پاب آہ و فغاںِ شام و سحر ہے کو نہیں
ابھی دیکھیں، کیا اور ہم دیکھتے ہیں
دل سے چکا جب اس بتِ بیدار کو کس
بیکار ہے جو روکوں دھلکے اثر کو میں
وئی ہی بزمِ جن کی عاشق کے دم سے ہے
اپنی خود کے لیے پیدا کیا مجھے
جب تک دکاہِ دل سے ہو، اس میں ڈر کہاں
وہ آٹھ کیلے، جس میں تری جستجو ہو
وہ دل ہی کیا ہے، جس میں تری آرزو ہو

یہ دمِ حسنِ دالفت کچھ سمجھ جاس نہیں آتی

جو ہے بیگانہ بھستے ہے اکائی کی آرزو مجد کو

بیدل: بتوں سے دل کے بچانے کا حوصلہ ہم بھی سلام کر لیں گے اچھا، جناب کو
دیرِ دوام میں شیخِ ذہرِ بہن لڑا یہ تھے فتنہ گری ہے سادی یہ تیرے حجاب کی
عجب دیدِ تماشا ہے کہ نظروں میں بیاں سب ہو

دمِ نظارہ حیرت سے ہمیں آنکھیں نہاں رہی

دل لگی سمجھے نئے، بیدل: ہم کسی کی چاہ کو . پھیر یہ تو جان کا آزار ہو کر رہ گئی

مصطفیٰ زیدی (تیغ الہ آبادی)

الہ آباد میں ایک خاصے معروف شیعہ خاندان کے فرسید نخت حسین سی آئی ڈی انسپکٹر ہوئے ہیں۔ ان کا نام ہماری جنگ آزادی میں یادگار دیپیکا۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں تاریخی مقدمہ بغاوت علی ہادیان، مولانا حسین احمد فی، جلالت گرو، دشکوار چاریہ (سوامی کرشن تیرتھ) پر غلام مجتہد و مندی، ڈاکٹر سیف الدین کپلواو، مولانا ثناء اللہ کاپوری پر کراچی میں چلا تھا۔ اس کی فروری میں یہ تھی کہ ان حضرات نے آل انڈیا خلافت کانفرنس، کراچی دہ تا ۱۰ جولائی ۱۹۴۱ء) میں اپنی تقریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو فوج کی ملازمت سے الگ رہنے کی ترغیب دی تھی۔ اس مقدمے میں مولانا محمد علی کی تقریروں کی جو اردو نسخہ رپورٹ عدالت میں پیش ہوئی تھی وہ انہیں سید نخت حسین صاحب نے سرکار میں بھیجی تھی۔ وہ خود بھی پہلے ہی دن عدالت میں بطور رگواہ استغاثہ پیش ہوئے تھے اس مقدمے کے علاوہ ان کی فتح پر مولانا محمد علی کے خلاف کچھ اور مقدمے بھی دائر ہوئے تھے، ان سب میں بھی سرکاری رپورٹ سید نخت حسین ہی تھے، مولانا محمد علی کی بذلہ سنی مشہور ہے۔ ان کا نام سننے پر ان کی رنگِ طرافت پھر رنگ بھی۔ انھوں نے نخت حسین صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ شعر فی البدیہہ اسی دن کہا تھا۔

محمدؐ کا دشمن، علیؑ کا عدو

نہ کہ اپنے کو تختِ حسین تو

تیدِ تختِ حسین شاعر نہیں تھے، لیکن اس کے جواب میں انھوں نے کہا:

علیؑ اور محمدؐ سے کیا تجھ کو کام

تو کہ اپنے گاندھی کی محبت تمام

اس کے سولے ان کا اور ایک مصرع بھی نہیں ملتا۔ ان کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔

میدِ تختِ حسین نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے پانچ بیٹے ہوئے: احمد رضا، حمید رضا،

امیر رضا، حابد رضا اور ناصر رضا؛ اور دوسری بیوی سے عین، عقیس حسین، مصطفیٰ حسین

اور انصافی سلیم۔ یہی مصطفیٰ حسین ہمارے شاعر مصطفیٰ زیدی (سابق چیخ الہ آبادی)

ہیں، جن کا انتقال افسوس ناک حالات میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء پر کی شب کراچی میں ہوا۔

میدِ مصطفیٰ حسین۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں مقامی مائڈرن اسکول سے دسویں درجے کی سند لی۔ شعر گوئی کا شوق اسکول کے

زمانے ہی میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تیغِ تخلص اختیار کیا اور تیغِ الہ آبادی کے نام سے شہور

ہوئے۔ بہت ذہین اور اپنی عمر کی برہنیت کہیں زیادہ غنہ و فکر کے عادی تھے۔ میں نے

ان کے بعض احباب کے پاس ان کی ۱۸-۱۹ برس کی عمر کے کچھ خطوط دیکھے ہیں؛ ان سے

ان کی مختلف مسائلِ جہات سے متعلق آراء کے نیچے پن اور جدت اور بڑی حد تک نچلی پر

واقعی حیرت ہوتی ہے۔ وہ جوشِ لہجِ آبادی سے بہت متاثر تھے اور فراق کے دوستوں اور

ہمنشینوں میں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ”ذخیرِیں“ کے عنوان سے ۱۹۷۱ء میں مینی اسکول جھوک

کے ایک سال بعد الہ آباد سے شائع ہوا، جب کہ وہ محض ۱۶-۱۷ برس کے تھے۔ یہ قطعات

پرستش ہے اور اس کے شروع میں فراق کا طویل مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے اس ذخیر

ادیب کی بجد تعریف کی ہے۔ اس میں ذہان شاعر کی تصویر مجھ ہے، اس کے نیچے پر شعر ہے:

قد فراتین کا اے دختر گلگ و جمن

تینے جو اس وقت ہے پینیر شعر و سخن

۱۹۴۸ میں وہ ایک ادبی مہمہ رسالے کرن کے ایڈیٹر بن گئے، حال آنکہ کالجی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ میں انھوں نے ایوانگ کو پچیس کالج سے انٹر اور ۱۹۵۰ میں لکناؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔

۱۹۵۱ میں وہ پاکستان چلے گئے جہاں ان کے دونوں حقیقی بھائی پہلے سے مقیم تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں ہندستان میں ایم اے (انگریزی) کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا تھا، اب دوسرے سال لائسنسری کنگورنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں آیا اور کامیابی کے بعد چنڈیہ اسلام آباد کالج کراچی اور شاہ ولی خواجہ کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ میں پاکستان کول کرس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے اور منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مختلف اضلاع میں اعلیٰ حدوں پر تھکن رہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہندستان دہلی کالج کی فوجی چیف کس کے بعد وہ لاہور میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تھے۔

دو برائیوں میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ اور اسکا زمانے میں اپنی نمایاں خدمات کے لیے متعدد کاہر اعظم کے اعزاز سے نوازے ہوئے۔ لیکن صد ایوب کے زوال اور دستبرداری کے بعد ان کے متعدد دوسرے دوستوں کی طرح یہ بھی مستحب ہوئے اور ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ یہ اسی سال ۱۹۷۷ء کے شروع کی بات ہے۔

مصطفیٰ بڑے صحتمند اور وجہ شکیں آدمی تھے۔ ان کی ظاہر علی کے زمانے کے سبب بعض برائی افسانے سننے میں آئے ہیں۔ بالآخر انھوں نے ہم اکٹو ہارکیم جرن خاتون (ویراٹان ہل) سے سبائیکوٹ میں شادی کر لی۔ ان سے دو بچے (بیٹا: مجتبیٰ، دلاوت ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء اور

۵۷ ان کی وفات کے سال بھر بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو حکومت پاکستان نے ان کی اعزازی تدفین واپس لے لیا۔

یعنی، صحت مولادت جنوری ۱۹۶۰ء میں جب ملازمت الگ ہو گئے، تو اپریل ۱۹۷۰ء میں انھوں نے بیوی بچوں کو برلن بھیج دیا۔ وہ خود بھی وہاں جیل کے لیے پرتی رہے تھے کہ جب تک رضا صاف نہیں ہو جاتی، انہیں ملک کے باہر سکون سے دن گزاریں۔ اسی سلسلے میں تھوڑے دن سے ایک دوست کے ہاں کراچی میں مقیم تھے، جہاں پر اس طرح حالات میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء صبح ان کی لاش ملی، ہوزیہ فیملی نہیں ہو سکا کہ انھوں نے خودکشی کی یا قتل کیے گئے، ہندوستان میں برسات پر انھوں نے ۱۹۵۵ء میں پہلا تخلص تیغ ترک کر دیا اور اس کی جگہ مصطفیٰ لکھنے لگے تھے، اب تیغ اور آبادی کی بجائے ان کی مصطفیٰ زیدی کے نام سے شہرت تھی۔ زنجیر ب (۱۹۴۴ء) کے بعد انھوں نے اپنی زندگی میں چار اور مجبورے شائع کیے، روشنی (تھیں) (۱۹۴۹ء)؛ شہزاد (کراچی جنوری ۱۹۵۹ء)؛ موج میری صدف صدف (دسمبر اپریل ۱۹۶۰ء)؛ قبا سبز (دسمبر ۱۹۶۷ء)؛ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا دور جدید کے مقبول شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ ابھی حوری کی انتہی، مشکل سے ۴۰ سال پورے کیے تھے، کوئی دن اور جیانت، تو ترقی کے بہت امکانات تھے، لیکن وقت مقررہ کو کوئی ٹال سکتا ہے، نوہ کلام ملاحظہ ہو!۔

کربلا

کربلا! میں تو گنہگار ہوں، لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تو کی فرزند کی
بسم کے روح سے، احساس سے اعاری کیوں ہیں؟
ان کی مساجد ہیں، ان کے شکستہ تیمور
گردش صحن شب درود پہ بھاری کیوں ہیں؟
تیری قبروں کے بجاد، اوتے منبر کے خطیب
فلس وہ نیاز و توجہ کے بھکاری کیوں ہیں؟

۱۔ مہر مہر کو جہاں کے عنوان سے پہلی برسی پر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

دوہڑے شاہ شہیدان پر اک انور عظیم
بل ایر اور کرسٹر کے نئے ماڈل کو
اسی خاموش عقیدت سے سکا کرتا ہے
جس کو کہ دوں، تو کئی لوگ برائے مانگے
غیر تو ہر عزیمت کون و مکان تک پہنچے
کر بلا تیرے یہ غمنوار کہاں تک پہنچے
دل کو تہذیبِ تمنا میں خدا ملتا ہے
سوڑنا تو سہ و نظارہ میں خدا ملتا ہے
بترے دیوانوں کو اسے شاہِ دریا سے فرت
اپنی بیگانگی ذہن میں کیا ملتا ہے؟

لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دُسر بھی	کس کام کی یہ اپنی وسیع انظری بھی
کس طرح خود اپنے کو یقین آئے کہ اس سے	ہم خاک نشینوں کی ملاقات رہی ہے
کسی تو کام زمانے کے سوچو اور آئے	مجھے جو پائے سکے از سبت کو سوار کئے
یہ اور بات کہ ساقی سے قرضِ دل نہ سکی	حضورِ حضرتِ پیراں تو باوقار کئے
آخر تمام عمر کی وسعت سمجھائی	اک لمحہ گزشتہ کی چھوٹی سی بات میں
انہی پتھروں پر چل کر اگر آسکو، تو آؤ	مے گھر کے راستے میں کہیں کہیں جاسیے
پونٹوں کے انتسابِ بیا آنکھوں کے باہم ہی	سر چھوٹنے کو ایک نہیں، سو مقام ہیں
تھے تو ایک دل کی کلی بھی نہ کھل سکی	یہ بھی بلا کشانِ محبت کے کام ہیں
وہ کیا کرے جھٹیری بدولت نہ منہں سکا	اور جس پر اتفاق سے آنسو حرام ہیں
شعور کا تو خدا بھی ایسا بت بھی پامیاں	مفلح کے صرف تین علیہ السلام ہیں

میرے انکا دس اک پر تو الہام بھی ہے	ماقدروادیدہ درد! کفر کا الزام نہ دو
ابہقان انگلیوں میں خوشی ہے یا پیغم بھی ہے	عشق بخوددار! پیچند جنوں چھوڑ بھی دے
رقص کرتی ہے شعلگی میری	برف کے خم اور اس سینے پر
سکراتی ہے زندگی میری	موت کا رنگ چھیر کر لے تیغ!
ہر غم دوراں کو ٹھیس نیند میں لاتی ہوئی	تھکیاں دیتی ہوئی، سہتی ہوئی، گاتی ہوئی
میرے ان الجھے ہوئے بالوں کو سلجھاتی ہوئی	دھڑ گزریں یہ کس کی انگلیاں، اے عشقیں!
آپنے دیدار کے عوض اس نے	حسن خود میں کی عشوہ کاری دیکھ
دے کے پہلا دیا کھلو توں سے	ساند و بریط، صراحی و ساغر
کہ ہر نشاط پر غم کی نگاہ ہے ساقی!	مرد و لغو وئے ساد و جام، رہنے دے
یہاں تو آہ بھی کرنا گناہ ہے ساقی!	یہ بزم وہ ہے، جہاں بے صدا ہے سازِ حیا
صیدِ ہوس اندک و بسیار نہیں	میں عشقِ مکمل کا ہوں پردہ، اے دوست!
میں اور کسی شے کا طلب گار نہیں	بس جامِ شراب، اور ان کا دیدار

اسرار احمد آزاد

اسرار احمد آزاد صاحب مایہ نوا انسان (ضلع بہار، خپور) کے رہنے والے تھے، جہاں وہ اگست یا ستمبر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نور احمد صاحب چوڑے کا کاروبار کرتے تھے، ان کا منی ۱۹۲۰ء دیرہ دون میں انتقال ہوا۔ آزاد صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم سلائی اسکول بہار، خپور میں پائی تھی۔ چونکہ گھر کے مالی حالات زیادہ سادہ سادہ نہیں تھے، اس لیے وہ تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لیکن تھے بلا کے محنتی اور ذہین۔ اس لیے ذاتی جدوجہد سے اتنی اچھی استعداد پیدا کر لی کہ مشکل سے مشکل انگریزی عبارت کا ترجمہ آسانی سے کر لیتے تھے۔

آزاد صاحب کی تازہ خیال کرنال میں تھی۔ یہ تلاش بھاشا میں وہاں گئے، تو ان کی دسالت سے پاکستان کے سابق وزیر اعظم صاحبزادہ لیاقت علی خان اپنی اکتوبر ۱۹۴۷ء کے بچوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ جہاں یہ تین برس رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ لیاقت علی خان مرحوم انھیں کے صلاح و مشورے کے نتیجے میں سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ آزاد خود مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھے، اور نظر پائی کھانا سے کانگریس کے بانیں باتوں سے متفق تھے، بعد کے کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی شامل رہے۔

گزناں کے زمانہ قیام ہی میں انھوں نے ایک پرچہ 'العزم' شروع کیا تھا، لیکن تین سال بعد مالی مشکلات کے باعث اسے بند کرنا پڑا۔

گزناں سے واپس آئے تو سہارنپور میں ایک بینک میں ملازمت کر لی۔ لیکن اس میں ان کا دل نہیں لگا۔ چنانچہ وہاں سے واپس چلے آئے۔ یہاں انھیں مختلف اخباروں میں ترجمے کا کام مل گیا۔ ریڈیو نے بھی کچھ سرپرستی کی۔ اس کے بعد مولوی حنظلہ الرحمن مرحوم کی سفارش پر روزنامہ 'امیت' کے سنڈے ایڈیشن کی ترتیب ان کے سپرد ہوئی۔ کوئی تین برس تک وہ اس جگہ کام کرتے رہے (۱۹۴۷ء - ۱۹۵۰ء)۔ اس کے بعد 'ایمان'، 'برہان' اور 'دین و دنیا' میں کام کرنے لگے۔ ان کے لیے وہ اجرت بہتر تھے اور طبع آزمائی میں رکھتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک نیا ذاتی پرچہ 'جدوجہد' کے نام سے بھی نکالا تھا، لیکن یہ بھی تین چار سال بعد مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے 'کونٹ پوائنٹ' کے پرچے 'عوامی دور' (پیپلز ایج) کا (اردو حصہ) کے ادارہ 'تحریریں' میں بھی شاید دو برس تک (۱۹۵۸ء - ۱۹۵۹ء) کام کیا۔

بین الاقوامی سیاسیات اور تعلقات پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ چنانچہ انھوں نے کئی برس ان کے لیے جدید سیاسی معلومات کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب علی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ اردو میں اس کو عیبت کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی، لہذا انھوں نے انھیں نکل گئی۔ حالات بھی تیزی سے بدل رہے تھے، اس لیے انھیں اس کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑا۔ انھوں نے اسے 'ادسیر' جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات کے نام سے مرتب کیا اور یہ تین حصوں میں شائع ہوا (۱۹۵۶ء - ۱۹۵۸ء) کئی برسوں نے ان کی ایک اور کتاب 'مارشل ٹیوٹ اور جمہوریہ یوگوسلاویہ' بھی شائع کی تھی (۱۹۶۶ء) ان کی ایک کتاب 'کشمیر اور اس سے متعلق مندرجہ ذیل موضوعات کی وضاحت میں' 'مسئلہ کشمیر' کے عنوان سے بھی چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ 'دنیا کی مسلم حکومتیں'، 'سرخ چین کے بھنا'، 'ریڈیٹار اور چائنا کا ترجمہ' بھی ان کی تصانیف ہیں۔ انھوں نے بے بسی کچھ کتابیں بھی

تھیں مثلاً گاندھی جی اور نیتاجی سہاسش بوس کی سرانصریاں مسات تمارے، پچھوٹا دودھوٹی، سرخ پکے وغیرہ۔

سیاسیات کے بعد ان کی دلچسپی کا دو سرا موضوع اسلامیات تھا۔ وہ دل کے قدیم مابناے دین دنیا میں نہایت باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان کی ایک کتاب سیرۂ صحابہ جھپ چکی ہے، یہ ان کی وصعت مطالعہ اور نکتہ آفرینی پر دال ہے۔

۱۹۶۵ء میں وہ کشمیر حکومت کے پرچے چنار کے درجہ پر چکر چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین برس کے قیام کے بعد ۱۹۶۸ء میں ڈیرہ دون آئے جہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

۲۔ نومبر ۱۹۶۷ء (۱۹ رمضان ۱۳۹۰ھ) بروز جمعہ محری کے بعد داغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال ہوا۔ راجدوڈ ڈیرہ دون کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ اپنے بھتیجے اعجاز احمد (خلف پر وقیر تنہا احمد) کو گودے لیا تھا؛ دیا ان کے وارث ہوئے۔



ناشاد کا پنوری، سری دھڑ پر شاد نگم

غالب نے ایک مرتبہ کہا تھا:

سو پشت سے ہے پیشہ اکابر پہ سگری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

کم و بیش ہی صورت ناشاد کا پنوری کے ساتھ پیش آئی جن کا کھیلے دنوں انتقال ہو گیا۔ ان کا خاندان (نگم کا نسل) دراصل قنوج کا رہنے والا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں ان کے جدِ اعلیٰ نقل مکان کر کے کانپور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انھوں نے خاصی جااد و پیدا کر لی تھی۔ خاندان میں سب سے پہلے ۱۸۴۶ء میں منشی دوگلا پرشاد فوج کی ملازمت میں داخل ہوئے؛ یہ ناشاد کے پردادا منشی کا لکا پرشاد کے والد تھے (دادا کا نام تلجا پرشاد تھا) اس کے بعد فوجی ملازمت گویا خاندانی پیشہ بن گئی۔ خود ان کے والد مراد صاحب گوکرن پرشاد رسالہ دار (کیشن افسر) تھے (۱۹۳۱ء) دونوں چچا بھی فوج میں تھے۔ ناشاد کے بڑے بھائی منشی گجا دھڑ پرشاد بھی فوج میں ملازم تھے۔ ناشاد ۱۸۷۱ء کو ان کے والد تعینات تھے۔ ابتداً

تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اس کے بعد محبوب کالج، سکس آباد روکن میں داخل لیا گیا۔ انہوں نے ان کے والد کا تبادلہ ہو گیا تھا، دوسری درجے تک یہاں پڑھتے رہے۔ انٹر کا امتحان نظام کالج، حیدرآباد سے دیا۔ اب یہ کانپور چلے آئے، پانی اے کی تعلیم یہیں حاصل کی۔ آخر ۱۹۳۱ء میں ایم اے (انگریزی) کی سند آگے۔ ریٹورنٹی سے لے کر اس سال نومبر میں سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے گھانٹہ پر تحصیل (ضلع کانپور) میں نائب تحصیلدار کے عہدے پر تعیناتی ہوئی۔ تب ہی ڈپٹی کلکٹر کی تک ترقی پائی۔ ۱۹۶۴ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

خاندان کی روایت فوج کی تھی، لیکن فارسی (اور اردو) سے کاسٹھ خاندانوں کا شغف بھی رہا ہے۔ ناشاد کے دادا انارکلی کے شاعر بھی تھے۔ ناشاد نے گریبا شعری ورثے میں پائی۔ شرواح میں جناب گنگا دھرتی ناتھ فرحت کا پوری سے نشو و نما۔ اپنے وطن کے مشہور ناماد رسالے آزما (کانپور) میں نثری مضامین لکھتے رہے؛ اسی دور میں چند نکاحیہ مضامین بھی قلمبند کیے تھے۔ کلام بھی آزما کے علاوہ ساقی، آجکل وغیرہ میں چھپتا رہا۔ اسی زمانے کا ایک مقطع ہے جس میں جناب فرحت کی استاد کی کا احراق کیا ہے:

فکر نشاط آج ہے بحر آفرین

فیض فرحت کا بھی اعجاز ہے

مہرل بعد ملازمت کے دوران میں جناب شام سو میں لال بگڑ بریلوی سے ملاقات ہوئی تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ اب بہت دن سے فارغ الاصلاح ہو چکے تھے، لیکن آخر تک استاد کے عاشق تیار اور جاں نثار رہے۔

غزل اور رباعی پر زیادہ توجہ دی۔ پہلا مجموعہ (کیفِ سرمدی) ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں چھپا تھا۔ ایک زمانے بعد مزید اضافوں سے اسے سرودِ سرمدی کے عنوان سے شائع کیا۔ (لکھنؤ ۱۹۶۸ء) اس میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ موجود ہے۔ بیدِ نغمہ اور بلند تہ

مرتبہ کلام ہے! کہیں ابتداء یا عروانی کا شائبہ تک نہیں۔ چھوٹی تحریر میں سہل متن شعریہ کا ان کا فرق امتیاز ہے۔

۴ نمبر کو دل کا دورہ پڑا، فاکٹروں نے مکمل آرام کی ہدایت کی۔ ۴ دسمبر کو معدے میں دڑکی ٹسکاری کی، تو اسپتال بھیج دیے گئے۔ یہیں بیٹھے کے دن ۵ دسمبر، ۱۹۷۷ء رات کے ساڑھے گیارہ بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کی۔ آخوند بقیائے ہوش و حواس علان کے افراد سے باتیں کرتے رہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں!

عکس رنگیں بنے گھاؤ شوق کا اور مشرچ عالم ایجاد کیا

دل میں اک موج رنگ و بو اٹھی آج یہ کس کی یاد آئی ہے

ہر نفس پیام محبت ہے، جھنڈیں! یہ زندگی نہیں ہے عبادت ہے، جھنڈیں!

نظر آتے ہیں وہ کچھ بہاں سے گلا کس کو ہے اب عمر رواں سے

دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو غم کے ماروں کی زندگی کیا ہے!

بدگمانی کو بھی خدا سمجھے کیا کہا میں نے، آپ کیا سمجھے

بدگمانی کا بدگمانی ہے تم محبت کو بدعما سمجھے

ہوں، تریں ہوں بُرا زمانے میں آپ اچھے ہیں! خیر، کیا کہیے

زندگی کٹ گئی خوش و ناخوش اس کے آگے اب اور کیا کہیے

حالِ ناشاد پوچھتے کیا ہو دل بھر آتا ہے! آہ، کیا کہیے!

عشق کی عظمتوں سے ناواقف کر رہے ہیں ابھی جبیں سائی

میں تو کہتا ہوں، ادگ ہے دل کا اب تھیں کچھ دوا ہے محبت کیا؟

جالے، کیا آج ہونے والا ہے دل دھڑکتا ہے کیوں خدا جانے

جس پہ لاکھوں ستر تیس صد تے ایک ایسی بھی غم کی رات ہوئی

کاٹتا پوجو عمر رو رو کے اس کو کیا، دن ہوا کہ رات ہوئی
 چاند تارے بھی اب تو سونے لگے لے غم، بھر، کتنی رات ہوئی
 ترے در سے اٹھ تو جاؤں، تو ہی منصفی سے کہ دے
 ہے مری جبین کے قابل، کوئی اور آستانہ
 ایک دل کی کلی نہ کھل پائی بھول لاکھوں کھلے، ہزار آئی
 ناشاد کے سوا بھی بہت جان شادیں کیوں یاد آئی، آپ کو، اس خاکسار کی
 جب بات بات پر وہ روئے کے یاد آئیں واضح، تو ہی بتا دے، کیونکر نہیں بھلاؤں
 ہاں چھوڑ دیں وہ الفت، لیکن یہ ہو سیکے گا وہ ہم کو بھول جائیں، ہم یاد بھی نہ آئیں
 ناخدا کیا کہا، کس نے کہا یہ تم سے وہ یاد کر رہے ہیں، کیا خوب دان جائیں
 اپنی خبر جو چاہے کوئی کچھ بھی کرے، دل نہ ٹکائے
 لطف و کرم کی تاب کسے ہے رہنے بھی، دو، اب و بھوئی
 سجدے کرتے ہیں رات دن، لیکن بندگی عمر بھر نہیں ہوئی
 تم کس کے نہیں زمانے میں اک زمانہ نگر تھا، رہا ہے
 سب ہے دل آنے کی بات عشق نہ جانے جات گات
 تم بچے، اویں ہی جھوٹا کون بڑھائے تم سے بات
 عشق کا بھی کیا کھیل ہے، پیامے! پیچھے بازی، پہلے بات
 حال نہیں ناشاد کا اچھا اب ہے اس پر بھاری رات
 یہ مانا، ناشاد برا ہے تم نے کوئی، اب دیکھا
 تذکرہ تھا گزشتہ ایام کا آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے
 جان کر کون آگ سے کھیلے! جان دے کون عاشقی کر کے!
 دل سے کب تک بات بنائیں ان کا کیا، وہ آئیں، نہ آئیں

اس پر بھی جب وہ یاد آئیں	ترکِ محبت کر دیں، لیکن
یوں ہی کب تک دھوکا کھائیں	جے بھی کچھ ایسا کچھ بھی نہیں ہے
یاد کیا آیا، آنکھ سہرا آئی	سن کئے ناشاد و اسپار کی باتیں
سچ تو یہ ہے جس سے مٹی دھو دیا بھی نہیں	کہنے کی بات اور ہے، کہنے کو کوئی کچھ ہے
بات کچھ ایسی تھی نہیں، تم نے مگر سنی نہیں	ہاتھی دل کی دل میں بات یا وہی گار گئی تھی
دیکھ لو اس سے مانگ کر اس کے جہاں کی نہیں	دین پر اس کی شک ذکر ہاتھ زرا دراز کر
عجب وہ دن تھے، جب تم ہیراں تھے	دفا پر بھی مری کیا کیا گماں تھے
پیارا براہ وہاں آئیگے، جہاں، کب تک؟	یہ تجھے کس نے کہا کچھ بتا تو کس نے کہا
منہ سے نکل، ہوئی پرانی بات	حالِ ناشادان سے کیا کہے
یوں بھی ہوتا ہے، کوئی بات نہیں	حالِ ناشاد سن کے نہ مایا
پیشیاں آپ جوں ایسا نہیں ہے	یہ مانا حالِ دل اچھا نہیں ہے
کہ جیسے آج تک دیکھا نہیں ہے	انھیں ہیرا ہم یوں دیکھتے ہیں
بہت دن سے تمھیں دیکھا نہیں ہے	بہت جی چاہتا ہے، دیکھنے کو
اور کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں	لنگے ناز سہم گئی سب کچھ
کہ نہ پائے ہم ان سے بات دی	سب تک اگر جو رہ گئی ہر بار
اسے خانہاں خراب کہاں کی ہوا لگی؟	ناشاد ایترے چہرے کا بھول نہ لگا دھیا

آغا خلس کا شمیری، طفیل احمد

آغا خلس امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ مدرس پیشہ تھے۔ سعادت حسن منٹو (دف جنوری ۱۹۷۷ء) نے اپنی ٹا بعلی کے زمانے میں ان سے کچھ پڑھا تھا۔ جب افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کی شہرت ہوئی، تو بمبئی کے مشہور فلمی رسالے "بھوہ" کے مالک محمد نذیر صاحب نے انھیں اس کی ادارت کی پیشکش کی۔ منٹو نے اس شرط پر اسے قبول کرنے کی ہامی بھی کر دی کہ میرے استاد آغا خلس کو بھی ادارہ "مختبر" میں شامل کیا جائے۔ اس میں منٹو کی اتادری اور سعادت منندی کا جذبہ ضرور تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی وجہ یہ تھی کہ منٹو کو اپنی زبان اور بیان پر پورا بھروسہ نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آغا خلس اگر ادارہ "مختبر" میں آگئے، تو اس پہلو سے اطمینان رہے گا۔ یہ آزادی سے پہلے کا قصہ ہے۔

تو یہ تھے آغا خلس، زبان و بیان کے ماہر، شاعر اور شعر فہم، صوفی اور لویب حقیقت پر بے کون کا جو مزاج تھا کہ نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پردا "وہ شاید عمر بھر کبھی امرتسر سے باہر قدم نہ رکھتے، لیکن کچھ کو کون مٹا سکتا ہے، یوں وہ امرتسر سے بھی ہٹ گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہو اگر اس کے بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ منٹو پاکستان سدھارے اور ملک محمدیہ

وہاں جو نبی آدم کی آخری منزل مقصود ہے۔

اب مقصود خلش کی زندگی کی گویا واحد بھی بن گیا اور دو کے پرچوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ نذیر صاحب کے انتقال کے بعد مقصود بھی رُود باخطاط ہو گیا۔ شہزاد ملتا بند ہو گئے، جو کچھ خلش صاحب دنیا پر فلم کے خداؤں کے سامنے سرسجود نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے پرچوں کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ اس کے باوجود حوصلہ نہیں ہارے۔ کیا کیا مصیبت نہیں اٹھائی انھوں نے اس کے لیے۔ بیوی کے تن پر ٹھنک کا کپڑا نہیں، گھر میں پیٹ بھر کھائے کو آنا نہیں، ایک مکان کے دینے کو کرایے کے دام نہیں، لیکن یہ مرد قلندر مقصود کے لیے مانگے مانگے سے انتظام کر لیتا اور اسے چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا۔

آخر سب کے پریشان رہنے لگے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پریشانی اب ناقابلِ برداشت ہو گئی، اور نہ پریشان تو وہ سدا کے تھے۔ اس پر انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ سحری کے بغیر رمضان کے پورے روزے رکھے، کمزوری ہو ناہمی چاہیے تھی۔ عید کے دن ہمارے ہو گئے۔ صبح اٹھے اور بخار کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ یہ گویا سرسجام کو دھو تھی۔ دوستوں نے یہوشی کی حالت میں جے جے اسپتال کے خیراتی دارۃ میں چھنچا دیا۔ دہی ۱۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کے ساٹھھے آٹھ بجے جان بحق ہو گئے۔

جس دن مرے ہیں، ان کی بیوی کے پاس سادی جمع جتھالے دے کے ۳۹ روپے تھے۔ دوستوں نے تجزیہ و تکفین کا انتظام کیا اور اگلے دن ۱۷ دسمبر سہ پہر کو انھیں نارین باڑی (دہلی) کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

لاؤ لدنوت ہوئے۔ ۷ برس کے قریب عیڑائی۔ جناب نور اللہ زوری دلمیزہ جلیں، پانچوڑا نے سارنچہ ذات کہی:

دکھی میں آئیگی یہ ادا، دکھی کی ہوگی ریش
تری یاد ہم کو تیری، مائیگی دل سے خلش خلش
کوئی پچھے تہہ سے جو سالِ غم تو یہ کہتا آج سچتر
یہ جو سالِ بزمِ دل جو سی اسے عیسوی میں غم ظن
۱۹۷۷ء

اردو زبان ان کا اور حنا بچھونا تھی۔ لغات اور محاورات کے مصداق درمیان میں مقررانہ عبارت تھی۔ زبان میں وہ کوئی بدعت بلکہ حدیث تک بھی مباداشت کرنے کو تیار نہیں تھے اور اس معاملے میں ہر کسی سے الجھنے کو تیار نہ تھے۔ معلومات اتنی وسیع اور معتبر تھیں کہ وہ کسی پر اعتراض کرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ اسی لیے شاید ان کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع نہیں تھا۔ جنازے کے ساتھ منشی بھگوان دی تھے، ۲۵۔ بہرے زیادہ کسی صورت میں نہیں ہونگے۔

نمونہ کلام میں چند شعر لفظ ہیں:

ان کو کیا وعدہ فردا نے فرسار	دکھا کہیں کا بھی نہ ہیں اعتبار نے
ہم کو سنا نا پڑ گئی اب میکدے کی خیر	چپکے سے شیخ جی جو لگے ہیں پد حار نے
کا فردل ہے سلساں، بڑی مشکل ہے	تنگری میں سہا ہے ایمان، بڑی مشکل ہے
ذوق فقار ہے کہ مر جائے نہ اپنا پانی	راہ میں پڑتی ہے ڈھلوان، بڑی مشکل ہے
سو گئی سایہ دیوار میں قسمت میری	اوپر جیاد ہے دربان، بڑی مشکل ہے
جاں نثار لکھا دیل گروہ ہے، تو جان بچا	جان سے جانا مری جان، بڑی مشکل ہے
شوق برباد ہے، فریاد و تہمتا مردہ	بزم دل ہو گئی دوران، بڑی مشکل ہے
موت ہے لذت ایذا طلبی پر طاری	مشکلیں ہو گئیں آسان، بڑی مشکل ہے
سخت جان کی بندھی وعدہ فردا سے ہوا	پر خطا ہو گئے اوسان، بڑی مشکل ہے
ہم نے مانا ہے پریشانی خاطر کا سبب	۱۔ لف خود سہی ہے پریشان، بڑی مشکل ہے

آدمیت کی علامت ہے خلش و ایشہ

آدی کون ہے، پھان، بڑی مشکل ہے

پسند آیا ہے دل میرا تو اپنے پاس بندھو
مجھے ساری خدائی مگر برا کہتی ہے کہنے دو
جگر کا سوز دل کا داغ دھوئے ہیں لغت
محبت کی سجاوٹ کو مجھے کافی میں کہنے دو

خار کھے، اکیلے ہو، اکیلے تم ہزاروں میں ہزاروں دکھ اکیلی جان پر مجھ کو بھی پہنچے۔
 مجھ جیسے ہوئے دل کی زمیں یلرب کرتا ہے گھڑی بھر کے لیے آنکھوں کے دیاؤں کی بجائے۔
 اس شرم ہے بیشک مضافِ جامِ ہستی
 خلش کی آدمیت نے بھی کپڑے ہی پہنچے۔



دیبا بریلوی: نارائن داس ٹنڈن

۱۹۰۱ء میں بریلی (محلہ بہاری پور) پیدا ہوئے۔ اپنے والدین کے کھاتے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان تجارت پیشہ تھا، پکڑے کی آزمت کا کاروبار تھا، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جب ۱۹۲۴ء میں ان کے والد لالہ بہاری سرن ٹنڈن (کھتری) کا انتقال ہوا، تو نہ صرف کاروبار کا بلکہ پورے خاندان کی دیکھ بھال کا بار بھی ان کے کندھوں پر آ پڑا۔ انھوں نے اسے موافقہ دار اٹھایا، کام کو ترقی دی اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ خوب دولت پیدا کی، جس سے ان کا شہر کے معزز اور باثر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔

انھوں نے پرانے طرز کی اردو فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ ہنر و مڈل کے درجوں میں پڑھتے تھے کہ اپنے استاد منشی رجبیر دیاں کے اردو فارسی کے دلآویز طریقہ تعلیم اور شعر خوانی سے متاثر ہو کر ۱۹۱۵ء میں شعر کہنے لگے۔ بہت دن تک کسی کو اس کا علم نہیں ہوا۔ دو سال بعد جب منشی رجبیر دیاں کو اس کا پتہ چل گیا، تو انھوں نے حضور دیا کر اپنے کلام پر پامش لے کر پڑا تو وزن سے اصلاح دیا کہ وہ سوزن مرحوم قوم کے کاسٹھ، بڑے بختہ منشی اور زود گو شاعر تھے جس میں منشا عرو میں بیٹھے بیٹھے پوری غزل کہہ لیتے تھے۔ استاد میں مولانا حسن رضا

حسن بریلوی تلمیذِ داغ (ف ۱۹۰۸ء) سے کچھ استفادہ کیا تھا، لیکن باقاعدہ اصلاً منشی رام بہادر لال جو یا آٹولی (ف ۱۹۲۸ء) سے لی۔ بریلی کے بیشتر مستند شاعر سوزن کے شاگرد ہیں۔ عمر کے آخری ایام میں دماغ کا تو اذن بگڑ جانے سے یونہی بازاروں میں گھوما پھرا کرتے تھے غالباً ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ دینے سوزن سے استفادے کا اعتراض ایک قطعے میں بھی کیا ہے:

کچھ تو عرفانِ قنزل، کچھ شعورِ فن کا فیض
طبع کی کچھ جدتیں، کچھ دانشِ روشن کا فیض
اب جدا احساس میں ہے منزلِ شعر و سخن
دہرِ فکر دیا ہے حضرت سوزن کا فیض

استاد نے ۱۹۳۵ء میں فارغ الاصلاح کر دیا تھا، بلکہ اس کے بعد اپنے مبتدی تلامذہ کو بھی اس سے مشورہ کرنے کی ہدایت فرماتے۔ دیا مرحوم عام طور پر مشاعروں میں نہیں جلتے تھے بلکہ تو گڑبہ خدی سے نفرت تھی، اسی پر ہر کہ وہ کہ جو اددی جاتی ہے، اس سے بہت شخص ہوتے تھے۔ ان کا خاص جواب کی عقل میں خوب چپکتے تھے۔ طوعاً و کرہاً کبھی شاعرے میں جلتے، تو بڑے وقار سے ہلکے ترنم میں پڑھتے، یوں معلوم ہوتا تھا، گو یا خود اپنے کلام کی کیفیت میں کو ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی کہتے تھے۔ دیا تخلص ایسا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں جگہ آسانی سے استعمال ہو سکتا ہے۔

پرائی وضع کی تعلیم اور اساتذہ کی تربیت کے زیراثر غزل سے مزاوت ہونا ہی چاہیے تھی اس کے علاوہ انھوں نے اقوالِ نظمیں بھی کہیں اور شاعروں میں سنائیں۔ انتخابِ کلام شام بہاؤں کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (دکھنؤ ۱۹۶۷ء)، اس میں غزلیات، نظمیں، قطعات سب کچھ ہے۔ ہندی کلام غالباً شائع نہیں ہوا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو بریلی میں انتقال ہوا۔ فشار دم (بلڈ پریشر) کے پرانے مریض تھے، لیکن نو

خوری سبب فالج ہوا ۔

ان کے کم قدم سے بریلی میں اردو اور شعر گوئی کا چرچا تھا۔ زیوہ شاگرد بنانے کے قابل نہیں تھے، اس میں اہلیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جناب گو پیشو رزائے ہزار و کیں بریلی، ہر تخلص ان کے خاص شاگردوں میں سے ہیں ۔

اب نمونے کے چند شعرا خط ہوں، جو ان کے مجموعہ 'کلام شام بہاواں' سے اخذ ہیں:
 اک تماشا بن گیا میرا سکون مجھ پہ جب رازِ دل مضطر کھلا
 زندہ بخاد ہوا یا شیخِ حرم ہے درِ رحمت، دیا سب پر کھلا
 وعظ کیے میں، گھر میں مینو عشی جس کو دیکھو، وہ پار سے نکلا
 اپنے شکووں پہ ہے دیا 'نادم' درد بھی دل کا آسرا نکلا
 دینِ زندگیِ سمیت، دیا! ہے نہیں دنیا میں کوئی ناتواں کا
 جن کی پردا ز میں پنہاں ہے فرجِ بخت ایسے گستاخِ خداؤں سے مجھے کیا بنا!
 کیف بہا رکھا ہے خاق بہا رکھا ہر اک ادا پسند سہی، اعتبار کیا!
 یہ ہے کچھ کل اہل دنیا کا ایساں، رباں بچ ڈالی، دہن بچ ڈالے

بہادوں نے بیجا ہے ناز بہاواں گلوں نے حسیں پر بہن بچ ڈالے
 ترا شکر یہ، انقلابِ زمانہ! نئی بندگی ہے، نیا آستانہ
 پہل سی باتیں، پہلا زمانہ شائیں، تو کس کو ستائیں نہاں
 ترکِ نئے کی بات بجا ترکِ سے آسان نہیں
 اس کو غم، اُس کو تسکین جلوؤں کا ایساں نہیں
 دل میں ہیں ان کے جلوے ہوتا اطمینان نہیں
 اب نہ وعدہ ہے، نہ کچھ پیمان ہے شامِ غم کجا بے سرو سامان ہے
 عشق نے کیا کیا عطا کی نعمتیں درد ہے غم ہے، ترا ارمان ہے

سوچ کر کہیے کہ مشکل ہے عمل بات کہہ دینا بہت آسان ہے
 کہہ ہے، تنگدہ ہے، نقش قدم کسی کا معراج زندگی ہے سجدوں کی انجمن میں
 میں تو دیوانہ ہوں، ویرانہ ہے میری حیات جن میں زمیں ہیں بہاریں وہ جہاں کیسے
 دنیا کی آرزو، کبھی عقبنے کی جستجو بزمِ عجم حیات بھی تہنا نہ رہیگی
 وعدہ کی بات چھوڑیے، وعدہ سکون نہیں وہ دن نہ ہے نصیب، تنہا رہیگی
 غم نے عطا کیا، دیا! احساں برعد کی اک دروِ دادِ اکی دوا آج ہوئی ہے
 تمہارے درد سے کیفِ دوام ملتا ہے ہر ایک درد نہیں دردِ جاوہاں کی طرح
 کبھی نگوں کا فساد، کبھی بہار کی بات نفس میں زندگی گدھری بنے آشیانہ کی طرح
 وحیات میں تیرا کرم، عیشِ منزل! ہمیشہ ساتھ رہا میرے پاس کی طرح
 بہت اکٹا گیا دیر و حرم سے کسی کا تنگ رہے، اور میں ہوں
 عزیزوں نے دیا کچھ اور کاغذِ حیا بہت لمبا سفر ہے، اور میں ہوں
 مسکرا کر یہ کہا: آپ کو دیکھا ہے کبھی نامِ حب میں نے بتایا، تو بُرا مان گئے
 فخرِ صدائے نعتی خاموش تھا میری حالِ دل ان کو بتایا، تو بُرا مان گئے
 کتنے دیوانے ہیں ہم، سودا کہاں کا مریں ہے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو، جو ہمارے گھر بنا ہے

دو ہے اور حشرِ سوزاں بدنام کو ہر پر دلنے میں
 یہ محفل ہے دیوانوں کی اس داد کو کوئی میا جانے
 چشمِ فداک! کہاں ہیں وہ لہو کے آنسو؟ رنگ بھرتے تھے جو برسات کے آئینے میں
 کچھ پتا چل نہ سکا احدِ نظر تک جس کا اس کو دیکھا ہے خیالات کے آئینے میں
 بہا بگل میں نہ رنگ و بو سے جا رہی ہے شعورِ زندگی جتنا خلوصِ خدا میں ہے
 یہی ہے دادِ حشر! زرا سنی تجھواری رہاں کی بات ابھی دل کے اخصیائیں ہے

یہ بہاریں بھی تجھی سے ہیں خزاں بھی تجھ سے

ہم بہرِ عیش، بہرِ غم، یترے دامن میں رہے

دنیا کی ہر بہار ہمارے چہن میں ہے

مرے غم کو تو نے کہاں سے صدمہ

مری زندگی ہے، مری نامرادی

کسی نے کسی کو کہاں فی سادی

فکر بہارِ خوش نشین، دھن کا عیش

وہ دھن تبسم، وہ حسنِ تغافل

وہ ہونگے جنہیں جستوے سکون ہے

ہے اتنی سی تعبیرِ خوابِ دیا کی



باسط اوجہنی، نیا محمد خان

اوجہنی کے ایک جاگیردار خاندان کے چشم چراغ تھے، ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ گھر میں خداداد باسپ کچھ تھا، لیکن ان کے والد غلام محمد خان دہی ۱۹۲۸ء میں فوت ہو گئے۔ کس تربیت میں اپنی ساری جادوگریوں اور درشتی داروں اور دوستوں میں تقسیم کر دی، حد یہ کہ اپنے باسپ بڑا وقت تک کیلئے کچھ بھی نہیں رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ باسط صاحب کی ابتدائی عمر بڑی تنگی ترشی میں گزری، اور اسی باعث تعلیم بھی ناممکن رہ گئی، مشکل آٹھویں درجے تک پڑھ سکے۔ یہی کسی حد تک انہوں نے بعد کو ذاتی مطالعے سے پرار کرنے کی کوشش کی اور یوں اردو اور ہندی دونوں پر پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔

چونکہ ان کے والد غلام محمد خان صاحب نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک میں ہمیشہ قوم پرور رویہ اختیار کیا تھا، باسط بھی نوجوانی سے سیاست میں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اجموؤں کو برابر کے حقوق دلانے کی ہم چلائی، تو باسط نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس میں انہیں خود اپنے خاندان کے اکثر افراد اور خاص کر مسلم لیگ کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے کسی کی پروا نہ کی اور جواب میں کہہ دیا:

وہ جو کعبہ یا کمندرا، تو غرض نہ رکھ کسی سے

تجھے آدمی بنادے، وہ حرم قبول کر لے

کامنویسی خیالات کا نوید ہونے کی وجہ سے نہ صرف مخالفت کسی طرح کم نہ ہوئی، بلکہ اس میں تبدیلی کے اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر انھیں ترک وطن کرنا پڑا۔ اب انھوں نے بمبئی کی راہ لی۔ یہاں انھوں نے ۱۹۴۵ء میں ناخدا نام کا ایک مہینہ وار پرچہ جاری کیا۔ تین برس بعد ۱۹۴۸ء میں بعض احباب کی دعوت پر بھوپال پہنچے۔ وہ مختلف اوقات میں بھوپال کے کئی رسمی و غیر رسمی مشاغل مہینہ وار پکارا، روزنامہ نیوم، مہینہ وار اجالا (ہندی) نیا قدم (ہندی) سے بحیثیت نائب مدیر اور مترجم وابستہ رہے۔ اپنے دوران قیام میں وہ بھوپال کے سماجی اور تعلیمی حلقوں میں بہت سرگرم تھے۔ خاصاً صحت نگ مدھیہ پردیش کانگریس کمیٹی کے مرکزی دفتر میں بھی ملازم رہے۔ اس سے نہیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حالات بدستور ناموافق تھے، ہر نیا دن اپنے ساتھ نئی مشکلات لاتا۔ لیکن اس سے ان کی چشمانی پر کسمپلی نہیں آیا۔ انھوں نے اول روز جواب اختیار کر لی تھی، استقلال اور انجام سے بے پروا ہو کر اس پر کامزن رہے۔ ان کا آخری زمانے کا ایک شعر ہے:

یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم

لیکن ہمارے حوصلے منزل کے پاس ہیں

ان کی مستندی اور جذبہ خدمت خلق کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب یک ملت مدھیہ پردیش کی حکومتی دفتر کی زبان ہندی کر دی، اور اردو دان ملازم اس سے بہت کراہت ہوئے کہ اب کیا ہوگا، تو باسٹ صاحب ان کے آڑے آئے۔ انھوں نے ہندی بڑھانے کو ایک شبینہ اسکول جاری کر دیا، انصاف کے لیے خود ایک کتاب آسان ہندی ”کٹھ کر چھاپا۔ اور یوں دن رات کی محنت سے مختصر مدت میں سکھاری ملازموں کو (اور غیر ملازموں کو بھی)

آجی ہندی سکھا دی جس سے وہ اپنا شخصی کام منہدی میں سر انجام دینے کے قابل ہو گئے۔ اردو کے فروغ کے لیے انہوں نے بھوپال میں بعض اسیاتکے تعاون سے ایک "بزم سخن" بھی قائم کی تھی جہیں اور پاکستان کے ساتھ لڑائی کے زمانے میں اس بزم نے کل منہد مشاعرے منعقد کیے اور ان سے جو آمدنی ہوئی، وہ ملک کے دفاعی چنڈے کی نذر کر دی۔

بے عرصے تک مسلسل کثرت کا رادو کافی آمدنی کے فقدان اور پریشانی حالی نے رفتہ رفتہ ان کی تندرستی کی بنیادیں کھو کھلی کر دیں اور پٹ قے آدو جو جاباب پیرض لا علاج نہیں رہا۔ لیکن ڈھنگ کے علاج کے لیے بھی تو روپیہ درکار ہے؛ اور یہی ان کے پاس تھا نہیں سب سے پہلے اس کا ہلکا سا حملان کے قیام سہی کے زمانے میں ہو اتھا۔ اس پر دوستوں نے انہیں "نامہ موریل اسپتال میں داخل کر دیا۔ یہاں سے وہ بظاہر اچھے ہو کر گھر آ گئے؛ لیکن واقع میں لوگ جڑے نہیں گیا تھا۔ بھوپال میں دن رات کی جفا کشا زہ ندرگی سے وہ دبے ہوئے اثبات پھر ابھر آئے۔ پہلے بھوپال کے اسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ جب کچھ افادہ ہوا، تو یہاں سے اپنے وطن اور جہیں کے اسپتال میں منتقل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں ۱۹ دسمبر ۱۹۶۷ء صبح نو بجے اپنے مکان پر انتقال ہو گیا۔ اسی دن عصر کے بعد عید گاہ قبرستان میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے قریب دفن ہوئے۔ اولاد جہانی میں ایک لڑکا (اعجاز شمس) اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

سیاست کی طرح شعر گوئی کا شوق بھی کم عمری میں پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں مبلد (رحیم مسرت قریشی (ف ۱۹۶۰ء) کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے۔ اور پھر خود بذور بازو وہ مقام پہلے کر لیا کہ آج بھوپال اور مالوے میں ان کے بیسیوں صاحب دیوان شاگرد موجود ہیں (جس میں ان کا اپنا مجموعہ کلام مشافح نہیں ہوا۔ مدت ہوئی، ان کے شاگرد صاحب قریشی صاحب نے ان کے سوشل ایک کتابچے میں شائع کیے تھے (بھوپال ۱۹۴۷ء) دیوان نقش آرزو کے عنوان سے مرتب موجود ہے۔ منہدی میں بھی ایک کتابامیون دیکھا (اپنے حالات میں)

غیر مطلوبہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ بہت کلام مختلف رسائل میں بھی منشر حالت میں پڑا ہے۔
منزل کے طور پر چند شہزادی میں دن کیے جاتے ہیں:-

محبت کو زمانہ حسین راحت جب سمجھتا ہے	محبت میں مری حالت اکہی یاد دہانی کیوں ہو!
کاشادہ حیات کی تار کیوں کا حل	تاروں سے پوچھتے ہیں، کبھی چاندنی سے ہم
زندہ دل کی کس جفاؤں نے چھین لی	اب اجنام عرض تمنا نہیں رہا
میری بختی کے باعث غرقِ محنت ہو گئی	کچھ نہیں طغیانیِ انواع سے شکوہ مجھے
دار فکریِ شوق نے رنج و ہنس دیا	ہم امتیازِ منزلِ جاناں نہ کر سکے
ذوقِ سحر و عشق کا اللہ سے احترام	سر کو اٹھا سکے نہ ترے آشاں سے ہم
عشق کے سوز و ساز سے طلب کو آشاں کر	اب بھی وہی ہیں شوخیوں حسن کے التفات میں
اکتابِ کمالِ غم کے لیے	زندگی ہے، مگر بہت کم ہے
انہما نے وفا شعار رہی بھی	اک دلیلِ فریبِ بیہم ہے
یہ سجدہ عارفانہ بڑے کام کے ہیں، لیکن	وہی سجدہ بیخدا ہے، جو صنم قبول کر لے
مصلحت سے لاکھ دور کبھی دل کے پاس ہیں	طوفاں بد و خوش ہیں کبھی تو سال کے پاس ہیں
یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم	لیکن ہمارے جو صلی، منزل کے پاس ہیں
بیادِ غم کو جامِ خوشی بھی عطا کیا	ایسے کمال بھی مرے قاتل کے پاس ہیں
شعر و ادب کی شمع جلائی ہے اس لیے	پرہیزِ ادب تر ہی مصلحت کے پاس ہیں

غم بھی مجھے ملا ہے، خوشی بھی ملی مجھے
بسطایہ دو خوف نے مرے دل کے پاس ہیں



شاغل جیوپوری احترام الدین احمد عثمانی

ان کا سلسلہ نسب ۲۵ واسطوں سے حضرت عثمان غلیہؓ شروع سے ملتا ہے۔ خاندان کا
 مستط الراس گاندون من مصافات شہزادہ تھا۔ ان کے مودت علی مولوی درویش محمد مفتی
 بدایوں تھے، جہاں سے ان کے ایک بیٹے مولوی امین الدین ۱۱۶۴ھ میں قاضی مقرر ہو کر نازول
 (پنجاب) چلے آئے۔ اس طرح خاندان کی ایک شاخ نازول میں بس گئی۔
 ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دنیا دیگر گوں ہو گئی تھی۔ کئی اور شرعی طرح شاغل کے تاجی مولوی
 محمد عثمان تسلیم (خلف قاضی حبیب الدین) کو بھی تلاش روزگار میں وطن سے کلن پڑا۔
 تسلیم اچھے عالم اور اذوقا کی بلند پایہ شاعر اور شاعر تھا۔ ان کا کلام مطبوعہ وغیر
 مطبوعہ بہت ہے۔ منجملہ ان کے مشنوی حدیقۃ المذہب بھی ہے، جو انہوں نے سندھ کی
 کجواب میں لکھی تھی؛ یہ چھپ چکی ہے (اور ۱۳۵۵ھ) انہوں نے کلام پر اصلاح اپنے
 مولانا رشید الدین فاروقی (متخلص بہ منظر و فائز) (ف ۱۸۸۶ء) سے لی تھی۔ فائز
 پہلے سے اور قبل کا بیچ، جیوپوری مدرسہ اول ہو کر چلے گئے تھے۔ تسلیم بھی ۱۸۵۸ء میں یہاں
 کے مدرسہ تعلیمیہ میں مدرسہ اول ہو کر آئے اور پھر مدت العمر گویا جیوپور کے ہو کر رہ گئے۔

کچھ دن اس مدرسے میں کام کیا تھا کہ ریاست کے مفتی ہو گئے۔ ان کا انتقال اپنے وطن ۱۲۲ اپریل ۱۸۸۸ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ) کو ۳۵ سال کی عمر میں ہوا۔ اپنے خاندانی قبرستان میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

شہر کے ایک چھوٹے بھائی محمد اقصام الدین تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، شوکت تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ریاست جیپور کے محکمہ پولیس میں ملازمت کی اور ترقی کے مدارج طے کر کے کورٹ انسپکٹر مقرر ہو گئے؛ اس زمانے میں پوری ریاست میں صرف ایک ہی کورٹ انسپکٹر ہوتا تھا۔ ان کا ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو جیپور میں انتقال ہوا؛ وہیں گھاٹ دروازہ کے باہر کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کی ایک کتاب سلسلۃ المذہب طبع ہو چکی ہے۔

شاذل صاحب نہیں مولوی محمد اقصام الدین کے صاحبزادے تھے۔ مفتی کے دن ۴ دسمبر ۱۸۶۹ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ) کو جیپور میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں مہنتی تھے اور یہ اپنے خاندان کے مختلف بزرگوں سے پڑھی تھی؛ کچھ عربی بھی جانتے تھے۔ والد کی حیات میں انھیں کسی کوئی کام کرنے کی فکر نہیں ہوئی۔ جب ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو اب یہ چونکے۔ خوش قسمتی سے والد کی ملازمت آڑے آئی اور یہ کو تو ال مقرر ہو گئے۔

۴ جنوری ۱۹۱۷ء ملازمت کا پورا دور پولیس کے محکمے ہی میں گزرا، اوہیں سے آخری مرتبہ ۱۹۵۱ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد کوئی دو برس تک مسلم ہائی اسکول میں اردو تدریس کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شہزادہ و طویل حلاوت کے باعث یہاں سے فارغ ہوئے تو پھر کوئی کام نہیں کیا۔ خدائے فضل سے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ایک زمانے سے قبض کی شکایت تھی۔ جاٹوں میں نزاعیں دائمی فریق تھا۔ اب کے ان دنوں امراض نے شدت اختیار کر لی اور اسی میں ۸ جنوری ۱۹۷۱ء صبح سات بجے دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ غیرن گھاٹ دروازہ (جیپور) کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

آقا علیہ ذآبہ راجعون۔

اولاد جہانی میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگاریں ہیں۔ بڑے ابو الفضل محمود الدین عثمانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (شعبہ سیاسیات) میں ملازم ہیں اور چھوٹے ڈاکٹر ابو نعیم اسلم عثمانی گورنمنٹ کالج، لاہور میں اردو کے مدرس۔

گھر گھر کا ماحول علم فضل اور شعر و شاعری کا تھا، چنانچہ یہ بھی چھوٹی سی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اس میں اولاً چند دن اپنے رشتے کے بڑے بھائی اسامہ الدین احمد نسیم (دف ۱۳۴۳ھ) سے اصلاح لی اور پھر انھیں کے کہنے پر میرزا محمد تقی بیگ، مائی دہلوی (دف ۱۹۳۲ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ مائی خود امراؤ میرزا نور کی ذفات (۱۳۲۲ھ) کے بعد شاعری کا حساب کرتے، یا تسلیم سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ شاعری کا باعث یہ ہوا کہ ایک تو یہ استاد کے تخلص مائی کا بمقامیہ تھا اور دوسرے اس سے ان کے آقا و شاعری کا سال بڑا ہوتا ہے یعنی ۱۳۳۱ھ۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ شاعری نے شاعری پر کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ محض تفسیر طبع سے کبھی کبھار لیتے تھے اور اسے بھی محض نثار کھنے کا اہتمام نہیں تھا۔ وہ شریک بھی لکھتے تھے۔ ان کی تعداد کئی ہیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں بعض نثر نویس کے انتظام اور قاعدے قانون سے متعلق ہیں۔ زیادہ اہم علمی کتابیں تذکرہ شعراء جیپور (دلی ۱۹۵۵ء) اور صحیفہ خوشنویساں ہیں (دلی ۱۹۶۳ء)؛ یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی بہت اچھے خوش نویس تھے، ابھی پارساں (د، ۱۱۹ء) اپنے دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا تھا۔ اس کی کتابت بھی انھوں نے خود کی تھی ان کی تحریر ایسی عمدہ اور روشن اور خوش خط ہوتی تھی، جیسے مرقی پر دست ہوں۔ بہت کچھ غیر مطلوب بھی رہ گیا۔ ان کے مرنے سے ایک خریف انسان اور اردو کا ایک شیدائی ہم سے جدا ہو گیا۔

نور کلام میں کچھ اشعار و رجز ذیل ہیں:

دل اختیار کا، نہ جگر اختیار کا اب دیکھیں حشر کیا ہو شب انتظار کا
 دونوں ہی وقت سخت میں میخوار کے لیے آنا بہار کا ہو کہ جانا بہار کا
 شغل ہے، اور شغل ہے خوشگوار ہے اشد ہے، فیض ساقی فضل بہار کا
 کیوں ڈریں، اس کے بعد کیا ہو گا اب ہی کیا کم ہے، جو سوا ہو گا
 پوچھنے کیا ہو، حال شاغل کا میکے میں کہیں پڑا ہو گا
 دو گئے نہ موت، آئی نہ صبر، یا نہ دل ٹھہرا شب فرقت نہ کام آیا مرے اک دکا کرنا
 یہی آسان تھا، تاہم اگر شیخ وقت بندھے مگر انسان بننا پیر و مرشد بہت مشکل ہے
 ہم پر بھی کبھی ساقی کو ٹر کا کرم تھا اپنا بھی کبھی شیشہ، دل سا غرجم تھا
 اب کون ہے، دیلن ہے دنیا سے محبت پر دلے کی اک ذات تھی، یا شمع کا دم تھا
 اس کی بجائے ناز کا، اللہ رے تصرفا پڑتے ہی سراخانہ، دل شک جرم تھا
 ہاتھ میں جامِ مہو، دوش پر آنکھیں غمور کوئی شامل سادے میں مسلمان دیکھا
 کبھ چاکلیسا ہو کہ تجنا ہو، شاغل با میں نے سے بڑھ کر نہیں سامان محبت
 دنیا دہی سے دور، صواب خطا سے دور اس کے قریب ہو کے، ہوئے ماسوائے دور
 کعبہ میں کلیا میں، اے دھونڈ کے آخر جد یہ ہے کہ آپہنچے ہیں اب کے تباہی
 الفت بھی ہے کیا چیز، شکایت کی کوئی بات اٹھی بھی اگر دل سے قرآنی زبان تک
 وہ اگلا سا، ہمدان، دانا کہاں چن ہی نہیں آشیانہ کہاں
 ہر کون نفس سے، شکاں کہاں یہاں کے سوا آب و دانہ کہاں
 آہیں اثر کریں، نہ دھائیں اثر کریں یارب! جہاں عشق میں کیونکر اثر کریں
 کیا کہا آپے، پھر تو کہو اک بار نہیں ہم وفادار نہیں، تم تو جفا کار نہیں
 ہاوش بریں حسن بشر دیکھ رہے ہیں ہم وسعت و دان نظر دیکھ رہے ہیں
 پریشان کے ساتھ، نہ سچاں کے ساتھ اپنا تو کارواں ہے، انجم کارواں کے ساتھ

قرر ہوتی نہیں ہے ناموں کی بلکہ ہوتی ہے نیک کاموں کی
 عاشقی ہو کہ شر گوی ہو نس کو فرصت ہے ایسے کاموں کی
 قوم کا کام کر نہیں سکتے فکر جن کو ہے اپنے ناموں کی
 سر جھکاتے رہے، جو ساری عمر ان کو خواہش ہے اب مسلمانوں کی
 اب تو ساقی بھی کہ اٹھا، خاشاغل!
 فکر کیجیے، حضور! ناموں کی!

یہ بھی کم بات نہیں ہے ہرگز ظلم پر اس کو ندامت ہی تھی
 آئے شیخ حرم سے مل لیں نہ سہی فیض، زیارت ہی تھی
 دل کس کو دے دیا ہے، بتاؤ تو کیا ہو؟ شاعری! نظر جو آتے ہو تم بیکرا دے
 اسی کا نام محبت ہے شاید، لے شاعری! کہ کھینچتی ہے کوئی چیز دل کے اندر سے
 عشق صادق ہو تو خود راہنا ہوتا ہے حضور بھی دردِ جوں جائیں تو کیا ہوتا ہے!
 دیکھ کر رنگِ حریفانِ دانا شاعری! شکوہ ہوتا ہے، مگر شکوہ سے کیا ہوتا ہے
 جو ہو تیز، تو سب کچھ ہے نرم عالم میں یہی بہشتِ بریں ہے، یہی جہنم ہے
 حرم میں، دیریں، دل میں، کہاں نہیں بھر بھی تری تلاش میں مصروف ایک عالم ہے
 حریتِ یلف و عنایت کی فکر کیوں کیجیے تمہاری ایک نگاہ کو ہم ہی کیا کم ہے
 جو ہو قبول، تو کافی ہے ایک سی سجدہ نہ ہو قبول، تو بیکرا رشکِ پیہم ہے
 فصل بہار آتے ہی کیا رنگ ہو ٹھہرا دامن کا ہوش ہے، نہ خبرِ استیں کی ہے
 دنیا سے واسطہ بھی نہیں، شیخِ وقت کو اور فکر بھی جناب کو روئے زمیں کی ہے

عابد لاہوری، سید عابد علی

پچھل صدی میں شیعی فرقے کے ایک مشہور فرد ارسطو جاہ سید رجب علی شاہ ہوسے میں ہمارے زبان کے میٹل انشا پرداز محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے شاگرد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد آزاد مسیرو سامان کے عالم میں دلی سے نکلے، تو انھوں نے استاد زادے کی دلہن کی اور انھیں اپنے پاس رکھا۔

ارسطو جاہ، غالب کے مکتوب الہم میں بھی ہیں۔ وہ ۱۸۰۶ء میں تلونڈی (ضلع جگناؤں، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ تلونڈی کا علاقہ ان کے بزرگوں کو حکومت مغلیہ کی طرف سے بطور جاگیر ملا تھا۔ لیکن کچھ حکومت نے انھیں یہاں سے بریخل کر دیا۔ اس کے بعد لوگ جگناؤں میں آکر بس گئے۔ سید رجب علی شاہ نے وطن کے علاوہ دلی کا بیچ میں بھی تعلیم پائی، اور چند سے یہاں ریاضی کے درس بھی رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں وہ دلی ہی میں تھے، اور اس زمانے میں شہر سے پہاڑی دھیرج پر مقیم انگریز افسروں کو حالات پہنچاتے رہے تھے۔ ان شاندار خدمات کے صلے میں انھیں بعد کو دس ہزار نقد انعام اور خان بہادر اور ارسطو جاہ کے خطاب ملے۔ اور جگناؤں میں تین ہزار سالار کی

جاگیر بھی۔ نیز انھیں لفٹنٹ گورنر پنجاب کا میرٹھی مقرر کیا گیا۔ ان کا ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء اور جمادی ثانی ۱۲۸۷ھ کو انتقال ہوا۔

اگر طو جہا کے بیٹے سید حسن شاہ تھے۔ یہ رتوں پنجاب کے محکمہ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کے بیٹے سید غلام عباس نے فوج کی ملازمت کو ترجیح دی۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ ملک کے مختلف مقامات میں مقیم رہے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، صغیر تخلص تھا۔ خدا نے وہ لاجسمانی میں انھیں کے بعد دیگرے پانچ بیٹے عطا فرمائے، لیکن سب صغیر ہی میں داغے جہاں دے گئے جس زمانے میں وہ مدیرہ اسماعیل خان میں تعینات تھے ان کے ہاں ۱۸۶۹ء کو اللہ اکبر سے بچر (دھپٹا) بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے عابد علی رکھا۔ بعد ازاں اسے زندہ رکھا اور وہ فخر خاندان ثابت ہوا۔ یہی اردو زبان کے مشہور شاعر اور ادیب، مصنف اور مترجم سید عابد علی ہیں جن کا پچھلے دنوں لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد خدا نے سید غلام عباس کو اور تین بیٹے اور چار بیٹیاں دیں، اور محمد بہر سب آج تک حیات ہیں۔

عابد صاحب کی ابتدائی تعلیم مدیرہ اسماعیل خان ہی میں ہوئی اور وہ بچپن سے درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد رنگ محل (لاہور) کے شہنشاہی اسکول میں آئے، وہیں درجے کی سند یہاں سے پائی، ۱۸۷۳ء میں بی اے پاس کیا اور ۱۹۲۵ء میں دکن کے امتحان۔ اب انھوں نے گجرات (پنجاب) میں دکن کے شہر میں۔ میں نے ۱۹۲۴ء میں دکن کے ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول، دیرپا باد سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ انسٹرکٹنگ، گجرات میں داخلہ لیا تھا جو کہ میں یہاں دیر سے پہنچا تھا اس لیے مجھے کانجے کوشل میں جگہ نہیں ملی تھی، اور میں شہر ہی میں ایک کرایے کے کمرے میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ حافیت کا مطالعہ وسیع ہوا، بعض دوستوں کے ساتھ یہاں کی نرم سخن کے مہذبہ داری شاعروں میں بھی ملنے لگا۔ عابد صاحب ان مشاہیر میں بحیثیت شاعر شریک ہوتے تھے۔ آخر شہر

(ف ۱۹۴۸ء) سے ان کی دانست کافی رفتی تھی اور دونوں ہم مشرب پہلاز تھے۔ ان دونوں وہ بھی اکثر لاہور سے گجرات آیا کرتے تھے اور انھیں کے یہاں ہوتے تھے عابد صاحب کا یہ شعر اسی عہد کا ہے :

گلپاش و زرنکھا رہے گجرات کی زمیں

ہے اس جگہ قیام میری مست ناز کا

غرض میں نے عابد صاحب کو (اور اختر شیرانی کو بھی) پہلی مرتبہ یہیں گجرات میں دیکھا۔ ان کے گجرات (مرشد نغمہ تھا یہاں کے دور و دراز حثیت نگاہ و فردوسی گوش کا مصداق تھے اور ہر کوچہ اوراق مصور کا نمونہ۔ دکالت بڑی خوب، بیگم ہے، یہ کسی عورت کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ بہر تن اس کے ہو کے نہ وہ جائیں تو آپ اور خواہ کچھ بھی ہو جائیں، کامیاب وکیل نہیں بن سکتے۔ عابد صاحب کے نوکالت کے ساتھ ایک چھوڑ دود و علیس اور لگی تھیں شاعر اور اختر شیرانی۔ ایسے میں بھلا دکالت کیا چلتی، قصہ کوتاہ، ایک سال بعد وہ لاہور واپس سدھا۔ شاعر اور دب تو وہ تھے ہی، لاہور کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لے گئے، لوہنال اور ہزارستان رسالوں کی ایڈیٹری انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کی تھی۔ گجرات سے واپس آکر انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کی سند لی۔ مولانا تاجو رحیم آبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) دیال سنگھ کالج، لاہور میں صدر شعبہ فارسی وارد تھے۔ انھوں نے دشگیری کی اور یہ ان کے معاون کی حیثیت سے دیال سنگھ کالج میں یکچہ مقرر ہو گئے۔ اس طرح اب علم کی دنیا میں بھی نام آنے لگا۔ دیال سنگھ کالج میں چار سال کام کیا تھا کہ یہاں سے فوراً کہ سمین (ایف سی) کالج، لاہور میں صدر شعبہ السنہ شرقیہ ہو کر چلے گئے۔ وہ اس کالج میں ۱۹۴۲ء تک رہے۔

۱۹۴۲ء میں تاجو رحیم دیال سنگھ کالج کی لازمت سے جگہ دس ہوئے، تو اب عابد صاحب دبا وہاں فادسی کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ تقسیم ملک تک وہ اس عہدے پر

حکومت رہے اور پاکستان بننے پر ملک کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ لیکن اس عہدے پر وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ رفتہ رفتہ منٹلیں سے احتمالات پیدا ہو گیا اور بالآخر ۱۹۵۳ء میں انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت پاکستان نے مجلس ترقی ادب نام کا ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد اردو کے کلاسیکی سرے کی اشاعت اور بازیافت تھی۔ سید امتیاز علی تاج حرم (دفتر اپریل ۱۹۶۰ء) اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ عابد صاحب ان کے دست راست تھے۔ مجلس کی طرف سے ایک مقررہ ماہی رسالہ بھیج دیا جہاں شائع ہونے لگا؛ عابد صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ غرض کہ یہاں کا ماحول اور مشغلہ سرسری طور پر ان کے مزاج کے موافق تھا۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے کئی تعلقات پیدا ہو گئے۔ یوں بھی لاہور آئیشن کے کرتا دھرتا ان کے شاگرد اور دوست بن گئے، اس لیے ان کے شعوروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ عابد صاحب کو سرکاری میں بھی ماہرانہ ورک تھا اس سے متعلق ان کی متعدد تقریریں لاہور ریڈیو آئیشن سے نشر ہوئی تھیں۔ فروری ۱۹۶۷ء میں وہ مجلس ترقی ادب کی ملازمت سے الگ ہو گئے، لیکن اس کے بعد بھی اس سے حیرت کی طور پر وابستہ رہے۔ ان دنوں اس کی فراڈیں پر ایک کتاب عروص سے متعلق مرتب کر رہے تھے جس کے لیے غالباً سات سو روپیہ مہینہ وظیفہ انھیں ملتا تھا۔ صحت بہت دن سے خراب تھی۔ ایک زمانے سے محض مورفیا کے ٹیکوں کے سہارے جی رہے تھے گھر بڑے پریشانیاں بھی ساتھ تھیں؛ آمدنی کم اور خرچ بے پناہ۔ افسوس! ان کا ۲ جنوری ۱۹۷۱ء صبح کے وقت لاہور میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اہل تشیع کے معروف قبرستان مومن پورہ میں مکیکو ڈروڈ (لاہور میں دفن نصیب ہوا۔

انھیں نظم و شعر کی تمام قدرت حاصل تھی۔ ترجمے میں بھی اچھی مہارت تھی جو کہ زبان کا مزاج پہچانتے تھے اور شعر کا مذاق بہت اچھا تھا، اس لیے تنقید کے میدان میں بھی بند نہیں تھے۔ انھوں نے ڈرامے اور افسانے بھی لکھے۔ پیرایہ کی مشہور کتاب "ایفروڈاٹس" کا ترجمہ اردو میں داستان کے عنوان سے کیا تھا۔ اسی طرح دل دیوہاں کی کتاب "مشرقی آبی غلامی" کا

ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے بعض نادوں کا ترجمہ بھی کیا تھا مثلاً قیامت کی بات، بشر ہے کیا کہنے وغیرہ۔ ان کے ترجمے پر کہیں اور وہ کانگن نہیں ہوتا۔ ان کی تصنیفات کی فہرست خاصی طویل ہے؛ پچاس سے کم نہیں ہونگی۔

انہوں نے تمام اصنافِ نظم میں لکھا ہے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں حلیہ جالندھری کے گیتوں اور نظموں کی دھوم تھی؛ اور یہی وہی کسرِ اختر خیرانی نے پوری کر دی تھی۔ پنجاب کے نوجوان شعراء ان دونوں سے بہت متاثر ہوئے۔ عابد صاحب بھی انہیں لوگوں میں دتے۔ چنانچہ اس دہائی میں انہوں نے بھی ابتدا میں محبت اور نظیں لکھیں۔ لیکن اب ایک زمانے سے صرف غزل کہتے تھے اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ خوش گلو بھی تھے؛ بڑھنے کا انداز نکش اور سامعہ لڑا تھا۔ ان کی ابتدائی منظومات میں اقبال کے ارادی قبیح کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ اردو میں ساقی نامے کی تردید میں ان کا ہمتا ہاتھ ہے؛ اگرچہ اس میں انہیں تقدم کا فخر حاصل نہیں ہے؛ بلقیس لکھنوی کا حصہ ہے۔ عابد صاحب نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی تو وہی گجرات کی بیگم دہلیس تھیں عابد صاحب کی سادی اولاد اسی بیوی سے ہوئی (سات بیٹیاں اور ایک بیٹا مینوچر)۔ سب بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے؛ اور وہ اپنے گھر بار کی ہیں۔ اکھوتا لڑکا آج کل لاہور میں اسٹنٹ کمشنر ہے۔ ان کی دوسری بیوی محمودہ تھیں۔ اس شادی کے جلد بعد ہی بلقیس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لیکن محمودہ کی بھی ان سے نہیں تھی؛ اس نے طلاق لے لی۔ تیسری بیوی محبوب تھیں۔ یہ بیگم امروہہ کے ایک بھائی جاجو خانہ کی بیگم و چوانہ ہیں۔ بنیادی انہوں نے پچاس سال کی عمر میں کی تھی۔ وہ آخری دم تک اسی بیوی کے ساتھ رہے اور ان کے ہاں ان کا انتقال ہوا۔

اب ان کے چند شعر سنئے :

سب کے جلوے نظر سے گزرے ہیں وہ نہ جانے، کدھر سے گزرے ہیں
 سوچ آواز اپنے یار کے ساتھ نغمے دیوار و در سے گزرے ہیں
 آج آیا ہے اپنا دھیان ہیں آج دل کے نگر سے گزرے ہیں
 گھر کے گوشے میں تھے کہیں پنہاں جتنے سیلاب گھر سے گزرے ہیں
 جہاں کشتہ لڑا، زخموں کے پہرے ہیں وہیں بہار غزنوؤں ہے دیکھیے کیا ہوا!
 سبوتا تھا کہ یہ نازک مقام ہے، ساقی! نہ اہرن ہے نہ نیرواں ہے دیکھیے کیا ہوا!
 ہوا کا رنگ یہ ہے، آشیاں تو ایک طرف قفس بھی شاخ پر لرزاں ہے دیکھیے کیا ہوا!
 ہمیں ہیں پیر مغاں کا فروں کے لئے غلا! ہمیں کوہِ عویٰ دیاں ہے دیکھیے کیا ہوا!

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں، کب دن میرے پھرتے ہیں؟

وہ تو بچارے خود ہیں بھلا ری! ڈیسے ڈیرے پھرتے ہیں
 جی گلیوں میں ہم نے، اسکے کی سبج پہ رایتیں کاٹی تھیں

ان گلیوں میں بیاگل ہو کر سا بھد سویرے پھرتے ہیں
 روپ سروپ کی جوت جگتا، اس نگری میں جو کھم ہے

چاروں کھونٹ بگولے بن کر، گھوڑا اندھیرے پھرتے ہیں
 جن کے شام برن سالیے ہیں میرا من سستا یا تھا

اب تک آنکھوں کے آگے، وہ بال گھینزے پھرتے ہیں
 کوئی ہمیں سہی یہ سمجھا دو، ان پر دل کیوں رہ بھگ گیا!

تھکی چتون، بانگی چھب دالے، ہتیرے پھرتے ہیں
 اک دن اس نے نین ہلا کے، شرما کے مکھ موڑا تھا

تب سے سندھو سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں

اس نگر کی باخ اور من کی، یارو! یلانیاری ہے
 پنہی اپنے سر پہ اٹھا کر اپنے سیرے پھرتے ہیں
 لوگ تو دامن سی لیتے ہیں؛ جیسے ہو جی لیتے ہیں
 عابد ایم دیوانے ہیں، جو بال بکیر پھرتے ہیں

نہم دوراں، نہم جاہاں کا نشان ہے کہ جو تھا
 وصفِ خواہاں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
 شرع و آیین کی تغیر کے باوصف، شباب
 لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
 عشق کی طرزِ تکلم، وہی چپ ہے کہ جو تھی
 لب خوشگوئے ہوسا محو بیاں ہے کہ جو تھا
 ننگِ طفلان سے زنا بچ کے رہے قہر بلند

یہ وہی کارِ گنجِ شیدہ گراں ہے کہ جو تھا
 گزشتہ جام نہیں رگ سکتی جو بھی اے گردِ شبنم دوراں، گذرے
 صبحِ محشر ہے بلا سے ظاہر کسی صورتِ شبِ ہجران گذرے
 کوئی برسانہ سہرگشتِ دفاق کہتے بادل گہرا فشان گذرے
 ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس کئی آذر، کئی بزدان گذرے
 وہ جو پروانے چلا، رات کی رات منزلِ عشق میں آساں گذرے
 آیا ہمارے جینے کا انداز سب کو یاد جب ذکرِ جاں نثاری پودان ہو چکا
 انھیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت انھیں کو عرضِ وفا ناگو ار گزری ہے
 حرمِ شوق ہو گیا ہے آج تک، عابد! یہاں سے نہکت گیسوے یار گزری ہے
 عام ہو فیضِ بہارِ دانی تو مزا آجائے چاک ہوں سب کے گریباں تو مزا آجائے

و غلطو! یہی مکی تھادی ہی طرح مسجد میں
 ساقیا! ہے تری محفل میں خداؤں کا ہجوم
 دنیا میں اپنی جھپیں، نہ سنا میں
 لے ہر صنف و ! گلشنِ قفس ہے
 میخوار ساقی! قطرے کو ترسیں
 فصل بہاراں، کو یا دھن ہے
 اہرمن یار، نہ یزدانِ محرم
 گیسوے یار ہیں گوشاں کا ر
 زندگی آچ ہے انگاروں کی
 یوں بڑھی ان سے راہ و رسم وفا
 میرا مرنا تو ان پہ کیا کھلتا!
 بخت کے داندے ہوئے، اٹھ کے ٹھکانے ہوئے
 دھگے یا قیاس، غم دوراں ہو کو
 دامن یار کی راہوں سے گزر کر آخر
 چاند ترا مرے کاشانے میں عابدِ اہل است
 لے دوست! موج رنگ سے بنے نہیں تھن
 توکب زبانِ خار کی دیکھی نہیں اداس
 جیسی بری کٹے ہے اول کو مضطرب کروں
 مدت کے بعد لائے ہیں اسے راہِ میرا جاں
 یوں تو مضمی زبان، ہے ظالم کی
 لب سے ہوتی توئی آنکھوں سے سننی جاتی ہے
 کوئی پرداؤں کو سمجھائے کہ مرنے کے سوا
 نیچے دوں دولت! ایاں تو مزا آ جائے
 محض افروز جوانی تو مزا آ جائے
 دل کے اندھیرے دل کے آجائے
 آنکھوں پہ ہریں، ہونٹوں پہ تالے
 برسیں چھا چھم سادہ کے بھالے
 پھولوں کا آ پھل، چہرے پہ ڈالے
 یہی تقدیرِ بشر ہے، ساقی!
 ہر شب غم کی کسر ہے، ساقی!
 عاشقی! قفسِ شر ہے ساقی!
 کہ لہجے بھی کوئی خبر نہ ہوئی
 یہ رے جینے کی بھی خبر نہ ہوئی
 آنکھ کا در پیر مغاں تک پہنچے
 ہم سے کچھ سوختہ جاں کے بتاں تک پہنچے
 دستِ گستاخ سب را جو راں تک پہنچے
 دیکھیے! ذات کی یہ بات کہاں تک پہنچے
 لے دوست! موجِ غم کی جھلکار ہے بہار
 غافل کو وہ ہم ہے، گل و گلزار ہے بہار
 یادِ فخرِ عشرت سے، یا غمِ نیت سے
 میرا قیاس ہے کہ، چلے تھے وہیں سے ہم
 آنکھ میں رنگِ انقعات نہیں
 لے جو اپیار کے اسلوب جدا ہوتے ہیں
 اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

روش صدیقی، شاہد عزیز

اگرچہ بعض تذکروں میں ان کی تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپی ملتی ہے، لیکن یہ غلط ہے؛ ان کا صحیح سال ولادت ۱۹۰۹ء ہے۔ مرحوم نے خود ایک مرتبہ میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ جنوری/فروری ۱۹۱۱ء میں نکارا (کھنٹو) نے تذکرۃ اشعار شائع کیا، تو نیا ڈانے ان سے بھی حالات طلب کیے تھے۔ خدا معلوم، کیسے اہل تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کی جگہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپ گئی۔ اس کے بعد چونکہ سب لکھنے والوں نے حالات وہیں سے نقل کیے، اس لیے سب تاریخ عام طور پر تسلیم کر لی گئی، حال آنکہ یہ غلط ہے۔

بہر حال روش مرحوم ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو جوالا پور (ضلع بہاولپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی حفیظ احمد بھی شاعر تھے اور شاہد تخلص کرتے تھے۔ وہ ملا محمد اکرم غنیمت کنجاہی کی شہینہ بیگز عشق کے عاشق تھے۔ اس شہینہ کا مطلع ہے:

بنام شاہد نازک خیالان

عزیز خاطر آشفستہ حالان

اسی سے انھوں نے شاہد تخلص اختیار کیا تھا؛ اور اب جب خود نے بیادیا، تو اس کا نام انھوں نے

شاہد عزیز دیکھ دیا۔ مشنری نیرنگ عشق کے ہیں دو کردار ہیں، شاہد اور عزیز۔

گھر کا احوال مذہبی تھا ہی، تعلیم بھی اسی بنچ پر مبنی۔ اولاد و نفاذی کے علاوہ مندی بھی اچھی جانتے تھے اور یہ ان کے وطن جو الا پور سے گو روکل کے قرب کا فیضان تھا۔ بعد کو سنسکرت اور انگریزی سے بھی کچھ واقفیت پیدا کر لی تھی۔

روش تقسیم ملک تک جو الا پور میں رہے۔ یہاں وہ بانس کا کاروبار کرتے تھے اور اس سے ان کی گذر بسر کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ آزادی کے ساتھ فساد اُٹنے، جو الا پور میں بھی بہت سخت ہنگامہ ہوا۔ اسی میں روش کا مکان بھی نذر آتش ہو گیا۔ یہ جان بچا کر مراد آباد پہنچے اور یہاں مولوی منظر جلیل صاحب کے مکان میں پناہ لی۔ مولوی صاحب روش صاحب کے لئے خوش تھے کہ جب روش کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا، اور ایک زمانہ بعد انہوں نے دوسری شادی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، تو موصوف نے اپنی بیٹی (سعیدہ) ان کے عقد کاج میں بند کی۔ روش صاحب ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک مراد آباد میں رہے۔

ان کی بیوی کی ایک خالہ میرٹھ میں تھیں۔ پچانوے ۱۹۶۳ء میں یہ خاندان میرٹھ منتقل ہو گیا اور محلہ مشانجان میں انھیں کے مکان میں رہنے لگا۔

جو الا پور سے نکلنے کے بعد روش نے ساری عمر شعر کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ ویرانہ کوئی چار سال کے لیے ۱۹۵۹ء۔ ۱۹۶۳ء) آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ اردو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے، لیکن کچا شاعر، کچا دھڑکی بچو اس۔ وہ اس گون کے آدمی نہیں تھے۔ یہاں کا نظام اوقات اور دن رات زندگی کی پابندیاں یہ بھلا کہاں ان کے بس کی بات تھی، بالآخر پرچہ گزرا کہ یہ کام پر توجہ نہیں دیتے، وقت سے دن بھر غائب ہوتے ہیں، انجام کار انھیں ملگ کر دیا گیا۔ اسی ملازمت کے دوران میں وہ ہرملز، بلیم کے سہ ماہی شاعر میں سندھان سے اردو کے نامندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، یوں یورپ کے بعض مقامات دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے شاہجہانپور گئے۔

بات کو شاعرے میں کلام شاعر ہے تھے کہ لکاشد یہ دورہ پڑھا اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے چار بجے محل انصراح (۳۴ جنوری) اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ لاشعرا کے دن میر تقی گئی اور انھیں درگاہ شاہ ولایت میں (عبدالمسیح بدیل تلمیذ غالب کی قبر کے پاس) پڑھنا کیا گیا۔ حکیم کلب علی صاحب امر دہلوی نے جو مرحوم کے مخلص دوستوں میں سے ہیں، نظریہ کیا کہ اس کے آخری تین شعر ہیں:

جب بھی ہو جائیگی شائستگی ذہن و ضمیر ہو گا اس عہد سعادت میں نمودار روش
یاد کرتی ہے تجھے وہ ادنیٰ کثیر بہت تجھ کو روتے ہیں وہاں کے دردناک روش:
چل و پاسوئے نشاط ابدی آج کی بات 'ہائے' وہ صید محبت وہ وفادار روش
قریبی کا تھوڑا سا رنج بھی قابل ذکر ہے: (۱۳۹۰)

اٹھ گیا ان باروش سا اہل سخن بزم اردو سیاہ پوش ہوئی
لے کر! نکھ یہ مصرع سار رنج 'آہ' شیخ ادب خوش ہوئی
ابنا صدیقی نے عبسوی تھوڑا سا رنج لیا ہے اس کا آخری شعر ہے:

کہو اعجاز! تب آہ سے سار رنج دفلت مشعل باب سخن، نام روش صدیقی
روش بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے اور ان میں آغاز میں سے لے کر آخر تک کبھی کسی
اصلاح نہیں لی، بہت شہرت ہوئی کہ اپنے والد مرحوم سے کلام میں تصوف اور وراثت
ثروت بہت گہرے اور نمایاں ہیں، اور یہ ان کے احوال کا نتیجہ ہیں، بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے
یہ بھی کہا تھا کہ میرا مخلص روش فارسی کا لفظ نہیں ہے، یہ سنسکرت کا اور ہی ایش اریمن
سورج دیتا ہے جو ان کے کسی فاضل سنسکرت ہندو دوست کا عطیہ تھا، بہت ابتدا ہی
میں ان کے کلام کی پختگی سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا اور وہ انھیں کوئی سن ویدہ شخص سمجھنے
لگے تھے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے کہ ان نام و نامہ نے جو اوقات صرف جو دھری نذیر محمد راشد
تھے، روش سے اصلاح بھی لی۔ روش نے ۱۹۳۲ء میں ۱۹۳۳ء میں بہادر پور کے ایک صاحب

سید مبارک شاہ جیلانی (دف ۱۱ نومبر ۱۸۹۶ء) کے ساتھ ان کے ایک نفاہی پرچہ قلم صورت بھی جا
 کیا تھا، لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکل کر رہ گیا۔ وہ نظم بہت اچھی لکھتے تھے شروع سے چند
 غزلیں کہیں، لیکن اس کے بعد انھوں نے مدتوں اپنے آپ کو نظم ہی کے لیے وقف رکھا، اور اس میں
 امتیاز پیدا کیا۔ ان کی بعض نظمیں (مثلاً کاروان، مرغی، گاندھی وغیرہ) اردو کی آبرو بھی جانے کی
 مستحق ہیں۔ انھوں نے کاروان، نظم والے کتابچے (کبھی ۱۹۵۰ء اور ایک مجموعہ غزلیات بحرِ غزل
 (دلی ۱۹۵۱ء) کے علاوہ ان کا اوکلام شائع نہیں ہوا۔ ان کا سرائے سخن یقیناً دو تین مجموعوں سے
 زیادہ کا ہو گا۔

ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ ہے۔ فارسی کی شگفتہ اور دلآویز ترکیبیں اسی جہتگی اور چابکدستی سے
 استعمال کرتے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ لیکن شاعر سے بھی زیادہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ مرغان
 طبع، نیک نفس، پابندِ صوم و حلو، ویندار۔ میں انہیں ۲۰-۲۵ برس سے جانتا تھا۔ ہمارے موجود
 دور کے اکثر شاعروں کی عام روش کے خلاف میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی کے خلاف ایک کلمہ
 نہیں سنا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہاں مرحوم کی ایک سخن گسترانہ بات یاد آگئی:
 پھیل جنگِ عظیم کے دوران میں حیفنا جانندھری حکومت منہ کے اس گلے کے کرتا دھرتا تھے جن
 نے لائے بچانے اور کھیل تماشے کے ذریعے سے حکومت کو جی پراپگینڈے کا وردہا تھا۔ بعد ازاں کی
 خدمات جیل کے اعتراف میں سرکاری طرف سے انھیں خان بہادری کا خطاب عطا ہوا۔ اس پر
 روش نے ایک قطعہ کہا تھا جس میں اقبال کے اس مشہور شعر کی تبلیغ ہے:
 آ، تجھ کو بتاؤں میں تقدیر اٹھ گیا ہے خمیر و سنالِ اول، طاؤس در بابِ آخر
 روش کا قطعہ ہے:

اقبال کے عرفان میں تقدیر اٹھ گیا ہے خمیر و سنالِ اول، طاؤس در بابِ آخر
 رہتا جس حکومت کی سراج یہ گہمتی ہے طاؤس در بابِ اول، اعراض و خطابِ آخر
 شعری حلقوں میں بھی ان کے فن اور سانسینت کے باعث ان کا وقار تھا۔ خدا اپنے فضلِ کرم

سے انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ ہے۔ آمین

ماب کچھ شعر سینے، جہاں کے مبطوعہ مجموعہ کلام 'مخواب غزل' سے اخذ ہیں:

مرا ذوق سفر ہے بے نیازِ جادہ و منزل	نہ کوئی را بہر میرا نہ کوئی را ہزن میرا
بھری مینا سے کچھ، پھر کچھ طاقی چشم ساقی نے	بڑی دھانیوں کے ساتھ مجھ تک دو چہرے آیا
چراغِ صبح سے کچھ گفتگو تھی بے شبانی پر	تصور میں یکا یک چہرہ خورشیدِ شام آیا
تغافل کو کرم سمجھا ہے ہم نے	جنیں آساں ہمارا بھول جانا
خود آرائی ہے، اظہارِ محبت	خود آگاہی، محبت کا چھپانا
خلوصِ زندگی ہے، گنگنلا ہی	فریبِ مصلحت ہے، سر جھکانا
میری تنہائی تھی اک دنیائے دیوانہ کا حباب	جانِ محفل، آنے کیوں یہ رازِ انشا کردیا
حسن کے رخ پر تو، اے منصور! پردہ ہی دلا	عشق کی مجبوریوں کو تو نے رسوا کر دیا
وہاں ہزار تغافل، شریکِ نازِ سکوت	ہزار عشقِ یہاں، عشقِ گفتگو کے سوا
گمانِ بادِ عشرت مرے سہو پہ نہ کو	ہے اس میں زہر بھی شائل مرے ہونے کے سوا
نقطہ معافی، مری لغزشوں کا محسوسِ مہرِ دا	کوئی نہیں ترے لطفِ یہاں تجھ کے سوا

کوئی نسبت نہ ہوساقی سے، تو یہ مخاضہ بھی خاک

لطفِ ساقی ہو، تو خاک و درِ مخاضہ بہت

محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا	کہاں آگئے ہم محبت کے بعد
اب اس سے کیا غرض، یہ جرم ہے کلہاڑی کا	بیٹھے ہیں ہم تو سایہ دیوار و دیکھ کر
شایانِ جہیم، عشق نہ تھی قیدِ زندگی	جی شاد ہو گھیا رسن و دار و دیکھ کر
رنج و راحت میں ہے اک ربطِ لطیف	سرخوشی ہے شاہرِ علم کا لباس
نقابِ رنج سر کتا حباب رہا ہے	مگر وہ خود ہوئے جاتے ہیں مددِ شمس
یہ نازِ کم سخن و بصد کم آمیزی	کوئی ہوا تو بھی آج زینتِ محفل

ہوں تو ہر خواب تمٹتے ہے محبت افروز فکرِ تعمیرِ تمنا ہے محبت کا دواں
 بات آئی سی ہے اسے سحرِ حجاب نظر حسنِ انکارِ معیتر ہو، تو دنیا ہے حسیں
 مجھ سے پوشیدہ نہیں، پردہٴ تقدیر کا راز جو ترے دل میں نہیں، وہ تری قسمت میں نہیں
 سکو عشق ہو یا اضطرابِ شوقِ روش! حجابِ راز میں پنہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
 روش! کون نے اس محبت کا نام بڑی دلیلیں ہیں، رٹ ہی خواریاں
 رگوں میں شعلہٴ محبت، اندر بقی کہ زد و دل میں کہاں سے روشنی ہو، ان خود مندوں کی عقل میں
 حم نے کر دیا ہے عجم کو ادبِ نظاؤں چلیں اس بات پر یہ نظارہٴ حسنِ بیاں کر لیں
 مرا تو حال ہی کیا ہے، مرا تو ذکر بھی تمہا ترے سکون میں بھی رنگِ نفاں ملا کھ کو
 ہزار ویرہ حم ہیں سجدہٴ آمادہ جہیں ملی کہ ترا آستانِ ملا کھ کو
 لئے نقیبہٴ شہر! کیا اس کا علاج چشمِ ساقی بھی ہے پیمانے کے ساتھ
 تر فرما دے یہ رازِ بیاں فاش کیا کہ شکستِ دل کسار نہیں کوہِ گمنی
 لئے روش! پاس وضع میں شامل احترامِ تعمیرات بھی ہے
 دیا بلالہٴ دغل بھی نہیں مقامِ سکون ہنوز گرم سفر کا ردائِ شبنم ہے
 کمالِ تمہی محسوس ہے بے خبر ہے حیات ابھی تو شکوہٴ آغازِ تلخی غم ہے
 یہاں ہے وقتِ روش! اندر کمرِ تاج سکون اداسے دغب پریشاں کچھ اور ہم ہے
 ذیل کی تین غزلیں ان کے مطبوعہ مجموعے 'عجائبِ غزل' کے بعد کا کلام ہے:

زندگی کی بیچ دھم ہر گام پر ہمت شکن کام آتا ہے یہاں اہل جنوں کا بانگین
 حسنِ بے پروائی تو ڈا ہے تنہا کا ظلم جیلہٴ پرویز ہو یا سادگی کو کہیں
 کھل ہی جائیگا کبھی یہ لڑتے پر ہم نہیں! میں تو خود ہی پیر ہیں ہوں تمہیں بے پیر
 کس قدر رنگیں ہے انساؤں سے انکار کا ساغر گلِ رنگ و دستِ ساقی گلِ پیر
 رفتہ رفتہ ارتقا لئے حسنِ تنہائی ہوا اکِ تھیرے نہ خلوت ہے نہ کوئی انجمن

میں نے کیا کیا رنگ دیکھے دنواری کے دریا
 دل شکن، مینا شکن، ابیاں شکن، پہاں شکن
 میری خاموشی سے خوابیدہ تنہی روح کا اثنا
 میں نے اک نالہ کیا اور جاگ اٹھے دستِ بدست
 شک نہیں تیرے خلوص دوستی میں ہم نہیں
 آہ مجھ سے ہی گریزاں ہے مراد یوں نہ بن
 ہے مرے ہر لفظ کی تیرے مینا صدیوں کی سکوت
 حسن خاموشی سے سیکھے میں نے آداب سخن
 کیا یہ کہ دوں ہے مرے دل کی تباہ گرم شد
 اے نگار! اپناں تیرے ماتھے کی شکن

شامِ غربت میں کھلے اسرارِ بھنا، روٹا

مراؤں جھکا کیا پیادہ صبح و وطن

عاصلِ عمر، خراباتِ مغان کیا کہے
 ہوش آیا ہے تو آیا ہے کہاں کیا کہے
 ہے صنم خانہ کو نین نقاضائے سکوت
 شوخی، جھنڈاں بہائے تباں کیا کہے
 علمِ حاضر کی کہانی سے خوشی ہی بھلی
 کچھ جو کہنے تو بجز وہم و گماں کیا کہے
 سخن تھا، محتسبِ شہر سے مینا نے کا
 کیوں پریشاں ہے صفِ بادہ کشا کیا کہے
 لبِ جو، حلقہ گل، صبحِ صبا، فکرِ غزل
 اور مفہومِ حیات گدراں کیا کہے
 ہم تو ناداں تھے کو خلوتِ گہ دل سے نکلے
 کوئی غارت گر محفل ہے کہاں کیا کہے

حقِ دادا ہونے سکا راہ کے کانٹوں کا روٹا

ساتھ تھا قافلہ گل بدناں کیا کہے

ناز فرما ہے فروغِ شعلہ و خمارِ دوست
 سر جھکا دے اسے، جہمِ حسرت، دیرِ دوست
 عشق کہتا ہے کہ ہے دشمن کی غنواں ہی شیطاں
 یہ تو آساں ہے کہ کوئی دوست جو غنواں دوست
 حادثہ کچھ سخت گذرا ہے صبح و صحرے پر
 نرنگوں بیٹھے ہیں زیرِ سایہ دیوارِ دوست
 عشق نے سلجھا دیے سب زندگی کے بیج و غم
 یہ سلیقہ ہے عطائے گیسوئے خمِ دیارِ دوست
 حرفِ انکارِ محبت کی دل کو پری نہ پوچھ
 جیسے سج سج لگی ہو دولتِ اقربا دوست
 جان دیتے ہیں جو نادیدہ جمالِ یار پر
 دیکھ ان کو کبھی ذرا اسے طالبِ یارِ دوست

دگر دنیا، فکر معنی، گرم ہونے اس شغل میں زندگی کو ہم نے سمجھا اہتساہم کار دوست
 اصرار جو پہلے نیازی میں بہت یوسف ہیں ہک نہ پاس، اب اسے دل سیرا زار دوست
 حسن تہذیب غول کچھ اور ہے اے نیکو دل جا کہیں سے لاجنونِ شوخی گفتار دوست
 زندگی کی رات آنکھوں میں کئے گئے رُخ سہل مت جانو پیامِ وعدہ دیدار دوست
 مجھ سا آشفہ نداد مصرعہ غالبِ دشمن

کچھ نہ کچھ کہنا پڑا آخر کہ تھا اصرار دوست

عقیل جعفری خیر آبادی، سید عقیل احمد

مشہور مصنف اور صحافی رئیس احمد جعفری (ف ۱۹۶۸ء) کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا سالِ ولادت غالباً ۱۹۰۶ء تھا۔ اگرچہ مسقطاً (از اس سبب) پڑھا، لیکن ان کی پرورش اپنی مائیں خیر آباد کی مردم خیز بستی میں ہوئی۔ والد سیدنا طر حسین کا ان کی کمسنی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے یہ دونوں بھائی خیر آباد چلے گئے، مشہور شاعر خمریات ریاض خیر آبادی (ف ۱۹۳۴ء) ان کے نانا سید شہزاد احمد کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، انھیں دونوں کی نگرانی میں عقیل احمد اور رئیس احمد کی تعلیم دے رہی ہوئی۔ لیکن چونکہ والد کے انتقال کے بعد گھر کی مالی حالت سقیم ہو گئی تھی، اس لیے تعلیم پر کافی توجہ نہ دی جاسکی۔

شروعات میں سیاست سے دلچسپی رکھی اور خیر آباد میں بورڈ کے چیرمین بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی خانوادگی روایت اور اصول کے زیر اثر جلد ہی شعروادب کی طرف آ گئے۔ اس کے بعد کھنڈ میں منتقل قیام اختیار کر لیا۔ ایک مدت بعد ۱۹۴۵ء میں سبھی چلے گئے، جہاں رئیس احمد جعفری پہلے سے مقیم تھے جب تک تقسیم ہوا تو یہ بھی ان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہاں انھوں نے کراچی میں محمد علی اکیڈمی قائم کی تھی۔ خیال تھا کہ اسے نشری ادارہ بنائیں گے۔

لیکن بعد کو اسے نہیں احمد کے سپر کر دیا، اور اپنے لیے ایک اور بکٹ پونہ لیا وہیں کراچی میں ۲۶ جنوری کی، دینی شب میں انتقال کیا۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف غائبانہ نشر یا ضمنی خبر کا دی تھی جو حیدر آباد کے کسی ناشر نے شائع کی تھی کراچی کے زمانہ قیام میں تین چیزیں شائع ہوئیں۔ مکالمات، ابوالکلام، جوش و ہوش اور مجموعہ کلام جوش و ہوش، قطعوں، لہروں، مایوں کا مجموعہ ہے جوش طبع آبادی کا احوال اور زندگی، الم نشر ہے وہ ان موضوعات پر وقتاً فوقتاً مباحثے سے لکھتے رہتے ہیں عقل نے انھیں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ منتشر اور غیر مرتب شکل میں موجود ہے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے

ذیل میں نمونے کے طور پر ان کی چار دہائیوں دی جا رہی ہیں جو انھوں نے جوش کے جواب میں کہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جوش ہی کے الفاظ میں رد و بدل کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا جذبہ حقیقت دین اپنی جگہ لیکن وہ بات کہاں مولوی مدنی کی سی:

مرتے ہیں ترقی پہ فنا کے بندے انسان ہیں یا حرص و ہوائے بندے
چل اور دکھا راہ مستقیم اُن کو اے حسن تقویم، خدا کے بندے

اے ملحد، بے عمل، محسب دیں! اے جنس ارضی میں جہنم کے کیس
سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے والے تجھ کو بھی نہیں قرب قیامت کا یقین

جب حشر کی تردید ہی کرتے گوری تو کس لیے عمر آپ کی ڈرتے گوری
کچیے، اس کا سہی جہنم میں شمار جو عمر کہ بے بے کرتے گوری

دوقن ہوئی بانگ جس اے ساقی! وہ آگیا اب عرش، بس اے ساقی!
صد شکر ہوا خاتمہ بالآخر، عقل! باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی!

دکیل اختر، دکیل احمد اختر خان

اس جوان سال ادیب کا ۹ فروری ۱۹۷۱ء کی دوپہر کلکتہ میں انتقال ہوا۔ اور انوس اس طرح ایک اور بے گھلا غنچہ باورجی الف ک نذر ہو گیا۔

ان کا اصلی نام عقیل احمد اختر خان تھا، لیکن بعد کو کسی وجہ سے بدل کر عقیل کی جگہ دکیل لکھنے لگے۔ ان کے والد کا نام سحان خان تھا۔ دکیل اختر ایک قریہ پتھوری (ضلع گجرات) بہار میں ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی۔ یہاں سے کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ سے ۱۹۵۲ء میں اسکول فائنل کرنے کے بعد سنٹرل کالج کلکتہ سے بی اے اور پھر اسی یونیورسٹی سے تاریخ و تمدن اسلامی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ کینسر کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بظاہر ٹھیک ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرض جڑ سے نہیں گیا تھا۔ ایم اے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول کلکتہ میں پڑھانے لگے؛ چندے بعد ۱۹۶۷ء میں کلکتہ مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں مرض عود کر آیا اور ادب کے جان لیوا ثابت ہوا۔

شاہزی کا کالج کے زمانے میں شروع کی، اور آغا میں لپکے کالج کے استاد پروفیسر عباس علی خان

بجود (۱۹۶۹ء) ہی سے اصلاح بھی لی۔ بعد کو انہوں نے اپنے آپ پر اعتقاد کو کے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جدت اور نیا آہنگ ہے۔ آگے بڑھنے کے بہت امکانات تھے۔ اگر زندگی دفا کرتی، تو یقیناً ترقی کرتے، لیکن موت کسی کو مفر نہیں۔ مجبوراً کلام ان کی زندگی میں رتبہ نہیں ہوا، اور غالباً کلام مقدّم میں کچھ زیادہ بھی نہیں۔ ان کے احباب اسے سمیٹ کر 'دائروں کی شکست' کے عنوان سے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

مردوں مسجدوں اور گرجوں شوالوں کو تم

جس طرح چاہو سمار کو در

اس لیے کہ

تم تو درازوں سے

کتنے معبود کتنے معابد بناتے۔

— مثالتے، مثالتے بناتے چلتے آرہے ہو

اس لیے کہ تمہیں اب

خلاؤں میں بھی تھر سازی کا فن آچکا ہے

مگر اپنے ذہن رسا

زعیم تحقیق و تخلیق سے پوچھ کر یہ بتاؤ

رد زاول سے اب تک

خون کا کوئی قطرہ بنایا ہے تم نے؟

گو کوئی راہبر نہیں ہوتا کارداں در بدر نہیں ہوتا

ہم نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں جن کے چہرے پر سر نہیں ہوتا

صرف درسی کتاب پڑھنے سے آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا

سنگ وہ پھینکتا ہے اور دلوں پر	جس کا شیشے کا گھر نہیں ہوتا
پچ کا پودا انگھا کے دیکھ لیا	اس میں کوئی ثمر نہیں ہوتا
دوسروں پر کیا کوہ تنقید	تم سے کچھ اور گھر نہیں ہوتا
ہائے وہ لوگ جن کی نظروں میں	فرق عیب دہن نہیں ہوتا
حسن والوں پہ کچھ نہیں موقوف	کون اب خود گھر نہیں ہوتا
خرد کی آندھیاں ان کا غافل اپنی غجوریا	تفاؤں کی کوہِ حمزہ کہتے ہم تو کیا کرتے
منکر عیش و طرب ہے، یا ردا!	دل کا اب حال کھج ہے، یا ردا!
نہ غیر بھائے نہ اپنا لگے سبھلا مجھ کو	سے شعور نے کیا بنا دیا بھر کو
کوئی سبب ہو، سر نہ گہر جو بیٹھا ہوں	بھو دے ہو، تو بھوشکتے پا مجھ کو
اب نیند کہاں آنکھوں میں شعلہ سا بھرا	یہ تپتے ہوئے ہونٹوں کو تکیے کی سزا ہے
یوں تو تنہائی میں گھبراتے بہت	دل کے لوگوں سے بھی پھپھکاتے بہت
عجب خاموشی اس کے ہونٹوں پہ کبھی	عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا
دندگی دستِ تہِ سنگ رہی ہو برسوں	یہ زمیں ہم پہ بہت تنگ ہی ہو برسوں
یہ نہیں معلوم کہ کیا بات تھی	رور ہے تھے میرے مہلے بہت
کبھی صورت کوئی صورت نکالو	مجھے بے موت مرنے سے بچا لو
اس شخص کے علم کا کوئی اندازہ لگائے	جس کو گھبرا رہتے ہوئے دکھائے کسی نے
ہر قدم راہِ طلب میں دل پہ کتنا جلے ہو	جو خود سے شور لے ہو وہ دھوکے کھائے ہو
جو بھی کوٹنا ہو وہ کوٹ کر رڈیل کی رلے ہو	سوچنے والا ہمیشہ سوچتا رہ جائے ہو
یا وحشِ یار میں اس دل کی کیفیت نہ پوچھ	آگینہ تندی صبا سے پگھلا جائے ہو
اس کی بزمِ ناز سے آخر اٹھو کہ جس جگہ	وں لگے ہو جیسے دل سینے میں میٹھا جائے ہو
وہ آجکل جائے تو اس کو کہاں بٹھاؤنگا	میں اپنے گھر میں تو رہنا ہوں گھروں کی طرح

میاں بشیر احمد

لاہور کے مصافات میں ایک قصبہ بانچا پورہ ہے۔ یہاں کی میاں فیملی اپنی وجاہت، ترقی پسندی اور ملکی خدمات کے لیے معروف ہے۔ اسی خاندان کے ایک لگی سرسبز میاں شاہدین عیالوں میں سے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں پنجاب چیف کورٹ کے جج رہے تھے، اس لیے عام طور پر آؤرینٹل ججس میاں شاہدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ جسٹس شاہدین کے والد مولوی نظام الدین بٹے فیصلہ فرارگ تھے اور دلاور مولوی قادیان جیل خانہ عالم اور ہمارے ہجرت سنگھ کے عہد میں شاہی خاندان کے نوہاؤں کے استاد اور تالیف رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، نادر تخلص تھا۔

جسٹس شاہدین بھی شعر کہتے تھے، عیالوں ان کا تخلص تھا۔ ان کا مجموعہ کلام 'جذبات' ہے۔ ان کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے شائع کیا تھا۔

جایوں کا ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا۔ اقبال نے تاریخ وفات لکھی:

دہلگان ہر ہمایوں نکتہ سنج آمد مثالِ شبنم و چوں پوے گل و مید
می حُبتِ عندلیب خوش آسنگ سالِ بزمِ غلامِ نصیح ز ہر چارہ سُو شنید

انہیں میاں شاہدین کے اکلوتے بیٹے میاں بشیر احمد تھے، جن کا بھی کھیلے دنوں ۳ مارچ ۱۹۷۱ء شام کے وقت لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ۸۷ سال کی عمر تھی۔ میاں بشیر احمد مرحوم کے ساتھ گویا ہماری پھلی نسل کی شرافت اور منانیت، وضع و تدوین اور خدمت و نوازی کا جنازہ اٹھ گیا۔ اٹالک ڈاکٹر ابیدار رحمن۔

میاں بشیر احمد ۱۶ مارچ ۱۸۹۳ء کو اپنے خاندانی مکان بابا غیاث پورہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تعلیم کے ابتدائی مراحل لاہور میں مکمل کیے۔ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کالج (لاہور) سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد ولایت چلے گئے۔ وہاں داؤد حم کالج، اکسفرڈ سے ۱۹۱۲ء میں بی اے (آنرز) (مادینچ) کی سند لی، بعد ازاں سال کے تاریک کے تمام طلبہ میں اول آئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں لندن سے پیرسٹری کا امتحان دیا۔ اس میں کامیابی کے بعد واپس وطن چلے آئے۔ اولاً چندے یہاں اعزازی طور پر اسلامیہ کالج میں تدریس پر تھاتے رہے تھے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ زار تخلص تھا۔ پہلے تہذیب و ادب کے پردے میں سر عبدالقادر (دف ۱۹۵۰ء) کے اہنمائے سخن میں نثری مضمون بھی لکھتے رہے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں اپنے والد مرحوم کے تخلص کی مناسبت سے ماہنامہ دہلیوں جاری کیا۔ اس کے سرورج یہ شعر چھپتا تھا جو ہمایوں مرحوم ہی کا تھا:

اٹھو، وگڑد حشر نہیں ہوگا بھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہمایوں ہماری زبان کا صنفِ اولیٰ کا رسالہ تھا۔ کیا یہ کچھ کم اقدار کی بات ہے کہ اس میں کوئی ایسی نظم یا غزل کبھی نہیں چھپی، جس میں لفظ 'بوسہ' استعمال ہوا ہو یہی احتیاط اور رکھ رکھاؤ میاں بشیر احمد کی پوری زندگی کی علامت ہے۔ ہمایوں ۳۵ سال تک اردو کی شاندار خدمات سر انجام دینے کے بعد ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا۔

میاں بشیر احمد نے اردو کی ترویج کے لیے ۱۹۳۶ء میں انجمن اردو پنجاب کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا اصل مقصد نوجوانوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق کا شغف پیدا کرنا تھا۔ وہ مختلف اوقات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رکن، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے فیلو (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء) انجمن ترقی اردو کی منتظم کے رکن بھی رہے۔

یہ زمانہ سیاسی ہنگاموں کا تھا اور پھر ان کے خاندان میں تو سیاست اور مسلم لیگ کے دن رات چرچے رہتے تھے۔ سر میاں محمد شفیع ان کے چچا اور خسرینہ دگوار تھے۔ (ان کی بیگم گیتی آزاد سر محمد شفیع کی چھوٹی صاحبزادی اور جہان آرا بیگم شاہ نواز کی چھوٹی بہن ہیں)۔ مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور کی دیکھیں پاکستان کی قرار داد منظور ہو گئی تھی۔ مجلس انتظامیہ کے سکریٹری میاں بشیر احمد ہی تھے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کی مرکزی عاملہ کے رکن بھی رہے، ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء پنجاب مجلس واضح قوانین کے رکن بھی تھے۔ خیر حیات خاں نواز کی وزارت کے خلاف تحریک میں بھی شریک تھے، اور اس سلسلے میں نوبت قید و بند تک پہنچی تھی۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد وہ ۱۹۴۹ء میں ترکی میں اپنے ملک کے سفیر مقرر ہوئے۔ ترکیا اور پاکستان کے درمیان دوستانہ معاہدے پر انھیں کے عہدِ سفارت میں دستخط ہوئے تھے۔

انھوں نے ابتدائی ایام میں آج سے کوئی چالیس سال پہلے، اپنے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ فلسفہ زندگی کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں روزمرہ کے واقعات کو بصیرت افزا و نصابی انداز میں لکھا گیا ہے، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ کتاب کی فائبر ہر شکل و صورت بھی بہت دلیرانہ تھی، جوان دونوں اردو کتابوں کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ اپنے والد کی سوانح عمری انگریزی میں مرتب کی تھی، اس میں ان کی تقریریں بھی شامل ہیں۔ ایک کتاب کا نام اسلام بھی ہے۔ اسلامی سیاست سے متعلق بھی، مسلمانوں کا فاضل اعمال اور مستقبل، ایک کتاب موجود ہے۔ مضامین کا بہت بڑا ذخیرہ، بابوں کے صفحات میں محفوظ ہے۔

اولادِ جہانزیں ایک بیٹا (منظرِ شیر) اور دو بیٹیاں (رفعتِ جہان اور ثروتِ جہان) ان سے یادگار ہیں۔ انتقال ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور کے مکان (انتظر) میں ہوا تھا لیکن لاش اگلے دن (۴ مارچ) باغیاںچودہ گئی۔ جہاں ان کے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

عبدالقادر سرودی (پروفیسر)

پروفیسر عبدالقادر سرودی صاحب کے والد حاجی محمد سرڈو، ام عامرہ، حیدر آباد میں بحیثیت متاوقف شاہرے (غالباً پورہ روپے) پر ملازم رہے۔ یہاں ان کے ذمے وظیفہ خواروں کے ۳۴ بچوں کے کام سپرد تھا۔ اس قلیل آمدنی پر بھی قناعت و خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سرودی صاحب ان کی دوسری بیوی کے بطن سے ۱۹ اگست ۱۹۰۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی واردہ کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے علاقائی بھائی مولوی محمد حنیف سے پائی۔ اسکول چلنے کے قابل ہوئے، تو مختلف مدارس سے ہوتے ہوئے بالآخر شی بان اسکول سے دیوبند دہلی کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ۱۹۲۷ء میں ایم اے (اردو) اور ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی (یعنی وکالت) کے امتحان پاس کیے۔ ایم اے میں مرحوم ڈاکٹر شیخ الدین قادری زور۔ ان کے ہم جماعت تھے۔ انیورسٹی میں اس وقت صدر شعبہ اردو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف ۱۹۱۸ء) تھے؛ ڈاکٹر سید سجاد (ف) کراچی ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء بھی یہیں تھے۔ اسی سال سلیم نے بیماری کے باعث لمبی رخصت لی تھی اور ان کی جگہ مولوی عبدالحق صدر شعبہ مقرر ہوئے تھے۔ سلیم جانت دقت۔ نقارش کر گئے کہ

سروری صاحب کو شعبے میں مددگار پروفیسر مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ سروری صاحب اسی سال جامعہ عثمانیہ میں مددگار پروفیسر اردو کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اس طرح اب انھیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ یہاں ۱۹۴۲ء تک رہے۔ ۱۹۴۲ء میں سروری صاحب کا میسوری یونیورسٹی میں شعبہ اذوق کی صدارت اور پروفیسری پر تقرر ہو گیا۔ انھوں نے اپنے چھ سالہ دوران قیام میسوریہ میں یونیورسٹی میں اردو کی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے بہت کام کیا۔ ایم اے کے درجے کھلوائے، جس سے شعبے کا کام وسیع تر ہو گیا۔ اردو کے نصاب کے لیے کتب تیار کر دیں، تاکہ تعلیم کا معیار بلند ہو۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی ماوراءِ قلعہ میں صدر شعبہ کی جگہ خالی ہوئی، تو اس کی میکانکس انھیں کی گئی، جس پر وہ حیدرآباد واپس آ گئے۔ وہ تیرہ برس بعد ۱۹۶۲ء میں یہیں سے پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا سرٹیکر میں انتقال ہو گیا۔ جہاں وہ جون ۱۹۶۱ء سے اردو اور فادائی کی پوسٹنگ پر بحیثیت شعبہ کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اب اصحابِ مجاز کی نظر انتخاب سروری صاحب پر پڑی، اور یوں ۱۹۶۲ء میں وہ سرٹیکر منتقل ہو گئے۔ یہاں سے وہ مجازوں کی تعطیلات کے ڈانے میں اپنے وطن چلے آتے تھے چنانچہ اب کے بھی یہی اور حیدرآباد میں قیام رہا۔ وہ ۵ مارچ کو حیدرآباد سے سرٹیکر کے نیچہ روانہ ہوئے۔ راستے میں دہلی اور جموں قیام کیا اور ۹ مارچ کو سرٹیکر پہنچے۔ اگلے دن (۱۰ مارچ) یونیورسٹی گئے۔ اسی رات دل کا دورہ پڑا اور جھک ٹھہرتا ہوا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۶۱ء رات ساڑھے دس بجے اللہ کو پیار سے ہوئے۔ ۱۲ مارچ قبل از نماز جمعہ جنازہ اٹھا اور ان کے سکون (دھوا ہرنگ) کے قریب ہی ایک دیوان سے قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جناب نور اللہ حیدر آبادی (علیہ السلام) نے ان کے تخریج سے حسب ذیل آؤنچ وفات کہی ہے:

وہ لایبِ تابور، وہ سپیکرِ خلق و کرم ہے بجا اگر اس کے غم میں خون آنکھوں سے ہے
تو بس وہ اور جی جاتے، تو ہوتا سال یہ عبد قادر سروری کثیر سے جنت گئے

انہوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ان کی طالب علمی کے زمانے (۱۹۲۶ء) ہی میں ہو چکی تھی لیکن یہ بیگم ڈیڑھ سال بعد اپنے بیچے ایک دودھ پیتی بچی چھوڑ کر اسخ مفارقت دے گئیں۔ زبیدہ کثوم ایم۔ اے (عربی) جو ذبیحہ آبادیالہ، حیدرآباد میں عربی پڑھاتی ہیں، وہی بچی ہیں۔ دوسرا نکاح انہوں نے بہت دن بعد ۱۹۳۳ء میں کیا تھا۔ ان سے بھی ماشاء اللہ زمین لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار ہیں۔

سروری صاحب کو اردو تصنیف و تالیف کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ سلیم مرحوم اپنے طلبہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ہونہار نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ زود اور سروری کا تصنیفی شوق سلیم ہی کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھا۔ بلکہ سروری صاحب نے اپنے والد کے نام کی رعایت سے سروری کی نسبت بھی سلیم کے ایسا پر اختیار کی تھی۔

سروری صاحب کی سب سے پہلی تصنیف ”دنیاے افسانہ“ ہے، یہ انہوں نے ایم اے پاس کرنے کے بعد شائع کی تھی (حیدرآباد، ۱۹۹۲ء)۔ اس کا دوسرا حصہ بعد کو شائع ہوا (۱۹۲۹ء) جس میں ”کوہ اور افسانہ“ سے متعلق بحث ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے بعض احباب سے دوسری زبانوں سے منتقل کردہ کہ افسانوں کے چار مجموعے بھی شائع کیے تھے: ”قدیم افسانے“، ”پہلی اور جا پانی افسانے“، ”افتخار الدین و فیض محمد“ (۱۹۳۰ء)؛ ”انگریزی افسانے“؛ ”فرانسیسی افسانے اور عربی“ (۱۹۳۲ء)۔ وہ ایک زمانے تک حیدرآباد کے ماہنامے مکتبہ کے مدیر رہے تھے۔ یہ افسانے پہلے وقتاً فوقتاً وہیں شائع ہوئے؛ بعد کو انھیں کتابی شکل دے دی گئی، جب وہ شہانیز و نیوز کے شعبہ اردو سے منسلک ہوئے؛ تو انہوں نے ”جدید اردو شاعری“ تصنیف کی (۱۹۳۳ء)۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب حالی کے ”مقدمہ شعری شاعری“ کا متمم ہے۔ یہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دلی اور لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

اسی زمانے میں جہانگیر خانانہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی انجمن طلبہ سائنس قائم کی تھی؛ اس کا اپنا مجلہ بھی تھا۔ شروع میں غالباً پانچ برس تک (۱۹۳۴ء - ۱۹۳۶ء) زور مرحوم اس کے مدیر رہے۔ اس کے بعد ایک سال (۱۹۳۲ء) یہ سرودی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر زور ادراک ۱۹۳۱ء میں یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے اور جہانگیر خانانہ کے شعبہ اردو ہی میں ان کا بھی تقرر ہوا۔ جیسا کہ بیان ہوا، مولوی عبدالرحمن اس زمانے میں صدر شعبہ تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری اور انجمن کے شہرہ آفاق مقامی رسالے اردو کے مدیر بھی تھے۔ خدا معلوم کیونکہ، دکن کے ادیبوں کو یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ مولوی صاحب موصوفت مقامی مصنفوں کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ زور اور سرودی کے زمانہ طالب علمی سے باہمی دوستانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے اس خیال کو ہوا دی اور اپنے احوال کے ساتھ شورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ دکن اور دکنیات اور دکنی ادیبوں کے فروغ کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت جنوری ۱۹۳۱ء میں ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے اولین بانی پانچ شخص تھے: ڈاکٹر محمد الدین قادری زور (دستمبر ۱۹۶۲ء) پروفیسر عبدالقادر سرودی پروفیسر عبدالحمید صدیقی، نصیر الدین اشقی (دستمبر ۱۹۶۳ء) اور مولوی عبدالقدیر صدیقی، مدرس شعبہ دینیات جہانگیر خانانہ (دست ادراک ۱۹۳۲ء)۔ کہا نہیں جاسکتا کہ ان صاحب کاشک و شبہہ محض حد تک جائز اور صحیح تھا۔ لیکن پچھلے ۳۰ سال میں اس ادارے نے اردو کی ترقی و ترویج، تصنیف و تالیف اور مخطوطات کے تحفظ و ترمیم کے سلسلے میں جو شاندار خدمات سر انجام دی ہیں وہ تاریخ ادب اردو کا روشن باب ہیں اور اردو ادب کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔

ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے سرودی صاحب کی یہ کتابیں شائع ہوئیں: سراج

کے کلام کا انتخاب 'سراج سخن' (۱۳۵۵ھ) 'سراج' اور اس کی شاعری 'اردو شاعری کا ارتقاء' (۱۹۴۴ء)؛ افسانوں کا مجموعہ 'رات کا بھولا اور دیگر افسانے' (۱۹۴۲ء)؛ اردو کی ادبی تاریخ (۱۹۵۵ء)۔ ایک کتاب 'زمان اور طر زمان' 'مجلس تحقیقات' حیدرآباد نے شائع کی تھی (۱۹۵۶ء)۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اہم پارسا ل شائع ہوا ہے۔

نواب یوسف علی خان سالار جنگ سوم (د ۱۹۴۶ء) حیدرآباد کے شہنشاہ امیر تھے۔ سالار جنگ میوزیم انھیں نے حج کیا تھا۔ وہ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے شہسوار اور پارکھ تھے؛ دکنی زبان کے کئی انول رتن اپنے کھا بھانے میں حج کے تھے۔ بعض احباب کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۳۵ء میں 'مجلس اشاعت' دہلی مخطوطات قائم کی جس کا مقصد اس کے نام سے عیاں ہے۔ سروری مرحوم بھی اس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے اس مجلس کے لیے یہ کتابیں مرتب کیں؛ پھولین از ابن خضامی (۱۳۵۵ھ) قصہ بنظیر از صنعتی (۱۳۵۷ھ) کلیات سراج (۱۳۵۷ھ)۔

انھوں نے اپنے قیام میور کے زمانے میں نواب حیدر علی خان (د ۱۹۴۲ء) کے منش و کتاب رائے سبقت کی بیاض 'مہتاب سخن' کے عنوان سے مرتب کی تھی۔ میور میں ایک صوفی بزرگ شاہ صدر الدین گذرے ہیں۔ ان کا تصنیف کردہ ایک رسالہ 'مرآة الاسراء' دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔ سروری صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

سرنگو کشمیر کے قیام کا شرف تین کن میں تھیں؛ کشمیر کے دو ادیب 'دوبھائی' 'پنڈت برگر پال' 'نستہ' اور سالک رام سالک (حیدرآباد ۱۹۶۵ء) اور کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ و حیدرآباد ۱۹۶۸ء)۔ انھوں نے ریاست کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ آخری ملاقات کے دوران میں انھوں نے بتایا تھا کہ تقریباً ۱۰۰ صفحات لکھے جا چکے ہیں؛ اس کا سودہ کلر اکیڈمی، سرنگر کی تحویل میں ہے۔ اسے جلد شائع کر دینا چاہیے۔

قیس بناری، منشی شیو مورت لال

ان کے بزرگوں کا وطن ضلع جوینور کا قصبہ منڈیاہوں (ضلع جوینور) تھا۔ یہاں ان کی کچھ زمین تھی اور کھیتی باڑی ذریعہ معاش تھا۔ قیس کے والد منشی گنپت سہاسے تقریباً ایک صدی پیشتر اس گاؤں سے نقل مکان کوکے بنارس چلے آئے تھے۔ وہ قوم کے سربراہ استوار کا کُستہ اور پیشے کے لحاظ سے غرض نویس تھے اور اس فن کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس سے انھوں نے خاصی بڑی جادو پیدا کی تھی۔

قیس ۱۹۰۳ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کونز کالج پیچھے، لیکن یہ وہ زمانہ ہے، جب انگریزی حکومت کے خلاف ہماری جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ قیس نے بھی ترک مولات کی تحریک پر لبیک کہا اور تعلیم چھوڑ، کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، اس کے بعد تعلیم کا رشتہ پھر بھی استوار نہ ہو سکا۔

شعر و شاعری سے دلچسپی بھی اسی زمانہ میں پیدا ہوئی، لیکن صرف پڑھنے اور سننے کی حد تک۔۔۔ ایک مشاعرے میں اتفاق سے ملاقات بنارس کے مشہور اہلِ دل شاعر شاہ

لال صوفی (د ف جون ۱۹۳۶ء) سے ہو گئی۔ صوفی ہمارے (روح و ذریعہ) شری لال بہادر شاستری (د ف جنوری ۱۹۶۶ء) کے حقیقی ماسوں تھے؛ شاستری جی کی تعلیم تربیت بھی صوفی کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانے تک ڈسٹرکٹ جج ٹریسٹ کے جج کار بھی رہے تھے۔ صوفی خود رحمت بنارس (د ف ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء - ۱۹۸۱ء) تلیذ داغ کے شاگرد تھے۔ عرصہ ان جوان قیس کی صوفی سے ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اندر کی خوابیدہ شعری قوتیں بیدار ہو گئیں۔ انھوں نے قیس شخص اختیار کیا، اور صوفی سے اصلاح لینے لگے۔

چونکہ والد کے ترکے سے ابھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اس لیے فکر معاش ان کے شوق کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ شاعری اور شراب ان کے دو شوق زعدگی کے ساتھ تھے۔ انھوں میں کچھ پریشان سے رہنے لگے تھے۔ اس پر آتر پردیش کی حکومت نے ان کا ۷ روپیہ ماہانہ وظیفہ (ادبی) مقرر کر دیا تھا۔

انھوں نے کلام شائع نہیں ہوا، حالانکہ ضخیم کلیات موجود ہے۔ اگرچہ سب صنان سخن — غزل، نظم، رباعی، قطعہ — میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کا اصلی میدان غزل تھی۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء کو بنارس میں انتقال کیا۔ احباب اور شاگردوں کی بہت بڑا حلقہ ان کے سوگواروں میں ہے۔

ان کے کلام میں جذبے کی شدت اور دالہانہ پن ہے، جو اثر سے خالی نہیں۔ پڑھنے میں بھی ایک دائرہ شکی کلام تھا۔ چند شعر سنئے:

میری میناے تغزل سرفراز آرزو
اب تو میں آہی گیا ہوں آستلنے پر تے
کتنے جذبے موجود ہیں دیدہ دل میں تے
تیرے جلوے میرے مجھ سے تیرا عالم لبرول

اے بت ایماں شکن! کیا ہے یہ راز آرزو؟
کچھ بھی دے کیونکر ادا ہوگی نثار آرزو!
کتنے نفوس سے بھرا ہے میرا سا ز آرزو!
اس پہ بھی ہوتا نہیں ہے امتیاز آرزو

میں رہی ہوں قیاس جو تیری بدولت کج بھی ہر حقیقت کو سمجھتا ہے مجاز آرزو

اے قیاس! ڈھٹے کا ہر اک جام ہے جا کچھ بھی تو نہیں گود میں آیام، پیے جا
مگر ترک خودی، صبح سے تا شام پیے جا اک نعرہ مٹانے ہے انجام، پیے جا
جس زیت میں کچھ غم نہیں وہ ذریعہ تیرا ہر سانس تجھے دیتا ہے پیغام، پیے جا
تیرے ہی لیے ساری فضا جھوم رہی ہے تیرے لیے ہے وجد کا ہنگام، پیے جا
تجھ کو تو ناامنی کی صدا ڈھونڈ رہی ہے منصور کے سایے میں سرگم، پیے جا
ان ہوش کے بندوں میں ترا نام نہیں ہے گنام ہی اچھا ہے، تو گنام، پیے جا

نگاہ تو نے ڈال دی تو زندگی نئی ملے بنگاہ تو نے بھیر لی، فنا ختم ہو گیا
جفا پرست و دست کو دفا پرست کیا کرنا مزاجِ سخن ہی تو ہے بول گیا بول گیا

اگر شوخِ حشمت ہے، تو زندگی حسین ہے خوشی لی، تو کیا ہوا، جو غم ملا تو کیا ہوا

اے مری جان تغزل! اک ادائے لبری اب تو ایمانِ محبت ہے، نگاہ کا ذری
اے مری جان تنہا! اے مری جان نظرا قبلہ تسلیم تیری خود نشانی، خود سری
پھر تری سوچ شہبش کی طوط رتھال ہوں پھر فریب آما ہوئی تیری نگاہ ساری
پھر مجھے لے جا کے اکل منزل پہنچا ہے جہا ہر نظر ہے فتنہ پرور، ہر اد اجاد مگر ہی

ہم اہلِ غمِ مات کو حیات کہتے آئے ہیں ستم کی ہر اد اکو لغات کہتے آئے ہیں
خوشی لی خوشی ہی، جو غم ملا تو غم سمجھی تھاری دین کو تبرکات کہتے آئے ہیں

- ذکرۃ حاضرین

جہاں کے اترے میں تھا دامن ہنسنا اسی جہاں کو اگلے بے ثبات کچھے نہیں
جہاں کو ساتھ میں لیے بغیر دی کے ساد پر ہمیشہ تھیں اپنے دل کی بات کچھے آئے ہیں
ستفراق اشعار

نہ پا کر مجھ سے ابھی صبح زندگی کیا ہے کچھے جازو تھا اسے دوست اپنی خامی کے لیے

پنیر مجھ آئے ہوسے جنت نازلی دوست مجھ ایسے نے اجنرے طبیعت ملی

اچھو دنیا قائم ہے اور کھ کو کافی امید نہیں جہاں کو خلاوتی ہے قسمت میری وہ حید نہیں

ناچار گلوں کے دامن میں یہ رات بسر ہو چکی جب سچ کی کنیں چوہنگی اُسے نظر و شبنم کیا ہوگا

مٹتے نہیں مزاج دل کو بیقرار کے دیو اور جہکے کہ وہ ماتم نے پکار کے

انہیں کو پیار کیا میں نے تیرے دھوکے کا جہاں جہاں تری پرچائیاں ملیں مجھ کو

مریم دھست کی پکار آج بھی ہو اس طرح عین ایتھرے صلیب کی رات بہت ڈاؤں ہے

اختر تلہری، سید اختر علی

ضلع شاہجہاںپور میں ایک قصبہ تلہر ہے! یہیں مشہور سادات کے ایک متادریسی گھرانے میں ۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے خاندان کے ماحول اور مقامات کے پیش نظر ہی رہی اور اس میں تخیل کے ورے تک پہنچے۔ وہ مدرسہ عالیہ مامہد کے فارغ التحصیل تھے۔ عربی، فارسی کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اتنی اچھی مہارت پیدا کر لی کہ انگریزی کی اعلیٰ اور دقیق کتابوں سے بلا تکلف استفادہ کر سکتے تھے۔ ان تینوں زبانوں میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ فریڈرک ماسٹن مدرسہ تھا۔ وہ ۱۸ برس تک جوہلی کالج، لکھنؤ میں پڑھاتے رہے اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ فلموں کی انھیں سازگار ماحول میں رہنا اور ان کی قابلیت اور چوڑائی طبع کو اپنے جوہر دکھانے کے لیے پورا امید ان کے ملازمین میں پانچو کے وہ محنت اور ادیبانہ نفاذ اور ماہر لفاظی تھے، ہماری زبان کا دامن ان کی نگارشات سے مالا مال ہو سکتا تھا۔

جوہلی کالج میں ان کے ہمدردوں میں حامد اشرف (اردو) اور علی عباس حسین (تالیف)

اور خواجہ اظہر حسین (انگریزی) تھے۔ خواجہ اظہر حسین نے ایک زمانے میں مالدار ادب (کھنڈو) میں کچھ مزاحیہ مضامین بھی لکھے تھے، جن میں سالی، سرور، سہا، وغیرہ نے خاص شہرت پائی۔ ادب کے ایڈیٹر اعظم حسین تھے۔

اس زمانے میں میسجیوں میں دو فرقی ہو گئے: علماء اور جدیدی۔ اختر، مجد، آزاد خیال تھے اور قدامت کے مخالف؛ چنانچہ انھوں نے جدیدی گروہ کی تائید کی۔ اظہر حسین اور علی عباسی حسین بھی اس میں ان کے ساتھ تھے۔ انھیں آیام میں اظہر حسین نے منجر سے کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں روایتی نظریے سے انحراف تھا۔ اس کا جواب خلیجیوں کے کالج سلطان الدار اس کے مدرس مولوی سید عبدالکئین منطقی نے دیا۔ پھر تو سخت رن پڑا۔ اس مناقشے میں اظہر حسین کو ساما مولانا خیر صاحب نے ہٹا دیا تھا۔

اگرچہ حکومت کے ملازم تھے، لیکن شدید قوم پرور، مدتوں روزنامہ سرفراز (کھنڈو) میں "سترو لبرال" عنوان کا مزاحیہ کالم "محل انشاں کے قلم سے" لکھتے رہے۔ حسین بھی کبھی کبھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان مضامین میں یہ فکری کمی محسوس ہوئی کہ حکومت کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ سرفراز شیعہ کانفرنس کا اخبار تھا، اور خواجہ اسد اشرف اس کے ایڈیٹر تھے۔ کانفرنس میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا اور وہاں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس کشمکش میں اسد کی نوکری کے ماتھے گئی۔ اسد نے خیال کیا کہ اختر اور حسین بھی ان کے مخالف ہیں۔ انھوں نے برلین کی خاطر ان کے وہ مسودات جن میں ان لوگوں نے حکومت پر کٹہہ چینی کی تھی، حکومت کے حوالے کر دیے۔ پھر کیا تھا، تھلک چ گیا اور دونوں ملازمت سے الگ کر دیے گئے، شیعہ رؤسا کا حکومت میں بہت رسوخ تھا۔ ان کے دوستوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ بارے، حکومت نے برطانی کا حکم واپس لے لیا اور بات تبادلے پر ٹل گئی۔ حسین غازی پور بھیجے گئے اور اختر شہر ہما پور۔

وہ مدتوں سرفراز میں "محاسبے" کے عنوان کے تحت "مبصر" کے نام سے تبصرے اور

علمی ادبی بحکات بھی لکھتے رہے۔ لغت پر اس کی قدردانی اور حفاظت بے پناہ تھا۔ راج کے دیکھے بغیر قلم برحافہ ایسا قتلِ دولِ نکتے تھے کہ اعتراض کسی کے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے کئی شعر کے یادگار ہیں، جن میں علامہ اشرف احمد مجنوں گورکھپور سے حقیقت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

مذہب کے بارے میں ان کی رد و اداری مغربِ اخل تھی۔ اختلافِ خواہ ملک کے دو طبقوں میں ہو یا مسلمانوں کے دو گروہوں میں، وہ ان دونوں کے مخالف تھے۔ ان کی تحریریں اس نظریے کی ترجمان تھیں۔ ان کی کتابیں ابتلائے عظیم (۱۹۲۵ء)؛ شہادتِ عظمیٰ (۱۹۳۵ء)؛ مذہبی تصورات (۱۹۵۳ء)؛ علمی تصورات (۱۹۵۳ء)؛ مولانا شوکتی کا اسلامی نظریہ سیاست؛ شعر و ادب؛ تنقیدی شعور (۱۹۵۷ء)؛ مقالاتِ تلہری؛ اٹھانگریزی کتاب آئیڈل کنگ جہاں ان کے علم کی وسعت کی آئینہ دار ہیں، وہیں ان کے فکر کی گہرائی پر بھی برانِ قاطع ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین مختلف رسائل و جرائد میں نشر ہوئے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری اور فلسفے پر انھوں نے بہت اہم سلسلے مضامین قلمبند کیا تھا۔ وہ عجیبی بھی شعور بھی رکھتے تھے؛ آخر تخلص تھا۔ انھوں نے مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

وہ بہت دن سے بیمار پئے آ رہے تھے۔ انھیں مدت سے فضا بدوم کا تکلیف دہ مرض لاحق تھا۔ اور جب اس کا دورہ پڑتا تھا، وہ ازکارِ رفتہ ہو جاتے تھے۔ پارساں اپریل میں دل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ جب حملہ ہوا، تو بلراپور اسپتال، کمبھو میں علاج کی غرض سے داخل ہوئے اور اچھے ہو کر واپس مکان پر آ گئے۔ لیکن اب سیدھا ہاتھ اور پاؤں مفلوج ہو گئے۔ ساتھ ہی پیٹ میں ایک گلی خوداد ہو گئی، جو ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق سکنسٹر ثابت ہوئی۔ جب حالت خراب ہونے لگی، تو دوبارہ بلراپور ہسپتال چلے گئے وہیں بدھ کے دن ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء صبح پانچ بجے اپنے چھبے اشہ کو پیارے ہوئے۔ اسی

دن جسدِ خاکِ خاں بہا پور منتقل کیا گیا، جہاں شام کو خاندانی قبرستان واقع ہے۔ محض
میں عدلیں محل میں آئی۔

وہ بیٹے آفتاب اختر، اندھیل اختر، اندھ ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔ بڑے
جیسے آفتاب اختر کا مدھی اختر کا کالج اٹار بہا پور میں تدریس میں۔ نوے کلامِ ملاحظہ ہو:
میر احمد و قہدی سنگ در جانا نہ ہے تو بہ! ذوقِ بادہ، رہنِ خیشہ و پیانہ ہے
سکر اتا ہی رہے جو حادثات و ہوا ایسا دیوانہ حقیقت میں بڑا فرزانہ ہے
پار ہے ہیں اس سے اک تازہ خیالِ پلِ چن وہ حرفے شور و شر کا فخر ستانہ ہے
ہے شہدائے وفا کی خاک اور کھڑکریے کیش اپنا بندگی مست مردانہ ہے
مقلد و اقل کے جنوں کی بدحواسی کچھ دیکھ ہے کبھی پیش نظر کبھی ہمت خاندانہ ہے
قولے خود ہی تو خیالِ ناسوا کو دی جگہ در نہ تیرا دل تو اس کا خاص مملوٹ ہے
کھول ڈالے باتوں ہی باتوں میں اسرارِ بیا یوں تو کچھ کو یہ مرد با خدا دیوانہ ہے
دین سے مطلب نہیں دنیائے میں بیگانہ ہوں سامنے آنکھوں کے اختر جلو کجا نہ ہے
نہیں ہو ترش تیغِ بھادہ میرے قاتل کی نگاہِ حسرت آگئیں و دیکھ لی کیا اپنے نسل کی
مراغی جنوں شربِ ستم سے وہ نہیں مکتا ہیں زندانِ بلا میں وہی آزادیاں دل کی
ابھی گوداب کی طوفاں نفسِ موجود کا کڑا ہوا ابھی کچھ کو نہیں ہے فکرِ عشرت کا وصال کی
مقتدر اس کا ہے پامالِ کام و ہواں ہونا خبر کیا خاکِ جاوہ کو حرج ہے سناہل کی
کہیں سے تیشہ فرا دل جاے تو لطف آگ بہت یاد آرہی ہے اس بُتِ شیریں شائلی کی
بھاتا جو زمانہ راہ میں کس شوق سے آگئیں ذرا توقیر و کچھ اپنے پابندِ سلاسل کی
بہا و کشش ہستی ملت کیا نگاہوں میں! حیاتِ مختصر دیکھے ہوئے ہوں شمعِ محفل کی
گلوں کا رنگِ بو جنتِ بڑاں ہی نہیں، لیکن مرے کانوں سے مگرانی میں فلوں کی مڑاں کی
شادیِ مشت سے آخرِ عمر یادِ شانِ خود واری چلا ہوں پھر اسی ظالم سے کچھ داستانِ دل کی

عمر بھی ہو تجھے، ہر طلعت اکھٹا نہ نعت ا
نرے جلوں کی ہیں شقائق نظر پر اہل صحت کی
جے اختر! وقت خود ہی رہتا اس صحنے کی
لجے حاجت نہیں فنِ توانی و فاضل کی
جنت جو کل مرے لیے جنت نہیں ہی
یمن چمن مزاج طبیعت نہیں رہی
پامال حادثات ہے گھمبیرِ نظر
سیرے خیال و فکر میں غارت نہیں ہی
بار بار ہے ذخرا ماں چمن چمن
لیکن گلوں میں پہلی سی گھٹ نہیں ہی
اس انقلاب دہر کی نیرنگیاں نہ پوچھ
دنیاے رنگ و رو کی وہ صورت نہیں ہی
ظور یہ گی فکر کی 'اشد ری جراتیں!
عہ بند ہی مجاز و حقیقت نہیں رہی
جب سے سنا ہے طور و کھلی کی داستاں
تم سے نظر ملنے کی بہت بہتیں رہی
اب ہنگامے سے کعب کی جانب ہو مارچ
کماؤہ صنم از طبیعت نہیں رہی
اک صلب شب چراغ ہے خورینِ خوں گلن
اب یہ ہلکے میں وہ غفلت نہیں ہی
یہ پیش ہندیاں ہیں کسی انقلاب کی
نسرین و یاسمین کی وہ رنگت نہیں رہی
ہندوستان کا مہر ہے اختر! عروج پر
وہ سردارانِ حصر میں نوبت نہیں رہی

قطعات

بلند حوصلگی

گو داب کے نفلات سے ادا کا نہ پنے دلے!
پہری ہوئی سبوں میں بھی لکھ کر میں نہاں
جے سب حواث جو بلا غیر! تو کیا ڈر
میں برق سے 'آندھری سے' سند کو لا ہوں

عروشِ عشق سے بلند

عروشِ عشق رہا میں اب یہ روح کی زینت
زاد رنگِ نظر کے کچھ تلواں ہی ہیں
دائیں حصر ہے کیا ان کی روشِ بختوں!
حرمِ راز تو ہیں 'چاکِ گریباں' ہی ہیں
دلخِ نظرتِ عواد! کشیشِ امت پاچھ
میں کا ڈر ہے! جھکتی نہیں جبینِ میری
خود راہِ ریاست چہ شکر اتا ہوں
سے ان کے عرش سے بالا کہیں نہیں میری

حبیب اشعر دہلوی، حکیم حبیب احمد

حکیم حبیب احمد اور حکیم اجل خان مرحوم ایک جدی تھے۔ وہ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ گوہر کسی چیز کی کمی نہیں تھی، ہر طرح کی فراغت تھی، اس لیے جوانی تک بہت عیش و آرا سے بسر ہوئی۔ اگرچہ قرآن، عربی، فارسی سب علوم کی تعلیم خاص اساتذہ سے حاصل کی تھی، لیکن طبیہ کالج سے تکمیل کے بعد اپنی خاندانی ذمہ داری کے پیش نظر طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ملک تقسیم ہوا، تو یہ بھی لاہور چلے گئے۔ اس کے بعد گردشِ روزگار نے گویا ان کا گھر دیکھ لیا۔ وہ اطمینان اور فارغ اہمالی جو شروع سے ان کے گھر کی لٹریچر تھی، دہلی چھوٹے ہی ساتھ چھوڑ گئی۔ لاہور میں طب قائم کیا، اور کئی مرتبہ مختلف اخباروں میں طبی کالم لکھتے رہے؛ اپنا ماہِ طبی اور ادبی، رسالہ مذاق، ہیکالا، متعدد عربی کتابوں کے مسند ترجمے شائع کیے، غلوں کے لیے کہا نیاں نکھیں۔ لیکن اتنے پاپڑ بیلنے کے باوجود معاشی تسکین نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ نہ طبابت کے پیشے میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی، نہ ادب و شعر نے کوئی فائدہ پہنچایا۔

۱۵ جون ۱۹۷۱ء رات کو لاہور میں قید جلیات و زندہ غم دونوں سے نجات ملی۔ خاندان شریفی کے ذہنی قبرستان گلبرگ لاہور میں سپرد خاک ہوئے۔

مشہور لبنانی مصنف اور شاعر غلیل جبران کی متعدد کتابوں کے ترجمے کے تھے جو چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ٹوٹے ہوئے پر، شیطان، دلہن کی سیج، جنفش کا پھول، ریت اور مہاگ، آشک و شبنم، پکار۔ ان کے علاوہ مصری افسانہ نگار مصطفیٰ لطفی منقولی کے یہ ترجمے بھی ہیں: رخسار، تاج، شہناز، مصر کے دوسرے شہرہ آفاق مصنف محمد حسین ہیکل کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے مثلاً عرفان و حکم۔ شریعت کہتے تھے، اشتر تخلص تھا۔ ان کا معروف مجموعہ کلام 'رازدنیاز' کے عنوان سے قبل تقسیم ملک شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۰ء کلام پر بھی سے اصلاح نہیں لی۔

بطور نمونہ ان کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:

روح فرسا کوئی ناز و دلِ ناشاد کوئی
آج تھے آج ہم عشق سے آزاد کوئی
اہلِ دلِ جلوں میں ان کے آج، اشتر، کھو گئے
بقیہ ان ازل کو بھی قرار آہی گھیا
نہ ہو سترت میں علم کا پہلو، تو زندگی میں نرا نہیں ہے

میں اس کو دل ہی نہیں بھتا، جو درد سے آشنا نہیں ہے
جو! یہ سیداد بے سبب کیوں، محرم کی اسید پر غضب کیوں؟

تم ایسے پیش آرہے ہو ہم سے، ہمارا جیسے خدا نہیں ہے
زمین بھی دشمن، فلک بھی دشمن، تمام عالم خلافت، لیکن

مجھے تو اس بات کا ہے رونا، تمہیں بھی خوفِ خدا نہیں ہے!
مرے حق میں اکہی! یہ حیاتِ دوست کیا کم ہے

مری تقدیر سے وابستہ دو رِ آساں کیوں ہوا
چوشت میں چھا دہ دیکھی بھد بھی گئے
کام کی باتیں بھی نذرِ سہو دنیاں ہو گئیں
۳۲۹

اب میں دل ہو پریشان و پشیمان کیا کیا
 اک کجبت نے ربط اس سے کیا خود پیدا
 انا انی، ثم یا ذی، ثم ثانی، انا کر بلبل
 کئی عنوان سے مشہور ہوا کہ دستانِ پنی
 دنیا کو دیکھ دیدہ بینا لے ہوئے
 ہر جگہ ہے جہانِ قشایا لے ہوئے
 تو اور یہ سارے بھی تجھ کو اعتراف میں
 میں 'اور دل میں تیری تنہا لے ہوئے
 اب ہم ہیں اور کشمکشِ اضطرابِ دل
 وہ دن گئے کہ دعویٰ صبر و قرار کھٹا
 شاید ہے انتہا ہے محبت اس کا نام
 تم پاس تھے تو اد بھی دل بیقرار کھٹا
 ہر ذرہ ہے سطرِ نور یہاں، ہر تپا ہے نعلِ طور یہاں

اب جانیے بھی تو جا کر شوے وادیِ امین کیا کیجے

یہ موجِ چمن، یہ موسمِ گل، صیادِ بہار بھی زور نہیں

اس وقت ہے ایک اک شاخ یہاں شایانِ نشین کیا کیجے

دل میں خوابِ خدا تو ہے، اشعر! میں اگر بارسا نہیں، نہ سہی

سو بوناؤ ہیں، ترے اک اک جگاڑ میں بس پھر پھر، کو بجھے دیکھا کرے کوئی

ہو گیا ترکِ محبت کو زمانہ، اشعر! خواب کی طرح کبھی اس کا خیال آتا ہو

محمد حبیب (پروفیسر)

لکھنؤ کے مشہور خاندان فیض کے نام سے تھے۔ اس خاندان نے دہلی کے ہر شعبے میں امیر پیدا کیے ہیں۔ پروفیسر حبیب کے والد جناب محمد نسیم دف ۱۹۵۵ء اپنے زمانے کے مشہور دیوانی وکیل تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے اور تینوں نے اپنے اپنے میدان میں بڑا نام پایا۔ بڑے محمد نسیم تھے۔ یہ اپنے والد سے بھی بڑے نامی وکیل ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلا گئے۔ وہاں کالی دن ایڈوکیٹ جرنل کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کا ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ دوسرے بیٹے پروفیسر محمد حبیب تھے! اور تیسرے سب سے چھوٹے پروفیسر محمد حبیب! وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں۔ خدا انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

پروفیسر محمد حبیب ۶ جون ۱۸۹۵ء کو اپنے آبائی مکان (قصر باغ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے؛ یہ مکان اب سہندم ہو چکا ہے، ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں ایم اے الہ آباد کے اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا، اس سال یہاں سے درجہ اول میں پاس ہونے والے وہ واحد طالب العلم تھے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہو کہ

۱۹۱۵ء میں اپنے اسکول کے قرآن کی پڑھائی، معافی، تشریح و تفسیر کے امتحان مقابلہ میں دہ اول آئے تھے اور متعین (مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد) نے انہیں پہلا انعام دیا۔

یہاں سے بی اے کرنے کے بعد وہ دہلی آئے اور نوبل کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے ڈگری کی سند پائی، یہاں مشہور مورخ سرنسٹ بارکوان کے استاد تھے۔ اب پنڈت موتی لال نہرو کے بلاوے پر وہ ہندستان آئے۔ پنڈت جی چلہتے تھے کہ وہ ان کے جاری کردہ انگریزی روزنامہ انڈیا پنڈٹ (کھنٹو) کے ادارہ تحریر میں شامل ہو جائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ دہلی پر وہ علی گڑھ ہی میں ۱۹۲۲ء میں پہلے ریڈر اور سال بھر بعد ۱۹۲۳ء میں پروفیسر شعبہ تاریخ ہو گئے۔ جب پولیٹیکل سائنس کا شعبہ کھلا تو وہ اس نئے شعبے میں پروفیسر مقرر ہوئے؛ تاریخ کے لیے کسی اور صاحب کا تقرر عمل میں آیا مہیب صاحب ایک مرتبہ علی گڑھ پہنچ کر پھر علم بھر یہاں سے نہیں نکلے۔

ان کی ہندی زندگی علم کی خدمت میں بسر ہوئی؛ خاص طور پر تاریخ ان کا موضوع رہا۔ انھیں ہندستان کے عہدہ سنی (اسلامی دور) کی تاریخ سے خاص شغف تھا۔ اور ان کا اس کے اسیر میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں آج جو اس عہد کی تاریخ سے اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے اور یہ دور خاص طور پر مطالعے اور تحقیق کا موضوع بن گیا ہے، تو اس میں محرم پروفیسر جیب کی مساعی کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور جو ہیں وہ بھی بیشتر اسی عہد کے متعلق ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند ہے اور ہم آج تک اس پر اضافہ نہیں کر سکے۔ ان کی کتاب سلطان محمود غزنوی پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے جرات الہیہ بخونی سے سلطان محمود کے کردار اور عمل کو خلافت اسلام قرار دیا۔ اس پر بعض ضمیمین نے ان کی بہت مخالفت کی؛ خاص طور پر اردو اخباروں میں بڑے بڑے مضامین چھپے لیکن

انھوں نے اس کی ذمہ داری پر دانہ کی اور اپنے نقطہ نظر پر نئی سے قائم رہے۔ چنانچہ جب اس کتاب کا ۱۹۵۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ایک لفظ کی جگہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں مہات ملار الدین خلیجی (۱۹۲۶ء)؛ حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۹۲۷ء)؛ ہندستان ماقبل ملغوری (۱۹۳۰ء)؛ قلم و نطق امیر (۱۹۳۲ء)؛ دلی سلطنت کا سیاسی نظریہ؛ اسلامی تصوف کا آغاز (شائستگی مکیٹن یونیورسٹی میں نظام یکچہرہ (۱۹۳۶ء)؛ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۳۸ء)۔ یہ سب کتابیں اولہ انگریزی میں خالق ہوئیں؛ بعد کو ان میں سے بعض کے اردو ترجمے بھی ہوئے۔ ابھی پچھلے سال انھوں نے تاریخ ہند (جدید سلطنت) پر و فیہ خلیق احمد نظام کی شرکت میں شائع کی تھی۔ اس میں مغلیہ دور سے پہلے کی سلطنت دلی (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے حالات پر دیا شرح و بسط سے بیان ہوئے ہیں، نیز صوبائی حکمران خاندانوں کا تذکرہ بھی ہے۔ پادشاہ (۱۶-۱۷ء مارچ ۱۹۷۰ء) انھوں نے دلی یونیورسٹی میں حضرت نظام الدین اولیاء کی میرت اور تعلیمات سے متعلق اردو میں نظام یکچہرہ دیے تھے۔ یہ مہنہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ان پر بھی بعض حلقوں سے اعتراض کی آواز اٹھی تھی۔ لیکن جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، اس کے اعلان میں انھوں نے کسی کے ڈورے کبھی تذبذب کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے میدان میں اس اقتیاد کے باعث انھیں اندین ہسٹری کانگریس کی صدارت پیش کی تھی (۱۹۳۶-۱۹۳۷ء)

وہ بہت دن سے ضیاء الدین برنی کی مشہور تاریخ فیروز شاہی کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ عرصے سے صحت بھی خراب چلی آ رہی تھی اور کتاب ختم ہے؛ اس لیے ترجمے کا کام بہت آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ قد زمانہ انھیں تشویش تھی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری دلی تہا ہے کہ میں مرنے سے پہلے یہ ترجمہ مکمل کر لوں۔ خدا نے ان کی سُن لی۔ یہ ترجمہ ان کے انتقال سے تین چار دن قبل پورا ہوا۔

انہوں نے کسی راتے میں انگریزی میں افسانے بھی لکھے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ :

Desecrated Bones and Other Stories

کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

غرض وہ اپنے کام کے لیے جیسے۔ انہوں نے ساری عمر علم اور طالعلم کی خدمت میں گزاری۔ اپنے شاگردوں سے مجددِ محبت تھی اور وہ ان کی دلسے، دوسے، قدسے ہر طرح مدد کرتے ہوتے تھے۔ کئی طلبہ ان سے باقاعدہ و لطیف پاتے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے امتحان کے لیے جانچنے کی ساری آمدنی وہ اس کا ذخیرہ میں صرف کرتے تھے۔ شہور ہے کہ جب کوئی طالبِ علم ان سے ملنے کو جاتا، تو وہ اندر سے جیب میں مد پیر اور ہاتھ میں کاغذِ قلم لیے برآمد ہوتے کر آنے والا یا تو مالی امداد کے لیے آیا ہو گا یا کسی جگہ کے لیے سفارش خط لینے کو۔ اس پر ایک لطیف یاد آگیا:

چند سال اوہر کی بات ہے، مسلم یونیورسٹی میں کوئی جلسہ ہوا۔ جلسے کی صدارت اس زمانے کے وائس چانسلر جناب طیب جی فرار ہے تھے اور حبیب صاحب کو تقریر کرنا تھی جیسا کہ دستور ہے، صدرِ جلسہ مقرر کا تعارف کرانے کو کھڑے ہوئے۔ طیب جی علی گڑھ جانے سے پہلے فلک کی تاروں سروں کے متنازع کن تھے، اور اس باعث ہماری وزارتِ خارجہ میں سکوتر کے عہدے پر فائز ہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ جیک، حبیب صاحب کو اپنے طلبہ سے بہت محبت ہے، لیکن بہاؤات وہ ان کی غویوں اور غایوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں وزارتِ خارجہ میں تھا تو ایک ہی اسمائی کے لیے متعدد نوجوان میرے پاس پہنچتے اور ہر ایک کے ہاتھ میں حبیب صاحب کا سفارشی خط ہوتا۔ اس پر عقدِ بلند ہوا۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد حبیب صاحب اٹھے۔ فرمایا: وائس چانسلر صاحب کی تقریر آپ نے سنی، اس پر مجھے ایک پرانی بات یاد آئی۔ جب میں یہاں نیا آیا، تو ایک دن دفتر پہنچنے پر وائس چانسلر صاحب سرشاہ محمد سلیمان

کا ایک مشتق مراسلہ موصول ہوا۔ لکھا تھا: دیکھا گیا ہے کہ یونیورسٹی کے طلبہ عام طور پر ناز باجماعت نہیں پڑھتے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ خود پنجوقتہ مسجد میں آکر نماز پڑھیں تاکہ ان کی مثال سے طلبہ کو بھی باجماعت نماز ادا کرنے کی ترغیب ہو۔ میں اس زمانے میں نادر دوزے کا بہت پابند تھا، اور اس میں شازد نادر ہی تھا جو قحطی۔ میر نے جب یہ مشتق مراسلہ دیکھا، تو مجھے اس مداخلت بیجا پر بہت غصہ آیا۔ میں نے ا

پر دافس چانسلر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ نادر کا معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے، میں اسے جیسے چاہوں، پڑھوں۔ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اور میرے خدا کے درمیان حائل ہو۔ چنانچہ اس دن سے میر نے مسجد کی نماز ترک کر دی۔ کچھ اسی طرح کی بات آج موجودہ دانش چانسلر صاحب نے بھی ہے۔ میں ان سے صرف اتنا کہو، سمجھا کر میں کسی شخص کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ میرے اور میرے طلبہ کے درمیان حائل ہو۔ اس پر پہلے سے بلند تر قہر پڑا۔

جب وہ علی محمد مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے، تو انھیں امیر ٹیس پر و نسیر مقرر کیا گیا اور ڈی ایچ کے انچارج ڈیوٹی بھی دی گئی۔

اسی جذبے کے تحت انھوں نے ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ شمع، آگرہ سے شائع کو نام شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد بھی اپنے ایک معذور و کھیل دوست کی مدد کرنا تھا۔ یہ غالباً دہریہ نمک جاری رہا۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے، وہ اس کے مضامین کی بلندی اور طباعت کتابت کے اونچے معیار کی شہادت دینگے۔

وہ سیاست کے آدمی نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض اوقات عملی سیاست میں حصہ لیا! ۱۹۴۶ء میں دہریہ کی مجلسِ واضح قوانین کے لیے سودا جی پارٹی کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوئے اور سلطانپور حلقے سے منتخب ہو گئے۔ وہ ۱۹۴۱ء تک اس اہلی کے رکن رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ اقوام متحدہ دیو این میں

ہندوستانی وفد کے ساتھ پیرس گئے تھے؛ وہ اس وفد کے دوسرے لیڈر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ہمارے یوٹکو وفد (پیرس) کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک غیر ملکی وفد چین گیا تھا۔ پنڈت سند لال اس کے لیڈر تھے۔ پروفیسر حبیب اس وفد میں شامل تھے۔ پروفیسر حبیب بھی اس وفد کے رکن تھے۔ حبیب صاحب نے دہلی پر اس سفر سے متعلق ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں حبیب صاحب رومانیہ کی حکومت کی دعوت پر بوڈاپسٹ بھی گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب ہندوستان کے صدر اور نائب صدر کا انتخاب ہوا، تو بعض دوستوں کے حرارہ پر حبیب صاحب نے نائب صدر کے عہدے کے لیے اپنا نام دے دیا تھا، لیکن یہ اسی وقت بحب انھیں اطمینان دلا یا گیا کہ ان کے منتخب ہو جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں علی گڑھ کا قیام کمزورت میں ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جب وہ واپسی (ارگئے، تو بہت خوش تھے اور اطمینان کا سانس لے کر فرمایا کہ شکریہ ادا کر رہا ہوں، واپس لوٹ رہا ہوں۔

طبیعت سچا مریدانہ مریض پائی تھی۔ ان کی سادگی اور عینیت کے عبادہ واقعات زبانزد ہیں۔ خدا کے اس نیک بندے کا ۲۲ جون ۱۹۷۱ء شام کے آٹھ بجے علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ اپنے پیچھے جہانی یادگار دو بیٹے چھوڑے؛ بڑے کمال حبیب، یہ پاکستان میں ہیں، چھوٹے عرفان حبیب صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں پروفیسر ہیں۔

تسکین قریشی، محمد زین

ان کا خاندان دراصل سہوان کا رہنے والا تھا۔ سوردن (ضلع ایٹہ) کے مغلوں اور سہوان کے قریشیوں میں آپس میں رشتے داریاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ تسکین صاحب کی سگڑا دای سوردن کی تھیں۔ ان کے دو لڑکے تھے، بڑے رفعت اشرف اور ایک ان سے چھوٹے۔ والدہ ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنے یکے سوردن آگئیں۔ یہی رفعت اشرف جناب تسکین کے پردادا تھے۔ یہاں منجھلا اور اراٹھی کے گوجر پوران کی جاگیر میں تھا۔ ادویہ زمینداری کے خاتمے تک خاندان کے قبضے میں رہا۔ رفعت اشرف سہوان جاتے آتے رہتے تھے۔ سوردن کی مستقل سکونت تسکین کے دادا گل حسین صاحب کے زمانے سے شروع ہوئی۔ زمینداری، کاشتکاری ان کا ذریعہ معاش تھی۔ تسکین کے والد سخاوت حسین صاحب نے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ تنہا ادوی سے منٹن پائی۔ ان کا ۵ سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ سوردن ہی میں دفن ہے۔

تسکین صاحب جنوری ۱۹۰۹ء میں سوردن میں پیدا ہوئے۔ اگرہ گورنمنٹ

اسکول سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے سینٹ انڈیو کالج، گورکھپور میں داخلہ لیا۔ ان کے بڑے بھائی عبدالواسع اس زمانے میں گورکھپور میں اہلہ کلکٹری تھے، انھیں کے ساتھ قیام رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ گورکھپور میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ ہوا ہی اس لیے تھا کہ بڑے بھائی وہاں مقیم تھے۔

۱۹۲۱ء میں پولیس کے محکمے سے ملازمت مل گئی اور ترقی کرتے کرتے اوٹا پولیس ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہوئے، اور آخر کار لکھنؤ میں سی آئی ڈی پولک پراسیکیوٹر۔ یہیں سے ۱۹۵۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے جس دیانتداری اور احساسِ فرض اور وضعِ داری سے ملازمت کا زمانہ بسر کیا، اس پر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ ذیل کے مشکے سے بے داغ نکل آنا آسان، لیکن پولیس کی ملازمت سے نلوہنج نکلنا غیر ممکن، لیکن انھوں نے یہ کر دکھایا۔ خدا جسے توفیق دے! ملازمت کا زیادہ زمانہ سہارنپور میں بسر ہوا، یہاں چودہ برس (۱۹۳۰ء-۱۹۳۳ء) قیام رہا۔ پنشن کے بعد مستقل قیام میرٹھ میں اختیار کیا۔

یہیں میرٹھ میں ۱۹۵۵ء میں میرزا ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ میں اس زمانے میں تلاذۃِ غالب کی تکمیل کی فکر میں سرگرداں تھا۔ اس سلسلے میں میرٹھ بھی پہنچا۔ یہاں غالب کے دو شاگرد تھے: اسٹیل میرٹھی اور ریخ میرٹھی۔ اسٹیل میرٹھی کی کھاجن زادے جناب اسلم سیفی مدظلہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے دیر تک گفتگو رہی۔ جب میں نے برشام اجازت چاہی تو پوچھا: اب کہاں جا بیٹھے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے حکیم ضحیح الدین ریخ کے حالات کی تلاش ہے، اب انھیں کے ہاں جانے کا ارادہ ہے۔ فرمایا: میں ان کے برہوتے حکیم سیف الدین احمد کو یہیں بلواتا ہوں، قریب ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون کیا اور حکیم سیف تسلیم فرمایا۔ اسلم سیفی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا، اور چند منٹ بعد ہم اٹھ کر سیف صاحب کے مکان (داور مطلب) پر آگئے۔

تسکین صاحب وہیں پڑوس کے مکان میں رہتے تھے، بلکہ ان کا مکان اسی محلے میں تھا، جس میں سیف صاحب کا مطلب ہے۔ سیف نے انھیں بلوایا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تسکین صاحب بہت متین اور بخیدہ مزاج آدمی تھے، بہت آہستہ آہستہ اور ایک ایک لفظ صاف صاف کہہ کر بات کرنے والے۔ یہ غالباً ان کی مدتہ العمر کی پولیس کے ٹھکے کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔ آخر میں انھوں نے میری درخواست پر بہت کچھ تکلف کے بعد اپنی دودغ لیں منائیں۔ میں کلام کی بلندی پر دنگ رہ گیا۔ تسکین صاحب کو شروع سخن سے دلچسپی بچپن کی بیت بازی سے شروع ہوئی۔ یوں سینکڑوں ہزاروں شعراء ہو گئے۔ کبھی کبھی بیت بازی کے دوران میں ناطقہ بند ہونے لگتا، تو یہ اپنی طرف سے تنگ ملا کے کچھ سنا دیتے۔ رفتہ رفتہ خود بھی شعر کہنے لگے۔ آغاز میں کلام اپنے کچھ بھی زاد بھائی مولوی محمد محفوظ کو دکھایا۔ محفوظ زیادہ تر نفرت کہتے تھے۔ ان کے تنقید کلام کا مجموعہ دیوان محفوظ کے عنوان سے موجود ہے۔ پھر ۱۹۱۶ء۔

۱۹۱۷ء کے دو سال انھوں نے مولوی سید حسن مرتضیٰ شفیق عماد پوری (مت ۱۹۴۳ء) سے اصلاح لی۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں مرزا عماد علی عزیزی لکنوی کے شاگرد ہو گئے اور یہ سلسلہ عریض کی وفات ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔

تسکین کا کلام بہت بلند اور پایدار ہے۔ سارا کلام انتخاب معلوم ہوتا ہے، اس میں بھرق کا شعر شاد و نادر ہی ٹھیک لگا۔ ۱۹۳۶ء میں ج کیا تھا۔ اس کے بعد کلام میں اور زیادہ ربودگی اور بخیدگی آگئی؛ نفرت سے بھی شغف ہو گیا تھا۔ غزل ایسی ابھی کہتے ہیں کہ کسی سیار پر اسے جانچے، آپ داد دینے پر مجبور ہو جائینگے۔ چونکہ وہ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور پراگینڈے کا فن نہیں جانتے تھے، اس لیے اس کی کمال حلقہ شہرت نہیں ہوئی۔ صرف زبان کی ان کے ہاں چند اہمیت نہیں تھی۔ اس کی خاص خاص لکنوی، تنگ پسند نہیں تھا وہ شستہ اور متین کام کے دلدادہ تھے اور تر

اور اپنے استاد جو بڑی لوح خوانی بھی ان کی نظریں کھٹکتی تھی۔ اس لیے فانی بھی ان کے پسندیدہ شعرا میں نہیں تھے۔ اصغر سے متعلق انھیں شکایت تھی کہ ان کے کلام میں دلکش نہیں؛ ثقیل ہے اور اس میں ردائی ناپید ہے۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ ان کے اپنے کلام میں کیا ہنگامہ تھا۔ وہ اپنی غزل سے متعلق کہتے ہیں:

غزل دل رنگ تغزل میں کیا ہے شامل

سٹ گیا ہوں قویہ انداز بیاں آئیے

جگر اور حسرت ان کے محبوب شاعر تھے۔ جگر سے ان کے ذاتی تعلقات بھی اتنے قریب کے تھے کہ مثالی کہے جاسکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ جگر کا دوسرا مجموعہ کلام "آتش گل" تسکین مرحوم ہی نے مرتب کیا تھا۔ وفات سے کوئی بائیس مہینے پہلے جگر نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء کو اپنے کلام کی طباعت و اشاعت اور اس کی آمدنی کی تفصیل سے متعلق ایک وقفہ جگر ٹرسٹ کے نام سے قائم کیا تھا۔ انھوں نے اس کا واحد متولی تسکین صاحب ہی کو مقرر کیا؛ اور انھیں اجازت دی تھی کہ اپنے بعد جسے چاہیں متولی مقرر کر دیں۔ تسکین نے اپنی وفات سے پہلے غالباً کسی کو جانشین نامزد نہیں کیا۔ وہ پھر بہت مہربان تھے۔ میں جب باہر چلا گیا، تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے جگر مرحوم کی زندگی میں ان سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جو تقو شش دلا ہوا، میں چھپ چکا ہے۔ اس کی فرمائش بھی تسکین صاحب نے کی تھی۔ ہوا یہ کہ شش الہدیٰ تسکین صاحب نے جو گوئڈہ میں تحصیلدار تھے، جگر کی سوا انھوں نے لکھنے کی داغ بیل ڈال دی۔ انھوں نے جگر سے پوچھا کہ آپ کے حالات کے لیے کمن احباب سے رجوع کر لیں۔ بخلا اور احباب کے جگر نے میرا نام بھی بتایا۔ میں اس زمانے میں قاہرہ میں مقیم تھا۔ تسکین نے مجھ سے مضمون لکھوانے کا فرض اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ میں نے تعیل اور شاد میں یہ مضمون لکھا تھا۔ جب میں برسزدہ لہجہ میں تھا، تو انھوں نے "مناخ تسکین" کا پورا کلام خود

لکھ کر مجھے تحفہ بھیجا تھا۔ یہ مجموعہ اس کے بہت بعد شائع ہوا۔

ابھی وہ ڈھائی مہینے ہوئے، میں میرٹھ گیا۔ سیف صاحب کے ہاں پہنچا۔ انھوں نے حسب معمول ملازم سے کہا کہ تمہیں صاحب کو اطلاع کرو کہ مالک رام آئے ہیں جب تک وہ آئیں، سیف صاحب نے بتایا کہ مجھے اندیشہ ہے، انھیں گلے کا کمینہ ہو گیا ہوگا لیکن میری سنتے نہیں؛ کیا کیا جائے! اتنے میں تشریف لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آوازاں نہیں ہیں، کبھی کبھی درمیان میں لفظ سناؤ نہیں دیتا، کمرہ بھی بہت ہو رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ فرمائیے؛ طبیعت کیسی ہے؟ جواب دیا کہ خلق پر نزلہ گور رہا ہے، اسی نے پریشان کر دکھا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے یا اسپتال میں اپنا مشکل معائنہ کیوں نہ کر دلیجیے؟ اس پر انھیں شبہ ہوا۔ چک کے کہنے لگے، نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ نزلے کا ایک جڑب تھوڑے سا ہے، وہی استعمال کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس پر مجھے جرأت نہ ہوئی کہ کچھ اور کہتا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہی مشورہ حکیم سیف صاحب مجھ سے پہلے دے چکے تھے۔ اسی لیے انھیں شبہ ہو کر میں نے یہ انھیں کے کہنے پر کہا ہے۔

آخوندی پیش آیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اطلاع ملی کہ جمعرات ۲۴ جون ۱۹۷۱ء صبح کے ۶ بجے آگے میں انتقال ہو گیا۔ جب حالت بگڑنے لگی، تو انھیں علاج کے لیے سرحد جمنی ہسپتال، آگرہ میں داخل کیا گیا تھا۔ یہاں بہت تکلیف میں وقت گزارا۔ جب حالت مایوسی کی ہو گئی، تو اسپتال سے اٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی فضل الرحمہ صاحب افضل محلہ تاج گنج کے مکان پر آگئے۔ وہیں وقت سوچو دیا یا بٹی بھی آگے کی نصیب ہوئی۔ تاج محل کے قریب ہی مشرق کی طرف، شاہی زمانے کی بنی ہوئی، سید احمد بخاری کی درگاہ ہے۔ اس میں دفن ہوئے۔ انا شروانا امیر

راجون

ہمارے دوست ڈاکٹر نور اشرفوری نے ایک کے تیسے عیسوی تاریخ کہی ہے:
ایک لایہ مصرعہ غم غلہ نکال میں تسکین قریشی

(۱۹۷۰ = ۱۹۷۱ = ۱۹۷۱)

T

۱۹۱۸ء میں اپنے خاندان ہی میں شادی ہوئی تھی۔ لاؤلفوت ہوئے۔

ان کا کلام چار مرتبہ چھپا:

سرایہ تسکین (اول): (جلد شہر ۱۹۳۶ء)

سرایہ تسکین (دوم): (سہارنپور ۱۹۳۶ء)

گلگونہ: (لکھنؤ ۱۹۵۲ء)

مناج تسکین: (لکھنؤ ۱۹۶۲ء)

انہوں نے مکاتیب جگر (دول ۱۹۶۲ء) کے عنوان سے جگر کے وہ تمام خطوط بھی شائع کیے تھے جو ان کے پاس محفوظ رکھے تھے۔ اس میں جگر کے خطوط ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں انہوں نے مولانا اسعد صاحب (ناظم مظاہر علوم، سہارنپور) کے ۲۸ خط صحائف اسعد کے نام سے اور اپنے استاد عزیز لکھنوی کے ۱۶ مکتوبات عزیز کے عنوان سے تصحیف کر دیے ہیں۔

ان کے پاس جگر کے خطوط کے علاوہ ان کی کچھ مباحثیں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ پاتے سے کہ یہ سارا ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا جائے، تاکہ آئندہ جگر پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ کس وجہ سے مسلم یونیورسٹی میں یہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس پر انہوں نے یہ تمام چیزیں جاموہلیہ اسلام آباد کی وائی کے حوالے کر دیں۔ یہاں یہ اشیاء گوشہ جگر کے نام سے مرکزی کتابخانے میں رکھی گئی ہیں۔

خدا رحمت کند اس عاشقان پاک طینت، ا

اب کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو جو ان کے مجموعے 'مناج تسکین' سے لیا گیا ہے:

عشق میں عشق کا حاصل نہیں دیکھا جاتا تیرا دور یا کبھی ساحل نہیں دیکھا جاتا
 بے طلب بھی کبھی مل جاتی ہر منزل، تسکین ہر گھنٹہ جاوے منزل نہیں دیکھا جاتا
 کفر و دین سب کی سیر کو آیا کچھ نہ دل کے سوا نظر آیا
 دل ہے بے آرزو نظر بے ذوق تجھ کو جیسا نہ عمر بھر آیا
 جب کہیں تذکرہ حسن و لا رام آیا کوئی محفل ہو، ہر اک لب پہ ترانہ آیا
 تو بہ کے بعد ہی ساقی کا یہ پیغام آیا میکدے سے جو گیا، پھر نہ کہیں کام آیا
 عشق سے پہلے نہ کچھ تھے خوش ہوتی ہے کیا کیوں پگھلتے ہیں ستائے چاندنی ہوتی ہو کیا
 کوئی خاموش ہے، کوئی نالرب اپنا اپنا جنوں، اپنی اپنی طلب
 ہا ہر جراتِ خوق و جوشِ طلب ہے مقامِ محبت، مقامِ ادب
 جن کو جنوں نے کو دیا، عشق میں خاناں خواب

ذمیت بھی ان کی کامیاب، موت بھی ان کی کامیاب
 تری نظر میں کائنات، میری نظر میں صرف تو

تیرا بھی حسن، بی نظیر، میرا بھی عشق لا جواب
 کہنے کو تو کہ آئے غمِ دل، مگر اب تک وہ غمِ نظر یاد ہے، وہ چین جہیں یاد
 مہیا، ہر سرستی دماقی، ہر آغوش! کا فر ہے جسے آئیں جواب بھی دل و دیں یاد
 اب کرم کی بھی دل کو تاب نہیں کیجیے کس امید پر فساد
 ہاں، اس دل کی حسرتیں تسکین! جو محبت میں ہو گیا برباد
 جبر میں اختیار ہے تو، مگر جیسے کوئی نفس میں ہو آ زاد
 دل کی دنیا عجیب دنیا ہے جتنی برباد، اتنی ہی آباد
 جگہ، جگہ، وہی تسکین! آگے اب تو، ہر جہ برباد
 ترا خیال بھی ہے تیرے حسن سے معمور تمام شوخی دستی، تمام نکبت و نور

جنوں، کہاں یقین، انتہا ہے سوز و غم
حیات راہ محبت میں ساتھ دے دیکھ
جنوں نہ ہو تو محبت، دل و نظر کا فتور
سفر تمام ہوا، اور ابھی ہے منزل دور
تریں نگاہ کی رسوائیاں نہیں منظور
تیری طلب کے سب ہیں مراحل
تم دے گئے ہو، تنہائی، دل
غم دل اور اتنا راحت انجام
محبت بھی ہے، رسوائی کا ڈر بھی
یقین، فوجی جنوں کی شرط اول
ہر آرزو کا احساس ہے حکم
کچھ چشم تر ہی کام آئی، ورنہ
شک طلب ہیں دونوں ہی، شکیں!

شکیں! یہ کہے دست ہے، راہ حرم نہیں

کچھ ہوش ہے، کہاں سے کہاں آگئے ہو تم!

زندگی مرگ، ناتمام ہے آج
زرا حسن پیدا تو کرو، زندگی میں
نہ تھا، نہ جستجو، نہ جنوں
تریں منظر جلوہ گاہیں بہت ہیں
بکھتے تھے ہم، جلوہ گاہیں بہت ہیں
دور ستم، کچھ ہوا تو ستا میں!
درد محبت، دل میں چھپایا
دنگ زمانہ دیکھنے والے
کفر نے بھٹا ہے، شکیں! میرے ایاں کو فرغ
اگر ہو نہ آہوں سے آباد سینہ

خود بے سلیقہ، جنوں بے قرینہ

دہی عظمتِ زندگی سے ہیں واقف کہ طوفاں سے محظور ہے جن کا سفینہ
ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں بہت دشوار ہے یخا ذ سازی
صداقت کیا، جو ہو محدود و پناہاں جنوں کیا، جب نہ ہو نگار سازی
ہزاروں بار جب ٹوٹی ہے توبہ تو آیا ہے شعورِ پاکبازی
محبت، حسن بن جاتی ہے، نکلیں محبت میں اگر ہو بے نیازی
ان کی نخل میں، جہاں ہم کھی گئے نہ گئے آج کیا کیا ہمیں الزام لگائے نہ گئے!
انجم و ہر و ماہ سے پہلے جلوہ تھا، جلوہ گاہ سے پہلے
کھیل کجے نہ کوئی شغلِ نفاں دمِ اٹھا ہے، آہ سے پہلے
تفاضل کے تو پہلو اور بھی تھے ستم ہی کس لیے کم ہو گیا ہے!
نہ دن دیکھے، نہ صبح و شام دیکھے تجھے کیا چشمِ پرِ نم ہو گیا ہے؟
اسیری سے فطرت بدلتی نہیں چھٹے اور نہیں بنانے لگے
سکوں اگر ہی ہے رہِ عشق میں قدم جب رکے، ڈگمگانے لگے
کس قدر ہم سے نا آشنا ہو گئے! تم محبت کے ہوتے ہی کیا ہو گئے!
دل بب آسودہ امید کوم ہوتا ہے علم کا احساس اگر ہو بھی تو کم ہوتا ہے
ہم نے دیکھا، حسینوں کو بھی مردم سکوں ہم کبھے ہیں، محبت میں جو غم ہوتا ہے
وہ تمام نہیں، سنگ و ارباب جنوں نچ کے چلتے ہیں، بدھ نقش قدم ہوتا ہے
حادثے ہوتے ہی، ہتے ہیں جہاں میں سکین! دل کے جانے لاگم اور ہی غم ہوتا ہے
زندگی اپنی حقیقت کتنی اب تک محروم تم بے ہو، تو یقین دل و جان آیا ہے
ننگہ سادہ، اسے معاذ اللہ! ننگہ، التفات کیا ہوگی!
کمالِ محبت، جمالِ آفریں ہے اگر دل میں ہو، تو دنیا حاصل ہے
وہ اک بجدہ بے جہیں، اللہ! اللہ! کوئی آستیں جس کے قابل نہیں ہے

بایں نامرادی، بایں بدگمانی محبت سراپا، یقین ہی یقین ہے
 آملِ عشق پہ ہم صبر کو تو سکتے تھے مگر یہ دل، جو ابھی تک تم سے خیال میں ہو
 یہی ہو کفر، تو ایمان کس کو کہتے ہیں کہ سر ہے جدے میں، اور دل تم سے خیال میں ہو
 حضورِ حق، اک افتاد بن گیا اس کا کہیں نہیں بات جو آغازِ گھٹنگو کے لیے
 ہزار ہا ہزن اچھے ہیں، ایسے دہرے جو راہ بھوڑ دے، منزل کی جستجو کے لیے
 گلوں سے کھیلنے والے، ایشانہ کانٹوں کو جہاں سخن کی ہر شے ہے آرزو کے لیے
 یہ فیصلہ آخر ارہاب یقین ہے جو کچھ ہے محبت ہے، نہ دنیا جو زدیں ہو
 ملتی نہیں بے جان دے منزلِ جاناں مشکل تو ہے یہ راہ، مگر دور نہیں ہے

ٹیس تھی جس میں اک موت سے، آج وہ بھالا پھوٹ گیا

ٹوٹ گئیں جب سادی امیدیں، آخر دل بھی ٹوٹ گیا

تیرے لیے ملے تھے سبکے، اب یہ عشق ٹوٹ گیا

ایک تراکیا دامن بھوٹا، سارا زمانہ پھوٹ گیا

تو کب محبت کی بھی کوشش، اس نہ آئی، اسے تسکین !

بھانپس بھی دل کی دل سے نہ نکلی، دل کا دل بھی ٹوٹ گیا

تسکین کا مرنا جینا کیا، افسوس ہے اتنا اُلبتہ

عم جس کو رہا دنیا بھر کا، دنیا کو اہی غم نہ ہوا

نہرا بتاؤ، کبھی تم کو یہ غصیاں ہوا نگاہ کس پہ پڑی، کون پایا ال ہوا

طرح طرح سے بھلایا، مگر یہ حال ہوا کہ ہر خیال سے، پیدا ترا خیال ہوا

ہزاروں ادھی آئے تھے بے طائف ہوئے بھی سے کیوں یہ بھری بزم میں ال ہوا

کفر و ایمان، جادۂ الفت کی ہیں ریزشیں

ایک ہے کعبے سے پہلے، ایک بتانے کے بعد

احساسِ نارادیا الفت نہ پوچھے
کچھ اور پوچھے یہ حقیقت نہ پوچھے
سجدوں سے طے مقامِ محبت نہ ہو سکا
جب یادِ یار سے بھی نہ تسکین ہو سکے
نقلِ رازِ ابتداءِ محبت بس اک نگاہ
پیشِ نظر ہو جب وہ مجالِ نظرِ فرد
کچھ کو دل میں کچھ بھی نہیں، جزِ خیالِ یار
وہ نوں ہی بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں
کبھی میں، بتکدے میں، حویرِ مجال میں
تسکین! یہ جانِ دلِ خود ہیں بھی تسکینِ عزیز
مذہب سے دل نہ دکھاؤ، پاسِ محبت ہنسنے دو
کوئی کنارہ کوئی سہارا کیا جانے کب مل سکا
حرفِ حکایت، نگرِ نکایت، دل میں یہیں ہی کیا کیا
ٹپنے مٹنے، داغِ شگفتہ، دودھِ ہوس کٹنے تسکین!

کیا دل کے ٹوٹنے میں ہو لذت نہ پوچھے
کیوں آپکے ہو مجھ کو محبت نہ پوچھے
کیا کیا ہوئی ہے سرِ کدِ عداوت نہ پوچھے
ہوتی ہے کیا وہ کاشِ زلفت نہ پوچھے
اُسی نگاہ جس کی حقیقت نہ پوچھے
پھر اضطرابِ شوق کی حالت نہ پوچھے
لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھے
افسازِ مجاز و حقیقت نہ پوچھے
دل کی کہاں کہاں ہو ضرورت نہ پوچھے
اب زندگی ہے کس کی بدولت نہ پوچھے
کون کہنا گم کو ظالم! ادا کئے تو کھنڈ
یہ طوقاں کی ادا کی کشن، ایتھی ہو جنگِ سینے دو
پائے کوم کاڈ کو کہاں تک، کچھ تو میں ہی کھنڈ
بٹنے بٹنے دل بنتا ہو، خوب اسے عم پہنچے دو

کس سے پوچھیں، ہم نے کہاں، وہ چہرہ روشن دیکھا ہے
مختلِ محفل ڈھونڈ چکے ہیں، گلشنِ گلشن دیکھا ہے
ہم کو دیکھو، منزلِ منزل لٹ کے ہوئے ہیں خاک نشین
ہم سے پوچھو کیا کیا ہم نے، ہزن دیکھا ہے
کس کو دیکھیں، کس کو نہ دیکھیں، بھول بھی ہیں، کلیاں بھی، اگر
جس سے لٹائی آنکھ، اسی کو، دل کا دشمن دیکھا ہے

شاغل قادری، سید محمد شاغل قادری

ایک مذہبی اور سترن گھرانے کے فرد، ۱۲ جنوری ۱۹۳۴ء کو بمبئیہ (ضلع گیا، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ فتح ایچا، مصوفی منش اور اہل بدلی میں سے تھے۔ چونکہ وہ بیشتر عبادت میں مشغول اور عزت گزریں رہتے تھے، اس لیے شاغل کی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی ذاکر قادری کی نگرانی میں ہوئی۔

ان کے چچا اسد اللہ قادری نے انھیں بچپن ہی میں مختلف شعرا کے بہت شعرا دے کر دیے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ابھی اسکول کی منزل طے نہیں ہوئی تھی کہ شعر گوئی کا چمکا لگ گیا۔ شروع میں تخلص صادق کیا۔ طبیعت چونچالی تھی، اس لیے تنبیہ کلام کے ساتھ مزاحیہ رنگ میں بھی کہنے لگے، ایسے کلام میں تخلص کا ذبا دکھا۔ جب بھڑا راج ہائی اسکول میں پہنچے، تو اب تخلص بدل کر پہلے دانش اور پھر شاہد رکھ لیا۔ ملازمت کے ابتدائی روز یعنی مکر ڈینی انجینئرنگ، کس کے قیام کے زمانے تک، چندے شروع تخلص سے بھی لکھتے رہے۔ لیکن باب انکسٹ ۱۹۴۷ء میں مستقل ملود پورہ لیوے کی ملازمت مل گئی اور بھالپورہ اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی، تو اس کے بعد سے اپنے نام کے دو اجزاء شاغل اور

قادری پر کشف کی بات میں بھی ترجیح قادری کو رہی۔ مزاحیہ کلام میں البتہ آج تک جہلا
تخلص کا وہ ہی چلا کر رہا تھا۔ اب اس کی جگہ تلخ زمانی نے لی۔

۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک بھیا گلپور میں رہے۔ اس کے بعد تیاروار موہا اور صاحب گنج
پہنچے۔ یہاں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اسی سال ہاٹ پورٹی میں ریلوے اسٹیشن ماسٹر کے عہدے پر
فائز ہوئے۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی رہے، رفاد و عام کے کام، شعر و سخن کی خدمت، اور
مشاعرے منعقد کرنے سے انھیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ شروع میں پروفیسر اختر صدر
شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی سے اصلاح لی۔ جب دوران ملازمت میں صاحب گنج پہنچے،
تو حضرت سرور شمس عظیم آبادی سے مشورہ کرنے لگے۔ انھوں نے آئنا مجبوء کلام متاع سخن
کے عنوان سے کلام بھیا گلپور کے زمانے ہی میں مرتب کر لیا تھا، اگرچہ اس کی اشاعت
بہت بعد کو ہوئی (دیکھا: ۱۹۶۵ء)۔ انھیں غزل اور نظم، بلکہ ہر ایک صنفِ سخن پر،
کیاں قدرت حاصل تھی۔ مذہب اور ریاست ان کے دلپسند موضوع تھے۔ ان کے
مجبوء کلام میں غزل، نظم، قطعہ، نعت، سلام، ہجو سب ہی کچھ ہے۔ آخر میں تلخیات
کے عنوان سے طنزیہ اور مزاحیہ کلام بھی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی خاصی ہمارت تھی؛
چنانچہ اس مجبوء میں چند قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

یہ مجبوء انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے نام بدیں الفاظ معنون کیا ہے؛

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام، جن کی نشر نے میرے فکر و فن کو

جلاد دی۔

اس سے ان کی افتاد طبع کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں؛ اپنے خبرگوں کی طرح انھیں بھی ملکی
سیاست سے گہری دلچسپی تھی؛ چنانچہ جمعیتہ العلماء ہند سے باضابطہ وابستہ تھے۔ وہ جمعیتہ
کے جملہ اکابر سے بہت متاثر ہوئے۔ نظم کے علاوہ شری بھی لکھتے تھے۔ ان کے شری مضامین
مختلف رسالوں میں منتشر رہے ہیں اور آج تک مدون نہیں ہوئے۔ ان سے یقیناً ایک اچھی

تذکرہ معاصرین

ضیغ حلیتیار ہو جائے۔

شب جمعہ ۱۷ جولائی ۱۹۱۹ء کو سٹیشن پنجوارہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ ان کی بیگم وائمہ مرض تھیں۔ اپنی اولاد نہیں تھی۔ ایک بچے کو گودے لیا تھا، وہی ان کا وراثت ہوگا۔

چند شعروں کے مجموعہ کلام امتناع شوق سے ماخوذ درج ذیل ہیں:

دھندلا دھندلا سا دل کا عالم ہے	آرزو کا چہرہ راغ تدمم ہے
ہر طرف ہے بلا کی تاریکی	دو، منزل ہے، راہ پر ختم ہے
مئے عنوان کی ہے سیاحتی	جو دوا درویدل کی ہے، اسم ہے
موت ماحول پر ہوئی طاری	سرسنگوں زندگی کا پرچم ہے
چشم حق میں نہیں، مگر ابوس	روشنی گر نہیں، اڑ کیا غم ہے
دل میں شمع بقیں تو ہے روشن	ہوا اگر تیرگی کا عالم ہے
ہلکے ہلکے نسیم کے جھونکے	کہہ رہے ہیں کہ مات اب کم ہے
پھر چمن میں بہار آئیگی	کھلنے والا سحر کا پرچم ہے

دورِ فتن

زیگن فضا میں ہیں بہاروں پر چمن ہے	شاداب گل و لالہ دوسری دامن ہے
ہر شاخ گل تر پر عنوان ہیں غزل خوان	گلگشت میں بھڑک کوئی غنچہ دہن ہے
خوشامیں ارباب چمن خوب ہے، لیکن	شاعر کی نظر میں یہ نقطہ خواب کہن ہے
دیکھا تھا خرواں میں جو بہاؤں کا کبھی تھا	چھایا ہوا فتنوں کی خواب کا ظن ہے
مرحمانے ہوئے پھول کو شاداب دیکھے	روتا ہوا جو بیل، تو نہ کہیے کہ مگن ہے
کہا کہ، بیل کے دستِ حقیقت گزرا	خطرے میں نہیں ہے، مصیبت میں چن ہے
بیل کے لیے چمن کی صورت نہیں اب بھی	صیاد سے لٹا ہوا مالی کا حیلن ہے

جس دل میں محبت نہیں ہزاروں دھن کی
ہم جو رستم پر تو خاموش رہینگے
وہ دل نہیں اے دوست! ہمارے نہیں ہے
ہمارے کھن مرحلہ دار و رسن ہے
ہر غمخوارِ بیدہ کو بیدار کرینگے
ہشیار ہو، قادر کی یہ قدر حق ہے
ان کی پریشی پر جو دیکھا تبستم مجھ کو
رازِ داں کو مرے انداز پر رونا آیا
ہے وہ تیرے نیکش، شغل!
شبِ براق گزار دی عجب قصور میں
کہ جسے پاس ہے اب آئے ملنے میں
جن میں مہنے کی سروادِ جبارت آئی
ان کے قدروں میں دانے کی سیاہی آئی
رنگ لایا ہے مراغوں و فاکلشن میں
گل تو گل، خار میں بھی جوئے محبت آئی
ہو اے سودو زیاں کی فکر کیوں
جس نے تیرے عشق کا سودا کیا
دھائی حیات کا باعث کبھی نہیں
وہ دردِ عشق جس کی خلش دہی نہیں
وہ دغا میں کوئی دیتا ہے ساتھ کس کا!
علم کیوں سنا میں ناحق ہم اپنی بیکسی پر
دل میں قصور بیتاں لب پر سلام اور رُو
ہم تو عشق کے بندے تھے سرے
وہیت مجموعہ ماضی و ہوا جاتی ہے
عشق کی منزل سہل نہیں ہے
کوئی ناحق کیوں دشمن ہے
ہر اک گام پر دار و رسن ہے

ہر دل میں غم و درد ہے بیتابی ہے
غنا چمنِ ریست میں شادابی ہے
ساقی کو بھی ہے تشنہ لبی کا رونا
صباے مشرت کی وہ نایابی ہے

تھا عجب خزاں میں جو چلن اب تک ہو
بلبل کے لیے دورِ سخن ما اب تک ہو
کہنے کو تو آیا ہے گلوں کا موسم
صیدِ غم و آلام چن اب تک ہے

وقت کے خرابات میں پینے والو!
اکرام پر اغیار کے جھینے والو!
خواب و بیدار میں ہر جا ڈکھیں!
ہشیار، خبردار، سیٹھے والو!

امسردہ گل و لالہ کھلا دیتے ہیں
تاریک فضاؤں کو ضیا دیتے ہیں
یہ آخر شب اشکِ بزمِ امت کے گہر
آئینہِ خاطر کو چلا دیتے ہیں

خیر بہروی، البوالخیر

اس صدی کے آغاز (غالباً ۱۹۰۱ء) میں ضلع بلیا (پٹی) کے ایک گاؤں بہورہ میں پیدا ہوئے چلنے والے طرز کی فارسی، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور اردو سے محبت تھی۔ اسی لیے روم مولوی عبدالحق نے جب انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۳۶ء میں اورنگ آباد سے دلی منتقل کیا، تو انھیں صدر دفتر میں بلا لیا۔ وہ تقسیم ملک تک انجمن کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے ملک بھر کا دورہ کرتے اور اس کی تنظیم کا کام کرتے رہے، کچھ زمانہ غالب نامیہ معتمد بھی رہے جب تقسیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں انجمن کا دفتر ازبکستان علی گڑھ میں قائم ہوا اور قاضی عبدالغفار (ف جنوری ۱۹۵۲ء) اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، تو خیر صاحب ان کے دست راست ثابت ہوئے، انھوں نے انجمن کے ازبکستان قیام و استحکام میں ان کی بہت مدد کی۔ قاضی عبدالغفار کی رحلت کے بعد نئے ماحول میں وہ زیادہ دن نہیں رہے، چنانچہ ۱۹۵۷ء میں متعفی ہو گئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں غالب انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور اسی سلسلے میں غالب کی تصویریں ایک جلد میں، مرتبہ غالب کے عنوان سے شائع کی گئیں

(نکھنڈ ۱۹۵۷ء)۔ اس کے پیٹنٹا بایو پی حکومت نے کچھ مالی امداد کی تھی۔ اس کتاب کا
 ہندی آڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ پورا منصوبہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس
 لیے موقع غائب کے بعد وہ کوئی اور کام نہ کر سکے۔ انھوں نے نکھنڈ میں آل انڈیا میسر
 اکاڈمی قائم کرنے میں جناب مقبول احمد صاحب لاری کا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ لاری صاحب
 ہی کے ساتھ رہتے تھے اور یہ ان سے ہر طرح کا سلوک کرتے رہتے تھے۔

خیر صاحب کو بہت دن سے یہ عارضہ تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنے لگا۔ بلا
 مبالغہ بعض اوقات دو دو چلی خون خارج ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کے جسم میں
 تازہ خون چڑھایا جاتا تھا۔ اسی سے روز بروز نقاہت بڑھتی گئی اور حالت خراب
 سے خراب تر ہوتی گئی۔ مسلسل بیماری سے گھبرا کر وہ گزشتہ مئی کے اوائل میں اپنے وطن
 بہورہ چلے گئے، تاکہ آخری آیام اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ گزار سکیں۔
 بروز ہفتہ ۷ جولائی ۱۹۷۱ء بوقت شب بہورہ ہی میں انتقال کیا۔ خدا مغفرت
 کرے۔

راز بلگرامی سید شریف الحسن

۱۹۰۱ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ریاض الحسن بلگرامی کی کچھ زمینداری تھی۔ مادری عربی فارسی کی کچھ تعلیم گھر پر ہوئی، اسکول میں آنکھوں سے دور جے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن یہی انھوں نے ذاتی مطالعے سے پوری کی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، فارسی اور عربی دونوں میں بہت اچھی استعداد تھی، اور شعر میں خاص طور پر حافظہ اتنا اچھا تھا کہ جو اسے میں سند دینے میں کبھی وقت نہیں ہوتی تھی۔

فن عروض شادان بلگرامی (ف جنوری ۱۲۸۰ھ) سے حاصل کیا، لیکن شعر پر اصلاح سید وجاہت حسین رمز تھری سے لی۔ اور طویل مشق سے خود استاد کی کا درجہ حاصل کیا۔ بلگرام کے میسوں نوجوان ان سے مشورہ کرتے تھے۔ شعر کے علاوہ نثر سے بھی مزا دلت تھی۔ سید مقبول حسین واصل بلگرامی کے ماہنامے ارتق میں برابر کے شریک تھے اور اس میں کبھی کبھی نثری مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے کا ایک مشہور تنقیدی مضمون شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے موازنے سے متعلق تھا جس پر کچھ بحث بعد کو نگار (کلکتہ) میں ہوئی تھی۔

مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: حسین مہتی، کاثر حسین، پیغامات

تذکرہ مساعیرین

آخری ایام میں تاریخ بگلام مرتب کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اس کے لیے جس ذہنی اور جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وہ مستی نہ ہو سکا اور کام نامکمل رہ گیا۔

کلام کہیں محفوظ نہیں رکھا، بلکہ جس نے طلب کیا، اس کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ نظم، غزل، نعت، قصیدہ سب اصناف میں کہا، لیکن تلاش کرنے پر شاید ایک معقول مجلد کے لیے بھی اب ذیل سکے۔

سادات بگلام کو اہل بیت سے بہت محبت رہی ہے۔ راز مروج بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، چنانچہ نثریہ خوانی سے بہت شغف تھا، بلکہ فارسی "وہ مجلس" کے پڑھنے میں تو ان کی خاص شہرت تھی۔

تپ دق کے مرض سے ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کو بگلام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔
منو نے کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں:

بُتوں کی دباں پر کلامِ محبت بنا کعبہ حق، مقامِ محبت
علی کے لیے خود جہنم کہ رہے ہیں محبت کا پہلا ۱۱م محبت
کھل گئی بات، رخسار کے ماتھے آئی کچھ نہ کچھ پردہ اسرار کے ماتھے آئی
ڈور ہاتھا، مرا کعبہ نہ کہیں طور بنے شیریت ہو گئی، دیوار کے ماتھے آئی
قدت کی نظر کا کب کہنا سوار اٹھی، پھر مڑ بھی گئی
جو گرد پڑی تھی عالم پر لمحوں میں ہوا سے اڑ بھی گئی
دینے بالآخر دیکھ لیا بولودِ حرم کے صدقے میں
دیوارِ حرمِ قسمت کی دھن خود ٹوٹ گئی، خود جڑ بھی گئی

طالب کشمیری، اندلال کول

پنڈت اندلال کول طالب جن کا مختصر علامات کے بعد اچانک ۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو سرگرمی میں انتقال ہو گیا، کشمیر کے خاصے صاحبِ وجاہت طبقے کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت تھا کرپشاد کول تھا، جو ریاست کے بڑے زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ طالب کے دادا پنڈت دیوہ کول حکومت کشمیر میں دفتر دیوانی کے افسر علی تھے۔ وہ فارسی کے منہتی اور شاعر بھی تھے، دیوہ مخلص تھا۔ عربی میں بھی خاصی دستگاہ تھی اور سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کا ایک آدھ شعر بھی ملتا ہے۔ افسوس! ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ باقیاتِ صالحات میں سے فارسی کی چند غزلیں رہ گئی ہیں۔ شعرِ سخن کے علاوہ خوشنویسی اور مصوری اور نقاشی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اہل نظر سے خراجِ عتیں لے چکی ہیں، بشیرِ تصویریا سند دیوہ مالدار مذہب سے متعلق ہیں۔ ان کا ۱۸۹۲ء میں سرسنگرم میں انتقال ہوا۔ دیوہ کے والد یعنی طالب صاحب کے جدِ امجد اے راگھونا تھے کول بہت بڑے رئیس اور زمیندار اور ریاست میں وزارتِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

تذکرہ معاصرین

چندت نبد لال ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو حیدرنگر میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول علمی تھا؛ اس لیے ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی؛ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں بی۔اے، دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں ایم۔اے (فارسی) پھر ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل (فارسی) اور اسی کے ساتھ ایم۔اے۔اے اور ادیب فاضل (اردو) کے امتحان پنجاب یونیورسٹی سے باقیاد پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور دوسری پڑتاپ کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس سال یہاں سے سکولوش ہو کر امرنگھ کالج میں پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی و اردو ہو کر چلے گئے؛ یہاں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک کے تین برس جوں و کشیر یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں جوں و کشیر کلچرل اکاڈمی سے بھی وابستہ ہو گئے۔

جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس میں شعر گوئی کا شوق لایہ نہا، لہذا یہ بھی کم عری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے کچھ دن دبیر تخلص کرتے رہے؛ پھر اے بدل کو طالب کر لیا۔ شروع میں منشی رام سہاے تمنا مکھنوی (ف ۱۹۳۲ء) سے اصلاح لی، جو منشی دودا کا پرشا و افق (ف ۱۹۱۳ء) کے بھائی اور منشی بشیشور پرشا و منور، مکھنوی (ف ۱۹۰۷ء) کے چچا تھے۔ تمنا سے اصلاح کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ اس سال انھوں نے چندت برج موہن و تاتریہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) کا تلمذ اختیار کیا۔ کیفی مرحوم نے اپنی وفات سے بدقوں پہلے انھیں فارغ اصلاح قرار دے دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے بھی شاگردی کا تعلق رہا؛ یعنی دہلوی اور سیاب دونوں سے بیک وقت استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے کیفی مرحوم سے تلمذ کا ایک شعر میں ذکر بھی کیا ہے:

حضرت کیفی کی شاگردی چہ نازاں کیوں ہو
میں ہوا طالب، تو غشا، فیض و حانی مجھے

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے: (۱) رشتات التخیل یعنی کلام طالب (بدایں ۱۹۲۵ء) اور (۲) مرتجع افکار (بدایں ۱۹۵۲ء) اس کے علاوہ (۳) تراث طالب کے عنوان سے ایک طویل مسدس بھی شائع ہو چکا ہو۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے اردو میں پرتھوی راج چوہان کی سو انگریزی کھنٹی، طالب نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ کشمیر میں فارسی کے ایک شاعر ہوئے ہیں پنڈت راجہ کول عرض بگی، وہ دیرری تخلص کرتے تھے، بہت مختصر کلام ہے۔ دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ طالب صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ ایک کتاب ادب ایران میں کشمیریوں کا حصہ، کے عنوان پر شائع کی تھی۔

پنڈت برج کشن کول، پنجبر اور پنڈت بکسویں رینہ شوق نے ’بہار گلشن کشمیر‘ کے عنوان سے کشمیری پنڈت شعرا کا ایک تذکرہ دو جلدوں میں شائع کیا تھا (۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء) طالب صاحب نے اس کے لیے شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مزینین کا بہت ہاتھ بٹایا تھا جس کا انھوں نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

طالب صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کر کے سرائے کلام غالب کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین تیار بھی کرائے ’’اے ادب‘‘ (بہمنی) میں شائع کیا تھا۔ اسی کو مرتب کر کے کتابی شکل میں ’جوہر آئینہ‘ کے نام سے چھپوایا۔ ابھی مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ منشر حالت میں ہے۔

انھوں نے آٹھویں صدی کی مشہور کشمیری شاعرہ ملا حارثہ کے کلام کا اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ملا کا کلام شیوی فلسفے پر مبنی ہے۔ طالب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ موضوع کی دقت کے باوجود اس میں کہیں اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یہ کتاب غیر مطلوع رہ گئی۔ آخری ایام میں ڈیہ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ یہ غالباً ناممکن ہو گئی۔ اچھا ہو کر جتنا حصہ بھی لکھا جا چکا ہے، اسے شائع کر دیا جائے۔ اس سے دھڑلے کی منت ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیگی، بلکہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے بنیاد

سبھی شایستہ ہو گئی۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے جیسا کہ 'بہار گلشنِ بشیر' کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ "مترق افکار" میں بھی کچھ فارسی کلام موجود ہے۔ خدا معلوم سارے فارسی کلام کی مقدار کتنی ہو بہر حال یہ بھی غیر مطلوب و ردہ گیا۔ بہت سے مضمون مختلف رسائل و جرائد میں منشر ہوئے ہیں۔

انھیں علمی خدمات کے جلد میں صدر جمہوریہ سند نے اس سال انھیں فارسی کا انعام (تین ہزار روپے سالانہ) عطا فرمایا تھا۔ وہ ۴ اکتوبر اس کی سند لینے کو دلی آنے والے تھے کہ چار پانچ دن کی مختصر علالت کے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۱۷ صبح ساٹھ سات بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے ماسی ملک بنگا ہو گئے۔ ان کی آخری کتاب جو ہر آئینہ بھی طبع سے نہیں آتی تھی؛ یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان کی موت سے ایک صلح کل اور شریف دوست، سہرورد اور شفیق استاد، اردو کا ایک خاموش خادم ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

نمود کلام ملاحظہ ہوا۔

ہر کوئی محو تماشاے جمالِ یار ہے	ناچتی بھرتی صبا ہے، اور گاتی ہے بہا
غیر و سرسبتہ کہنے کو ہوا پنا حال	ماذ کیلوں کی جنگ سے کہناتی ہے بہار
جس کو رفیق سمجھے تھے، شتر سے کم نہیں	پہلوں ایک خار ہے میرے بجائے مال
چپن کا اک رفیق تھا اب وہ بھی چھٹ گیا	دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنا دل
زخمِ جگر کی تشنگی اے ہنشیں! نہ پوچھ	ہر شورِ نالہ شورِ نمکداں سے کم نہیں
بے اضطرابِ شوق، نقابِ رخِ امید	سازِ نگاہ، پر وہ مرگاں سے کم نہیں
لطفِ جفاے یار کا نقشہ نہ کھینچ سکا	کس کام کی ساری یہ طبعِ لطیف ہے
دیکھا جو وقتِ نزع، کہا: "مے رہا ہر دم"	طالبِ بہانہ ساز کبھی ہے اور ظریف ہے

تذکرہ معاصرین

ہو میرے رنج و راحت کا ذیادہ برا زواں کوئی

دستے ہائے محشر میں بھی میری داستان کوئی

عناصر کے نفس کی تیلیاں اک روز ٹوٹیں گی

ابھی سے ڈھونڈ لے مکہ حدم میں تو مکان کوئی

بند رکھتا ہوں زبانی التجا، شوقِ سکوت

اب وہ سولے محبت سر سے ہی جاتا رہا

اپنی بڑھت گئی ہیں چشمِ حیراں ہو گئیں

ہفتیں رنجِ دالم سے پانچ لاکھ ہو گئیں

رباعی

دنیا تو دہانِ بالِ جاں ہے پیری کے لیے

طالبِ پیری میں کب کوئی ساتھ چلے

ہے خواہشِ پردہ ازاں سیری کے لیے

ہاں ایک عصا ہے دستیگری کے لیے

عارف عباسی بلیادی۔ قاضی محمد عثمان عباسی

ان کا شجرہ نسب میرا نسب حضرت عبداللہ عباس سے ملتا ہے۔ یہ خاندان پہلے چرباکوٹ (ضلع انظم گڑھ) میں مقیم تھا۔ ضلع بلیا میں ملتھرا روڈ ریلوے اسٹیشن سے کوئی چار میل دور ایک گاؤں پسوہاری ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ چرباکوٹ سے نقل مکان کر کے پسوہاری میں آئے۔ یہاں حکومت وقت نے ان کی مناسب قدر و منزلت کی نو سکند پور غزنی کی قضاۃ ان کے سپرد کر دی۔

عارف کے والد قاضی محمد سلیمان عباسی صاحب علم بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی کی تحصیل دیوبند اور دلی کے مدارس میں کی تھی؛ لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے۔ انھوں نے ساری عمر کہیں ملازمت نہیں کی؛ اپنی گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال میں مصروف رہے اور اسی اکل حلال پر قانع تھے۔

عارف صاحب یکم مئی ۱۹۱۲ء کو پسوہاری ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بمشکل سات آٹھ برس کی ہو گئی جب ان کے والد قاضی محمد سلیمان اللہ کو پیار سے ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی حسبِ درخواست ہو سکی۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ

- ذکرہٴ معاصرین -

کھٹنہ سے دسویں درجے کی سندلی اور اس کے بعد کرپھیں کالج بھٹنہ میں داخلہ لے لیا۔ انٹر میڈیاں تعلیم پائی اور اس کے بعد کھٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کی تھانی؛ لیکن گھر کے ناسازگار حالات نے تھیل کی فرصت بندی پر آخری سال میں یہ سلسلہ ترک کر دینا پڑا۔ پینالیا ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔

میرا وقت گئے لیے اب انھوں نے کالون تعلقہ دار کالج بھٹنہ میں مدرسہ کرلی۔ یہاں دلیان ریاست اور تعلقہ داروں کے نو بہاں تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ اس کالج کے حالات بھی دیگر گول ہو گئے، اوتھارف صاحب یہاں کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست ناپارہ اور محمدی تعلقہ (ضلع کیشری) میں صاحبزادگان کے اتالیق کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اس سال انھوں نے آخری مرتبہ غیروں کی غلامی سے مخلو خلاصی پائی۔

اس کے بعد انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ بقیہ زندگی اپنی آبائی کاشتکاری کی نگرانی میں لگے رہے۔ اس کے ساتھ کچھ تجارت کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے میلنارہ و ڈرلیوے اسٹیشن میں سینٹ کی دکان کر لی، جس سے بے غفلت اپنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ عزت اکبر د کے ساتھ گھر کا اجلا خرچ چل جاتا تھا۔

صحت بالعموم اچھی رہی، جو سادہ اور آزاد زندگی کا خاتہ ہے؛ لیکن وہ برس ہوئے ایجو کی موت (۱۵ اگست ۲۰۱۶ء) نے اس پر بہت برا اثر ڈالا۔ ۶ ستمبر ۲۰۱۶ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن بیودہ اپنے عزیز دوست حکیم سیف الدین کے پاس میرٹھ شہر گئے ہوئے تھے کہ وہاں دوسرا حملہ ہوا۔ اسی میں ۲۲ ستمبر ۲۰۱۶ء کو صبح ساڑھے پانچ بجے روح حق حاضری سے پردہ کر گئی۔ وہیں تدفین عمل میں آئی حکیم صاحب برصوف کے خاندانی قبرستان شاہ سلطان میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے، گویا میرٹھ کی مٹی ہی نے انھیں دلوں پہنچ بلیا تھا۔

تذکرہ معاصرین

اپنے ویسے اولاد جسمانی میں پانچ بیٹے اور ایک لڑکی یا دگا رکھوڑے۔ سب بڑے سعید انظر
الکبادیونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انھیں بھی علم و ادب سے شغف ہو۔ اور سعید عارفی کے
تعلیمی نام سے لکھتے ہیں۔

عارف نے شعر گوئی اگرچہ زمانہ طالب علمی ہی میں شروع کر دی تھی، لیکن اس میں باقاعدگی
۱۹۴۱ء میں آئی۔ ابتدا میں آزاد فچپوری اور حکیم سید باقر حسین شاعر لکھنؤی سے (ف ۱۹۴۲ء)
مشورہ رہا۔ بعد کو جگر مراد آبادی سے مستفلاً علم و اختیار کرایا۔ حبیب احمد صدیقی نے بھی
ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ وہ خوش فکر اور زود گو اور زود گو
شاعر تھے، مگر افسوس کہ کلام کی تندرستی سے متعلق بہت بے پروا رہے۔ چنانچہ کوئی مجموعہ
سچ تک شائع نہیں ہوا۔ ان کے بڑے صاحبزادے سعید عارفی اسے مختلف رسائل و
جرائد سے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

دولت کو نبین ہے، مگر غم میں طے	غم بھی وہ، جو ہر نفس بہیم طے
مجھ کو ہر غم سے ہو گئی ہے نجات	ترے غم کے یہ فیض، یہ برکات
وہ تو کہیے، ترے غم نے بڑا کام کیا	ورد مشکل تھا غم زبست گوارا کرنا
حسن کی فطرت، ممکن احتیاط	حاشتی، بیگانہ سودہ زبیاں
نظر آتی جو جس کی روشنی میں اک نئی منزل	خدا دیکھے اترا نقش قدم ایسا بھی ہوتا ہو
لالہ دگل کہیں خورشید و قمر ہوتا ہے	حسن ہر رنگ میں فردوس نظر ہوتا ہو
میری اس نیند پہ بیداری کو نبین منشار	آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پر سر ہوتا ہو
اب مٹی جاتی ہے یہ لذت ناکا ہی بھی	کیا قیامت ہو کہ آہوں میں اثر ہوتا ہو
ایک وہ بھی طلب و حقوق کی منزل ہو جہاں	حسن خود ساتھ مرے گرم سفر ہوتا ہو
انشاء اللہ، یہ مرے حسن بھٹو رکا فروغ	دل میں اک شمع سی روشن ہو تری یاد کے
وہ دوسنے زیبا، فردوس رنگیں	وہ قد و عنا، تکمیل محشر

حسن بستم، ناز گلستاں	موج نفس میں تسنیم و کوثر
ہر جنبش باب، اعجازِ فطرت	ہر لغزش پا، آشوبِ بخشہ
عمل بیگوارِ حق یقین ہے	بنائے زندگی جو خاکِ علم
ہے یقین کے دم سے روشن کائنات	اے اسیرِ حلقہ و ہم دگ
عکسِ خرم سے دنیا اندھیری	نورِ جنوں سے عالمِ سہری
جہاں تک جس کو احساسِ نظر ہے	وہیں تک حسن میں رعنائیاں ہیں
محبت میں محبت کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہو	کدولِ روتا ہو، اور سنبتے ہیں ہم ایسا بھی ہوتا ہو
محبت میں کسبِ چشمِ کرم بھی بارِ جوتی ہے	گلہ لکھ اشکِ شبنم کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہو
دہانِ عشق بن جاتی ہو اکھر شے ربانی بھی	لگا ہوں سے برس پڑنا ہو غم ایسا بھی ہوتا ہو
ہجومِ غم میں بھی عارفِ اسکوں محسوس کرتا ہو	غشی سے بھی الجھ جاتا ہو دم، ایسا بھی ہوتا ہو
بھونک کر میں نے آشیانے کو	رکھنی بخش دی زمانے کو
وہ تراغم تھا، جو سنوار گیا	زندگی کے نگارِ خسانے کو
جس کی دیوانگی مونا زخرد	کون سمجھائے، اس دمانے کو
کچھ حجابات اٹھ گئے عادات	کچھ حجابات ہیں اٹھانے کو
تری ہی سمت محبت کے قدم اٹھتے ہیں	موڑ آنے سے کہیں راہ بدل جاتی ہو!
کیا کیجیے اب اس کو کہ دل بیخود رہا ہے	لے دوست! میں اٹھنے کو تو اٹھا ترے در
کیا بات ہو آج ان کو نہ امت سی ہو عازا	کیا پا گئے وہ کچھ، مرے اندازِ نظر سے
دہرِ والدہ تسلیم و رضا ہیں یہ لوگ	شکوہِ غم تیرے شایستہ، غم کیا کرتے
وہ جو ناموسِ شفیق کے ہیں عارف!	وہ شناسخانی، بابِ کرم کیا کرتے!
عشرتِ نیم لگا ہی بھی غنیمت سمجھو	فرصتِ شوق کے لمحات کہاں ملتے ہیں!
دلِ حشرِ کدو جو، نظرِ شمعِ کدو	کس کی نگاہِ لطف ہو سائل، نہ پوچھیے

تذکرہ معاصرین

گم ہو گیا جو اپنے ہی جلوؤں کے حسن میں اس کامیابِ دید کی مشکل زد پوچھیے
وہ نگاہِ مست کی گردشیں کہ ہزار جامِ شاد ہوں

وہی دورِ بادۂ بے سبب، تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
نہ کون تھا کسی حال میں، نہ قرار تھا کسی رنگ میں

تھیں پا کے بھی وہی جستجو، تھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

منظر اکبر آبادی شمشاد حسین صدیقی ۔

منظر، اردو کے مشہور شاعر جناب بیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں پائی۔ لیکن کمزوری صحت اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوئی۔ بیاب مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کانپور کے بعد اجیرا ٹونڈلہ، آگرہ وغیرہ میں رہے۔ منظر کا بچپن بھی انہیں مقامات میں بسر ہوا۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں یہ وہاں کے ریلوے ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے، لیکن ابھی دسویں درجے تک نہیں پہنچے تھے کہ بیاب وہاں سے چلے آئے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اور سب کام سمیٹ کر اٹھا کر آگرہ میں قصر الادب کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ حمیاد جاری کیا۔ منظر اپنی کمسنی کے باوجود اس ادارے سے وابستہ ہو گئے، اور یوں تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد کچھ فارسی حربی اور اردو مدرسے عالیہ، جامع مسجد آگرہ اور مدرسہ محمدیہ آگرہ میں حاصل کی۔

قصر الادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے جن میں ہفتہ وا

تذکرہ معاصرین

ساج، ثریا، شاعر، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیائی خاص طور پر شہرت حاصل کی۔
منظر کسی ایسی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً چند برس تک ایشیا
کے ایڈیٹر رہے۔

جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اس میں شعر گوئی گویا لازماً حیات تھی۔ یہ بھی
بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے،
لیکن زیادہ مرادلت نظم سے رہی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں سیالپور کا کراچی میں انتقال ہو گیا، تو منظر صاحب ان کے سے پاکستان
چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ایک ہفتہ وار پرچم کے نام سے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ
واقع ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ادبی
وظیفہ ملتا تھا۔ چند سستی ادھر بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی ضیق النفس کا عارضہ تھا۔
لیکن اس کے باوجود بظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اپنا تک ۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء شنبہ کی رات
کا شدید دورہ پڑا جس سے تک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اور دس منٹ بعد آٹا فانا
ساڑھے دس بجے روح تعالیٰ عظمیٰ سے پرواز کر گئی۔

کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

اب ہونے کے چند شعور دیکھیے، جو مختلف مسائل سے جمع کیے گئے ہیں،

میں پوچھتا ہوں یہ کونیا کے بارادوں سے وہ کیا کرے کہ جو ناکام آرزو ہو جائے
جسے منظور ہو بر باد ی مطلق، منظر! آئے تو وہ جامہ ہستی کا گریباں ہو جائے
لو کہیں تھا کہ تھی ہر چیز پر اک سا دل ظلمی جوانی ہو کہ اک دنیا جواں معلوم ہوتی ہو
عبادت ہو کہ سجدے ڈر کر تہوں خدا کو جس طبیعت ہو کہ اب تک بہت پرستی کو ترستی ہو
دیکھیے، کس نام سے ہوا کہ مرگ، عاشقی نام میری تجوی دی کا زندگی مشہور ہو
تھا کہ چپ پنضا خاموش کھلے شب کا شام مناسب وقت ہو دل چاہتا ہو اک کائنات

اب کہیں تیری تمنا کا ٹھکانا بھی نہیں
دیکھ انجام، تناؤں کے ٹھکرانے کا
مراد مل گئی تو زندگی کو رو بٹگی دنیا
نشاطِ محفلِ ہستی عبارت ہو مرے دل سے
عجب ایک چیز جو انسان کو بنا بھی نہ ہوا بھی
جہاں آباد ہوتا ہے وہیں برباد ہوتا ہو
کبھی مثلِ غیرِ رسماً مرا حال پوچھ لیتا
جو نہ چارہ ساز تھا تو زمانہ ساز ہوتا
بباد کو کے دے نہ فریب التفات کے
اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے
جب میں نہ تھا تو دل کا لغتین محال تھا
جب دل نہ تھا تو آپ کے جلوے کہاں رہے
جدید ہو کوئی تصویرِ زینِ عظمت میں
بنا بنا کے ہیولے مٹائے جاتے ہیں
بیکار ہو جنوں سے بھی فرصت اگلے
اب اتنی دور لوٹ کے جائیں تو گھر طے

سامی، ہادیو پرشاد

ہردوئی (روپی) کے ایک متوسط الحال کاسٹہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام دیوی پرشاد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے شامہادیو پرشاد تھے اور چھوٹے ہی ہادیو پرشاد۔ ہادیو پرشاد ۲ جولائی ۱۸۹۵ء کو ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم جوہلی ہائی اسکول، لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ لیا۔ بی ایس سی آخری سال میں تھے کہ والد جوہلی بسے۔ چونکہ اس کے بعد مالی حالت ٹھیک نہ رہی، اس لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب انھوں نے ضرورتاً فیض آباد کے ایک اسکول میں نوکری کر لی جس کے بعد داخل اسکول، جیلپور میں منتقل ہو گئے، اور پھر گویا عمر بھر کے لیے یہیں کے بورے۔ ۱۹۲۰ء میں جوہلی تعلیم نے انھیں تدریس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے منتخب کیا، جس کی سند اسپینس ٹریننگ کالج، جیلپور سے سند حاصل کی، اور اس کے بعد وہیں گورنمنٹ کالج ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔

۱۹۳۹ء کے اوخر میں تھکڑی بھاجیلپور نے انھیں تھکڑی سٹی کالج میں اردو تدریس کا کچر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو یا فارسی میں ایم اے نہیں تھے۔ اس لیے

تذکرہ معاصرین

یونیورسٹی اپنے قواعد کی رو سے ان کے انتخاب پر بجا طرہ پر اعتراض ہو سکتی تھی، لیکن ان کی مسئلہ قابلیت اور تجربے کے پیش نظر ناگزیر یونیورسٹی کے ابوابِ حل و عقد نے استثنائی طور پر ان کے تقرر کی اجازت دے دی۔ اس پر انھوں نے جنوری ۱۹۴۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بقیہ عمر کا ہتھکارتی کالج میں گزار دی۔ اپنی ترقی و صحت اور ہزار سال کے باعث وہ یہاں سے ۱۹۷۰ء میں سکندرشہ ہونے۔

پچھلے کئی برس سے ان کی صحت نشانی خراب تھی۔ ان کی تڑھکی پڑی میں کچھ نقص پیدا ہو چکا تھا، جس سے گردن میں بھی کئی آگئی تھی۔ مزید مصیبت یہ کہ کئی حالات بھی بہت ناخوشگوار ہو گئے۔ خانگی جادو اس سے متعلق کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا اور نوبت حدالت تک پہنچی۔ مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اور وہ پریشان رہنے لگے۔ اسی زمانے میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے متواتر حملے ہوتے رہے۔ آخری حملہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ہوا اور اسی دن سپر کے پانچ بجے وہ میڈیکل کالج میں جان بحق ہو گئے۔ لا ولد فوت ہوئے۔

جبکہ ذکر ہوا وہ گھر کے ناموافق حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن خدا داد ذہانت اور ذاتی جدوجہد سے انھوں نے یہ کمی پوری کر لی۔ سائنس کے وہ طالب علم رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں ان کی مہارت کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کئی ایچ ڈی کے طلبہ اور پروفیسران سے مشورہ کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی جب سے وہ بہت دن تک مدھیہ پروفیشن کے فارسی عربی بورڈ کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔

شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ جب شعر کہنے لگے، تو افتخار الملک مضطر خیر آبادی سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہ ایک نعتیہ نظم (ردیت حسنہ) کے علاوہ جو جذباتی

کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا؛ اتنا اطمینان ہے کہ وہ محفوظ ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

اس نصیبتہ نظم کی شایع نزول یہ ہے کہ فروری ۱۹۲۷ء (یعنی شب ۵/۷ شعبان ۱۳۴۵ھ) کو مغرب کے بعد ایک ستارہ ٹوٹا اور آسمان آسمان کی روشنی سے آسمان پر لفظ ”محمد ظاہر ہوا۔ یہ منظر کم و بیش آدھ گھنٹے تک دکھایا گیا اور پھر تندرج تدمم ہوتا ہوا سٹ گیا۔ یوپی اور مدھیہ پردیش (سی پی) کے متعدد شہروں میں ہزاروں اشخاص نے اسے دیکھا۔ اس زمانے کے اخباروں میں بھی اس کا بہت چرچا رہا تھا۔ اس سے متعلق کیم مارچ ۱۹۲۷ء کو جیلپور میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، جس کے کوائن ستارہ محمدی کے عنوان سے علی احمد جیلپوری نے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں سامی کی اس نظم ”رویت حسد“ کے علاوہ تین فارسی رباعیاں، ایک فارسی قطعوں اور ایک فارسی نصبت بھی شافی ہیں۔ یہ نظم ”رویت حسد“ انھیں آیام میں اجذب بات سامی کے عنوان سے بھی چھاپی گئی تھی۔ یہ مسدس کی شکل میں ہے۔ اس میں سترہ بند (۱۵ شعر) ہیں۔

غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں

سامی کی حقیقت کیا، احباب کی شفقت ہے

اچھوں کو تو اچھا ہی اچھا نظر آتا ہے

عشق میں لٹتے ہیں اکثر کارواں منزل کے پاس

غرق ہو جاتی ہیں اکثر کشتیاں ساحل کے پاس

تم تھے، تو نگاہوں میں دیرانہ گلستاں تھا ہم آج گلستاں کو دیرانہ سمجھتے ہیں
اک ہمہیں کہ غیور کو اغیار نہیں سمجھا اک آپ ہیں انہوں کو بیگناہ سمجھتے ہیں

نیکوں کے بھی برے اب بدی سے ملتے ہیں

دوستی کے سب پہلو دشمنی سے ملتے ہیں

تذکرہ معاصرین

انہیں غرض کہ حد میں نہیں غریبوں کی یہ بخودی تھی ہماری جو ہم بکا آئے
 ایسی پیش سے تو بہتر تھا غافل تیرا حال یوں پوچھا کبھی جیسے فسادانی نہ تھی
 اب انہیں میری دعا کا اعتبار آیا، تو کیا! بعدِ مردن، مژدہ دیدار بھی آیا، تو کیا!
 جہاں سارا ترا آئیے صورت نہ نکلا کہ جس بت کو نگاہِ غیر سے دیکھا، خدا نکلا
 ایک درجہ جو کچھ کہ نہ سکا تھا ساسی میں درِ حضرت مضطر پہ جس میں سانس ہوا

افقر موبانی اسید محمد حسین

محبوب النبی حضرت نظام الدین اولیاء (ف ۷۳۲ھ) کے خلیفہ حضرت نصیر الدین (ف ۷۵۶ھ) چراغ دہلی کے نام سے کون صاحبِ علم واقف نہیں ہوگا! انھیں کے خلیفہ اور جانشین حضرت سید محمد گیسو دراز تھے (ف ۷۴۲ھ) جن کا مدفن گلبرگ میں ہو۔ ان سے آگے یہ سلسلہ طریقت جلالہ ان کے خلفائے سید حضرت شہ شاہ عبد الحکیم عرف دادا میاں اولیاء بہت دن کا سپی (ضلع جالندھر) میں مقیم رہے اور پھر ۸۵۰ھ میں وہاں سے نقل مکان کر کے قصبہ موبان (ضلع آٹاڑی) میں آقامت گزری ہو گئی۔ یہی دادا میاں ہمارے شاعر سید محمد حسین افقر موبانی کے جدِ علی تھے۔ حضرت دادا میاں کی آنکھیں پشت میں افقر کے دادا مولانا شاہ غلام علی پیر نادہ عرف میاں جی ہوئے۔ پری مریدی کا یہ سلسلہ رشد و ہدایت انھیں ختم ہو گیا۔ ان کے جانشین مولانا سید اکرام علی افقر موبانی کے والد تھے۔ یہ ۱۸۴۵ء میں موبان میں پیدا ہوئے! انھوں نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والد یعنی حضرت میاں جی سے پائی۔ وہ حاجی تویہ تبادہ نشینی جاری رکھتے، لیکن انھوں نے یہ سلسلہ بیعت قائم نہیں رکھا، اور خود سید حاجی دارت علی شاہ دیوبند (ف ۱۹۰۵ء) کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

تذکرہ معاصرین

انھوں نے قصبہ موہان اور قریب و جوار کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں پنجو دیں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص تھا۔ انفر صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا کلام دیوان کی شکل میں مرتب نہ ہو سکا، صرف کچھ اوراق میرے پاس موجود ہیں۔

انفر صاحب کا انھوں نے خود مجھے اطلاع دی تھی ۱۳ جولائی ۱۸۸۷ء کو اپنے وطن مولویہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے محمد حسین کے علاوہ ان کا تاریخی نام ظفر وارث بھی رکھا جس سے ۱۸۷۸ء برآمد ہوتے ہیں، ان کے بچے مختلف معاصرین آخر تک انھیں اسی تاریخی نام سے کا رہے۔ انفر کی ناخیاں قصبہ آسیون (ضلع ۱۰۱) میں تھیں۔ چنانچہ ان کی ابتدائی تعلیم یہیں اپنے اموں مولانا ضیا الدین قادری کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے بعد یہ موہان آگئے اور اب دینیات اور دوسرے علوم رسمہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ انھوں نے مقامی اردو مڈل اسکول سے ۱۹۰۱ء میں بھرپور اساتذہ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں وہ مستقل لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انھوں نے حکیم عبدالعزیز (بھوانی ٹولہ) سے طب کی تعلیم پائی، لیکن انھوں نے کبھی باقاعدہ مطلب نہیں کیا۔ جب فکر معاش ہوئی، تو ۱۹۰۷ء میں مطبع نو کشور میں مصحح مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک رہا۔ کئی سال بعد سرکاری ملازمت مل گئی اور وہ کورٹ آف وارڈس میں ضلع دار مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد تحصیل میں ناظر اور وکیل باقی نہیں کے عہدوں پر بھی رہے، ان کا زیادہ تر طالع مطبع آباد (ضلع بکھنؤ) میں گزرا۔

انفر ۱۹۱۲ء میں بمبئی چلے گئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ وہاں کے ایک سچے حاجی منشی محمد حسین لکھنؤ آئے جب وہ مطبع نو کشور گئے، تو یہاں ان کی ملاقات انفر سے ہوئی۔ منشی محمد حسین کا ایک ہفتہ دار پرچہ مفید روز گار تھا، وہ اس کے لیے کسی

ایڈیٹر کی تلاش میں تھے۔ جب وہ انقر صاحب سے ملے تو انھیں بہٹی آنے اور مفید لکڑی کی امداد منجھانے کی دعوت دی۔ انقر نے اسے قبول کر لیا اور اپنی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ ہو کر بہٹی چلے گئے۔ یہاں وہ تین برس ۱۹۱۵ء تک رہے مفید روزگار، کے ایڈیٹر تھے ہی، منشی محمد حسین کے ایسا پرانے دوستوں نے ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پنچ، بھی جاری کیا۔ لیکن بہٹی کی مرطوب آب و ہوا انھیں راس نہیں آئی، اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ بالآخر انھوں نے تنگ آ کر ان صحافتی سرگرمیوں پر لات ماری اور لکھنؤ کی راہ لی۔ اس سے معاش کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بارے مطیع نوکشور کے تنظیم نے دستگیری کی اور یہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں وہ ڈسٹرکٹ گزٹ کے مدیر ہو کر گونڈہ چلے گئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کا زمانہ تھا، ان دنوں کے خلاف حکومت کے پراگندہ سکیشن نیزی سے کام کر رہی تھی، اور اس کام کے لیے سب ضلعوں سے گزٹ شائع ہونے لگے تھے۔ گونڈہ گزٹ بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۹۱۷ء میں یہ گزٹ بند ہو گیا اور انقر صاحب لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں ان کا لمبا داماد لے دے کے نوکشور چھاپہ خانہ تھا، اب کے انھیں صحافتی تجربے کے پیش نظر روزانہ اودھ اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

اس زمانے میں سید جالب دہلوی (ف جولائی ۱۹۱۳ء) لکھنؤ میں ہندم اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ انقر صاحب سے ان کے دیدہ وارید کے تعلقات تھے، جالب کے مشورے سے انقر نے ہندم اخبار میں جہاں نما جاری کیا، اس کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۱۴ء میں نکلا تھا۔ اس میں لکھنؤی اسلوب بیان اور طریق سخن پر بڑی کردی تنقید شائع ہوئی، جس سے یہاں کے شعرا اطمینان سے، اور انھوں نے انقر کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا۔ مخالفین کے نام لکھنے سے فائدہ؟ یہ سمجھیے کہ عزیز، آزاد، رنجو، مولانی، آسنی، الدی، امید، شیو

وغیرہ تو البتہ غیر جانبدار رہے، نقیبہ کفر بآ تمام پڑے اور چھوٹے شاعران کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن اصغر گوٹروی، 'بچو دمو دانی' اور اثر کھنوی جام جیاں نلکے متا مضمون نگار تھے۔ جب کھنوی شعر کی دھکیاں مہو و ثابت ہوئیں تو متعدد حضرات نے تنک عزت کے مقدمے دائر کر دیے۔ انقر نے ان کے ادھے حملوں کے آگے متحار ٹانھے سے انکار کر دیا اور ڈوٹ کر مقابلہ کیا؛ اور بالآخر مخالفوں کو ہر میدان میں دگ اٹھا نا پڑی۔ یہ پوچھ اپنی پوری آن بان سے ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔ اس کے مندر جو جانے کے بعد وہ پانچ چھ برس تک پڑھاتے رہے، جہاں سے ۱۹۵۵ء میں سکدوش ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں اثر پردیش کی حکومت نے ان کا ایک سو دو پیہ مام زاد دی وظیف مقرر کر دیا جو انھیں اپنی دفات تک مل رہا۔ تو کل اور صبر و شکر انھیں ورثے میں ملا تھا؛ اس لیے اس قلیل وجر معاش کے باوجود انھوں نے کبھی شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی حضرت وارث علی شاہ (ادیوہ) کے مرید تھے۔ ان کے نام کے ساتھ وارثی کا اضافہ اسی مناسبت سے تھا جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، انھیں علی ہوگا کہ وہ بالعموم ایک گیر و اتہد باندھے رہتے تھے۔ یہ بھی وارثی گروہ کا امتیازی نشان ہے۔ ان کے کمرے میں عین پٹنگ کے اوپر حضرت وارث علی شاہ کی ایک تصویر لگی رہتی تھی، اگرچہ اس پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔

انھوں نے اپنے پیر کی یاد دنانے کو ۱۹۵۵ء میں سالانہ طری مشاعرہ کی بنیاد رکھی تھی؛ یہ مشاعرہ اپریل کو ہوا کرتا تھا۔ اسے وہ اپنی زندگی بھر باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مصراع طرح ہمیشہ ہرچ شمن سالم میں ہوتا اور قافیہ آسان۔ اس کے لیے وہ شاعروں کو دعویتنامہ بھیجتے تھے؛ اور ان شاعروں کے علاوہ اور کسی کو کلام پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

چونکہ وہ بہت کم زور پنے لگے تھے اور کمزوری روز بروز بڑھتی تھی؛ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ اب وہ

زیادہ دل جیسے کے نہیں۔ چنانچہ آخری مشاعرے کے موقع پر انھوں نے اپنے احباب اور تلامذہ سے ان کے نام لے کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس مشاعرے کو آئندہ بھی جاری رکھیں۔ سال رواں کے مشاعرے میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہ ہوں گے۔ وہی ہوا۔

کمرسنی کا عالم تھا۔ ۸۴ برس کی عمر میں انتقال کے معیارِ عمر کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہو۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ قانچ کا حملہ ہوا جس سے وہ بہت معذور ہو گئے۔ سال گذشتہ دوسرا حملہ ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب دونوں کے ہاں ہیں، لیکن موت کا جہانِ قلبی دورہ ہوا۔ وہ ایک زمانے سے حملہ لاش کھن (ماسوں بھانجے کی قبر کے موڑ پر) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ یہیں انتقال کے دن ۲ نومبر ۱۹۶۹ء ۱۲ رمضان ۱۴۹۱ء کو بعدِ مغرب انتقال ہوا۔ تدفین اگلے دن (۳ نومبر) بعدِ ظہر ہوئی۔ نمازِ جنازہ ان کے رشتے کے بھتیجے محمود اختر دارلش نے پڑھائی۔ عیش باغ کے قبرستان میں قبر نصیب ہوئی۔

ابھی وہ تارِ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انھوں نے (۱۹۰۰ء میں) شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا شعر تھا :

دل غنی ہے تو مفلس کیا ہے

گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے

یہ شعرا کے خاندان کے مذہبی ماحول کا ترجمان ہے جس نے ان میں یہ لکھنؤ گئے ہیں یہاں یکم ضامن علی جلال (ف ۱۹۰۹ء) اور منشی امیر اللہ تسلیم (ف مئی ۱۹۱۱ء) دو صاحبِ فن تلامذہ موجود تھے۔ چونکہ افقر کوہن (ف ۱۸۵۲ء) کے ظام اسے شغف تھا اس لیے انھوں نے تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ تسلیم خود نواب اصغر علی خاں نسیم (ف ۱۸۶۶ء) کے شاگرد تھے جن کا ہومن کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح افقر کا سلسلہ سخن تیسری پشت میں ہومن سے جا ملتا ہے۔ اصغر گوہن (ف نومبر ۱۹۳۶ء) اور حسرت کو

(ف ۱۹۵۴) ان کے خواجہ تماش تھے۔ انقرہ ۱۹۰۵ء کے آخر میں تسلیم کے شاگرد ہوئے؛ حسرت ان سے دو تین سال پہلے شاگرد ہو چکے تھے اور اس صغر گوشتہ کی دو تین سال بعد آئے۔

ان کی کچھ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں: (۱) رسائل قصوف، پانچ حصے (لکھنؤ ۱۹۱۵ء)؛ (۲) عید کی ڈالی (لکھنؤ ۱۹۱۷ء)؛ (۳) سعی عمل (نظفیں) (الہ آباد ۱۹۲۲ء)؛ (۴) مختصر سوانح عمری حضرت حاجی وارث علی شاہ (لکھنؤ ۱۹۳۳ء)؛ (۵) فردوس معانی (پہلا دیوان) (لکھنؤ ۱۹۲۶ء)؛ (۶) رہنماے شاعری حصہ اول (لکھنؤ ۱۹۲۶ء)؛ (۷) نظر گاہ (دوسرا انتخابی دیوان) (لکھنؤ ۱۹۲۶ء)؛ (۸) رہنماے شاعری حصہ دوم (لکھنؤ ۱۹۲۶ء) ان میں سے دو کتابوں پر ۳ اور ۷ پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپے انعام عطا ہوئے۔ ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ بڑا ہے جس سے ایک مجلد تیار ہو سکتا ہے (نظارہ اس کے شائع ہونے کا امکان اب کم ہی ہے۔ اور جو انھوں نے تصنیف کی تقلید میں شاگردوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیا، اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے!

انقرہ کو زبان و بیان و عروض پر باہر نہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہے جن کی بدولت ان کا نام روشن رہیگا۔ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر سلام مندیلوی بھی ان کے شاگرد ہیں۔

جسمانی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ محشر سولانی تھے۔ وہ طب کے فارغ التحصیل تھے اور طبیب کی حیثیت ہی سے لازم ہو گئے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ انقرہ اس زمانے میں حج کو گئے ہوئے تھے، وہ ان کی غیر حاضری میں فوت ہوئے۔ ماشاء اللہ ان کی اولاد موجود ہے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں شادی شدہ اپنے گھرانوں میں موجود ہیں۔

کچھ کلام بطور نمونہ دیکھیے:

وہ کیوں جانے لگا دیر درم کی ٹھوکر کی کھانے

تسے انقرہ کو میرے سیکدے پر ناز ہو ساقی!

یکتائیِ جمال کی اللہ سے دستیں سو جلوے ہیں بطرِ دیگر، کچھ نہ پا چھے
 بھی کو جویاں جلوہ سرمانہ دیکھا برابر ہے دنیا کو دیکھانہ دیکھا
 معاذ اللہ نزاعِ دیر و کسب بھگد اللہ درِ میخانہ آ یا!
 موت کے ڈر سے کانپنے والے موت ہی حاصلِ حیات نہ ہو
 ہو کر م میں نہیں ستم نہ کہیں! اتنا ممنون التفات نہ ہو
 لابسِ آواں جائیں چھوڑیں خدوں کو نہ تم بات والے، نہ ہم بات والے
 وہ ہونگے جہاں صبح کی بات ہوگی جہاں ہونگے ہم، رات کی بات ہوگی
 جو کچھ چار منگوں کو ہم جباتے ہیں وہ گلچیں و صیاد کم جباتے ہیں
 دل فنی ہے، تو مغلی کھیا ہے گھر میں اللہ کے کئی کھیا ہے
 یوں تو تمام رات تو پتے کٹی، مگر گوری جو دل پہ دقت بھر کچھ نہ پا چھے
 اس کی دنیا کا عالم نہ پوچھو جس کی دنیا تمہاری نظر ہے
 کسی نے نہ پہچانا ان کو اسی سے ہزاروں تھے جلوے، اگر ایک کھیا ہے
 ہے مقصودِ دیر و حسم ایکٹ لیکن وہ کافر نے، جو کچھ شیخ جی سے
 ہر کے ان کا وحشی داستان کچھ اور جھتا ہو نہیں ہوتا جہاں کوئی وہاں کچھ اور کھتا ہو
 سب کچھ ہوا اور کچھ نہیں ساماں تھے بغیر دنیا ہے ایک خواب پریشاں تھے بغیر
 شکل نہیں ہے کوئی بھی ہوتے ہوتے جڑے شکل نہیں ہو کوئی بھی آساں تھے بغیر
 جینا ہی کچھ حال نہ تھا تیرے، بھر میں مرنے بھی اپنا اب نہیں آساں تھے بغیر
 ہوتا گی حضورِ جاناں سے دور تر وہ جو کشاکشِ حق و باطل میں رہ گیا
 گبر مومن کو تو کافر کو مسلمان کرے جس کو جو چاہے وہ غارتگر یاں کرے
 اللہ ری تقدیر کی ناکامی پیہم یوں بیٹھا ہوں اب جیسے کوئی کام نہیں
 سنی تو اس نے غیروں سے ہوا گو بیگاناں ہم بہر صورت رہی بہتر ساری داستان ہم

جہلی جن جانماں کی نہیں موقوف ایمں پر جہاں محسوس کرتا ہوں وہ میں معلوم ہوتی ہو
 فکر دنیا، فکر عقبی، فکر حق، فکر حسن جادوں کی زندگی، افکار ہے، کیا کیا کھیے
 خفا وہ ہیں، اجل و قحطی ہوا دل بتیا یہاں محفل اٹھائے کتب تک یہی زندگی کی سختیاں کی
 اس کی نہیں خدائی کر اس کا خدا نہیں تم جس کو مل گئے اسے پھر کیا ملا نہیں
 تے بلب سا غریب دست و دم بسر لغزش بیجا میکہ دے جو بھی نکلا، میکہ ہر دوش تھا
 میں کہو نگاہ پریشانی بھلا طر، نا صبح! اور اس نے جو مرا حال پریشاں دیکھا!
 دامن کا چاک، حبیب کا چاک، آستین کا چاک سب مل گئے ہیں جاگ بگیاں کے آسٹیں
 گھٹتے ہیں جناب شیخ جب نیچے سے ہو کر نہیں کہتے زباں سے کچھ، گراں دیکھتے ہیں
 جبین شوق، ابد مجھ سے امن کو بستی ہر ایک نقش قدم، نقش پاسے یاد نہیں
 تمہارے وعدے کا ہولا کہ اعتبار، مگر وہ کیا کہے، جسے قسمت پر اعتبار نہیں
 دلکش یوں ہی تھی میری جنت کی رازخان دنیا کا اس پر حسن بیاں کچھ نہ پوچھے
 فقر کو اس کے حال پر رہنے بھی دیجیے بس جان کر خراب جہاں کچھ نہ پوچھے
 خدا رکھے، غضب کی دلکشی دنیا میں ہو، لقرا، جو کلیک کا وہ دے کہ جان اس محفل سے نکلیگا
 میں کہے کو ترے کچھ زائد کہتا نہیں میں یہ کہتا ہوں

ہوئے ہوئے ان کی چو کھٹک سزا وہ کہیں خم کوں کرے
 مل جاتا ہے جو راہ میں کوئی غراب عشق، ذکر اس کا چھیر دیتے ہیں پٹریں اسی سے ہم
 جناب شیخ نہ فرمائیں کچھ یہاں، "القر!" یہ میکہ ہے، مشائخ کی خانقاہ نہیں

سید عبداللطیف (ڈاکٹر)

ڈاکٹر سید عبداللطیف بروز جمعہ ۶ صفر ۱۳۰۹ھ (۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء) کو کراچی (تامل ناڈو) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید جلال الدین محمد دوم جہانیاں جہان گشت تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جہانیاں یہاں گشت اثنا عشری امام دہم حضرت علی نقی (ت ۲۵۴ھ) سے دسویں پشت میں تھے، لیکن فرشتہ سے قبل کی کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کا ذکر نہیں ملتا، نہ خود جہانیاں جہان گشت کے ملحوظات ہی میں کوئی اس طرح کا دعویٰ ہے۔ بعد کے مصنفوں نے فرشتہ کی تقلید کی ہے، لیکن ہر جگہ درمیانی کڑیوں کے ناموں میں اور سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ملتے ہیں۔ اس خاندان کے جو فروع سب سے پہلے ہزارستان آئے، وہ محمد دوم جہانیاں جہان گشت کے دادا سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ابن سید علی ابوالموید تھے۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بخارا سے ہجرت آئے۔ یہاں سے ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہار الدین دگر سے علوم باطنی کی تحصیل کی۔ ملتان سے اوچے گئے، جو بہار پور سے ۳۸ میل دور دریائے ستلج اور جناب کے سنگم پر ایک مختصر ماحصبہ ہے۔ یہ کسی زمانے

میں بڑا علمی مرکز نہ رہا ہے۔ سید جلال سرخ بخاری کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوا۔ وہ اچھڑی میں مدفون ہیں۔

خندرم جہانیاں جہان گشت بن سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاری کے حالات سے اہل دل کے سینے روشن ہیں۔ وہ صاحب علم و قلم اور بزرگ و مہمونی تھے۔ ان کا بعمر ۷۷ سال چھارہ شنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۸۵۷ھ (۲۳ فروری ۱۴۳۸ء) کو اچھڑی میں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

اس خاندان نے ہر دور میں صوفیہ کوام اور علماے عظام پیدا کیے ہیں۔ ان کی ایک شاخ کو قول میں ملت ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اسی کو قولی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شاہ حسین اکیسویں دہائی کے مشہور عالم و صوفی تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں کو قول میں رحلت کی اور خاندانی ہڑوار میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت شاہ عبداللطیف قادری عوف یا ہو پاؤ شاہ (مت ۱۶۷۹ء) کے مراد کے قریب دفن ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے بارہویں سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مقامی اہلِ علم میں بھیج دیے گئے، یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ اس سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلیس کو سچین کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ایک لطفہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کے والد سید شاہ حسین ان کے کو سچین کالج میں داخلے کے خلاف تھے۔ وہ بٹھڑے پرانی وضع کے ذریعے آدمی انھیں اندیشہ ہوا کہ بڑا زیادہ انگریزی پڑھ کر گمراہ اور بیدین ہو جائیگا۔ لیکن سید عبداللطیف نے یہ برجستہ جواب دے کر انھیں قائل کر دیا کہ اہلِ ایمان، میں تو انگریزوں کو سچینا چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے قرآن اور اسلام کی مقدس تعلیمات کو مغربی ممالک میں عام کر سکوں۔ انھوں نے بچپن کے اس وعدے کو آخر میں پورا

گودکھایا۔ کالج میں ان کا خاص مضمون اصول تنقید ادبیات اور تاریخ تفسیر ادبیات انگریزی تھا اور اس میں وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں سے اول آئے تھے۔

اس زمانے میں نواب بگین پتی کے بھائی میرا سید علی خان مرکزی مجلس و خراج توابعین کے رکن تھے۔ ان کی وساطت سے سید عبداللطیف صاحب، سید نواب علی چودھری سے ملے اور ان کے ذاتی سکرٹری مقرر ہو گئے۔ چونکہ سید نواب علی بھی مجلس مذکورہ کے رکن تھے، اس سے ان کا قیام اکثر دلی میں رہتا تھا اور ان کے ہاں ملک کے علماء کی آمد و رفت تھی۔ اس طرح سید عبداللطیف کا ان سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں سربراہیم رحمت اللہ (بہی) تھے۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں مہارت سے خاص طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد جب انھوں نے بہی کے مصافات میں پنج گنی کے پہاڑی مقام پر مشمول طبقے کے طلبہ کے لیے ایک پبلک اسکول قائم کیا، تو انھوں نے اس کی پرنسپل کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دی۔ وہ وہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا، تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ یونیورسٹی کے مختلف معائنہ کے جاری اسسٹنٹ پروفیسروں کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ ہر ایک کو تین سال کی تعلیمی مدت دی جائے، جس کے دوران میں انھیں نصف تنخواہ ملے، مزید براں ہر ایک کو خرچہ کے لیے تیس ہزار روپیہ قرض بھی دیا جائے جس پر ان سے سود نہیں لیا جائیگا۔ انگریزی کے شعبے سے ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا، ان کے علاوہ خلیفہ عبدالکیم اور پروفیسر وحید الرحمن کا انتخاب ہوا تھا، خیال تھا کہ یہ ٹی اے آنرز (انگریزی) میں، انٹرنیشنل یہ پیش آئی کہ ریاست کے نمایندہ مقیم انگلستان نے اطلاع دی

کہ تمام مجلسیں چرچہ مچیں ہیں، لہذا اس سال داخلہ ممکن نہیں، اگلے برس یعنی ۱۹۲۳ء میں داخلہ ہو سیکے گا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار میر شاہ حسین حسینی بہت سخت بیمار تھے اور حالت تشویشاک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ولایت کا داخلہ ایک برس کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، تو بایوسی کا اظہارِ تردد کیا، انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ جلوسہ ملے گی۔ اب میں نیکوئی سے والد کی خدمت اور نیا دوا سی کو سکون تھا۔ لیکن جب ان کے والد کو صورتِ حال کی اطلاع ملی، تو انھوں نے سخت مخالفت کی اور اصرار کیا کہ یہ موقع اچھے سے نہیں دینا چاہیے۔ تم انگلستان جاؤ اور لندن یا آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اصحابِ مجاز سے ملو، وہ لازماً تمھارے داخلے کی کوئی ذکوئی کبیل نکال دینگے، اور انھوں نے مزید یہ کہا کہ بیفکر ہو، تمھاری داپس تک مجھے موت نہیں آسکے گی اس حکم کے آگے انھیں تسلیمِ ختم کرنا پڑا، اور یہ انگلستان چلا گئے۔

انگلستان میں وہ گنگر کالج (لندن یونیورسٹی) کے صدر شعبہ انگریزی پروفیسر راندائل گولانڈ کے سامنے پیش ہوئے۔ سر راندائل اور ان کے ساتھی پروفیسر عبداللطیف صاحب کی انگریزی میں مہارت اور انگریزی ادب پر عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پوچھا، آپ آپ اسے (آئرنز) میں داخلے کی جگہ ایم اے یا پی ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟ بھلا انھیں کیا اندر ہو سکتا تھا! چنانچہ یہ براہِ راست پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر، اور اس کی تیاری اور پیش کرنے کی معادمتین برس مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شمولیت کے لیے انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے اپنا ایک ایک نمائندہ بھیجا، لیکن لندن

یونیورسٹی نے سرزاد رائیل گولانز کی سفارش پر دو نمائندے بھیجنے کی منظوری دی: ایک وہ خود اور دوسرے سید عبداللطیف، حال آنکہ وہ بنو حضرت و میریج اسکالر تھے اور پروفیسر نہیں بنے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرزاد رائیل کدو میں ان کی کتنی وقعت تھی، اور وہ ان کی قابلیت کے کس درجہ قائل تھے۔ اس سفر میں انھوں نے بارہ دورہ اور ہیل یونیورسٹیوں کا امریکائیں اور میک گل کا کینیڈا میں دورہ کیا۔

امریکا سے واپسی پر سرزاد رائیل نے ان سے کہا کہ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں ہر تین سال کی قید و عام حالات میں ہے، مقالے کے لیے آپ کا سوا معجہ ہو چکا ہو، تو آپ اسے بچھا کر کے قلمبند کر دیجیے، ہم آپ کا مقالہ دو ہی سال میں پسنے کو تیار ہیں اس پر انھوں نے وہ جینے کی نصحت لی اور شمالی سکاٹ لینڈ کے شہر سٹرن تھریو پیپر چلے گئے۔ وہاں ٹھہر کر انھوں نے ایک مختصر لوئس کی مدد سے مقالہ مکمل کیا اور لندن واپس آ کر اسے پیش کر دیا۔ لیکن سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کا نوڈیشن کا داناہ اچھا دور تھا۔ بارے سرزاد رائیل کی وساطت اور اثر در سوخ سے یہ اہم عملی سر جوئی، ایک غیر معمولی کا نوڈیشن کا انتظام کیا گیا جس میں انھیں سند عطا کی گئی (۱۹۲۴ء)۔ یوں یہ تین برس کی جگہ دو ہی برس میں اپنا کام مکمل کر کے حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔

جب یہ انگلستان گئے ہیں، تو یونیورسٹی نے ان سے بھی ایک معاہدے پر دستخط کرائے تھے کہ وہ اپنا پرہ کر ان کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازمت کرینگے، نیز ان کی خواہ کا ایک حصہ رخصت میں جبراً کونے کو کاٹا جائیگا۔ چنانچہ دابج حیدر آباد پہنچے، تو یہاں ۵۰۰۰۔۔۔۔۔ دس روپے کے گریڈ میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جو پندرہ برس پورے ہوئے، انھوں نے زہرا دی کی کچھ ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ انھوں نے بچھا کر میرا داروہ مزید ملازمت کرنے کا جنس میں کیونکی سے کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری صرف اپنی درخواست پر کرپشن کم انکم اتنی سزا ہو کہ شریفانہ سہراوقات کے لیے کفایت کو سکے، ہا کہ معاش کی تشویش

میرے علمی کام کے رستے میں مائل نہ ہو۔ ریورسٹی کے اصحاب مجاز نے یہ درخواست منظور کر لی۔ اولاً انھوں نے پوری خواہ پر ایک سال کی نصحت منظور کی؛ پھر ملازمت کے زمانے میں پانچ برس کا اضافہ کیا، تاکہ مشن کی رقم کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے بھی چشمِ دوکھا سوا لہٰذا سے تجاوز نہیں ہو سکتی تھی۔ جب یہ حالات نظامِ مروج 'میر عثمان علی خان (دکن فردی ۱۹۶۷ء) کے علم میں آئے، تو انھوں نے حکم دیا کہ چونکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ملازمت سے دست بردار ہونے سے مدعا خدستِ علم ہے، اس کی تدبیر کو ناجاہر ہے۔ پس ان کیلئے پوری پانچ سو لہٰذا کی پیشی منظور کی جاتی ہے (جو عام حالات میں پچیس سالہ ملازمت کے اختتام پر دی جاتی ہے)۔

شرکِ ملازمت کے بعد ۱۹۳۷ء میں انھوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نیوایرا (حصیر) جاری کیا۔ اور اس زمانے میں نظامِ دکن اور ان کی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ ریلوے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیں اور حیدرآباد میں اصطلاحات نافذ کریں، جس سے لوگوں کو ریاست کے نظم و نسق میں شریک کیا جاسکے۔ ۱۹۳۷ء میں نظام کو یہ مشورہ کوئی مردِ قلندر ہی دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب ان کے خلوص کے قائل تھے، اس لیے اگرچہ کسی نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا، لیکن ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی۔

ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہم نہیں تھیں، اگرچہ وہ رہی بھروسہ نہی اور نظریاتی سطح پر کیونکہ انھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ چوتھے دہے میں ہماری سیاسی فضا بڑی ہیجان خیز تھی۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ملک کی آزادی کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن جس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھا یہ مسئلہ کہ انگریزوں سے گلو خلاصی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر دو سالے (انگریزی میں) قلمبند کیے تھے: (۱) مسلم کلچر ان انڈیا ہندستان میں اسلامی کلچر اور (۲) ڈسٹنٹ کلچرل زونز ان انڈیا ہندستان میں ملتِ کلچری خطے، انھوں نے

ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا تھا، بعد کو اسے ایک باقاعدہ اسکیم کی شکل دے دی جس کی مدد سے ہندوستان کا دستور و نظام قیام پایا تھا۔ ہر ایک دفاعی خطے کے لیے پوری اندرونی آزادی کی سفارش تھی، مرکز میں صرف دفاع، امور خارجہ، تجارت و درآمد و برآمد و مواصلات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے، بغیر محبوب اختیارات بھی دفاعی خطوں کو تفویض کیے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی خاصے مزوت و مقبول ہو گئے۔ بلکہ جناح صاحب ان پر بہت اعتماد کو کرنے لگے۔ مسلم لیگ نے کس زمانے میں عبداللہ ارون کی صدارت میں ایک فائن کمیٹی بنائی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے نظریے کے مطابق پاکستان اسکیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی اس کمیٹی کے رکن تھے دوسرے اراکین غلام رسول، مرزا رضوان اللہ، ڈاکٹر انصاف حسین قادری، پیر علی محمد راشدی تھے،

اپنی دفاعی اسکیم سے متعلق ان کی فریقین کے دعوے خط و کتابت رہی۔ بالآخر گاندھی جی نے سرسرد جی نائید کی وساطت سے انھیں یہی آنے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے ملنے کی دعوت دی۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس پر یہ بھی پہنچے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے شب ۸ اگست کے جس جلسے میں ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور کی تھی (اور جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے اخبار عامر کے پہلے ہی خط میں کیا ہے) ڈاکٹر سید عبداللطیف نے صرف اس میں موجود تھے، بلکہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ شہر نشین پڑھتے تھے۔ آدمی رات کے بعد علی الصبح یہ سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ اگر مسلم لیگ چاہتی تو اب بھی گفت و شنید کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن سر جناح (۲۸ ستمبر ۱۹۴۷ء) نے جو یہ اختیار کیا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اس سے اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد نظریاتی اور ذہنی سطح پر بھی کل ہند سیاسیات سے کنارہ کش اختیار کر لی۔ اب انھوں نے اپنی تمام

توجہ حیدرآباد کے مسائل پر مرکوز کر دی، اسی مقصد سے انھوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک اور انگریزی ہفتہ وار کیلبرن (Clarion) نام کا نکالا۔ یہ پرنسپل برنس تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجلس اتحاد المسلمین اور مولوی قاسم رضوی دت جنوری ۱۹۴۰ء کی عاقبت نائندیش کے باعث حیدرآباد کی فضا بہت کدو ہو رہی تھی۔ وہی یہی کس طرح علی دت (اکتوبر ۱۹۴۱ء) کی وزارت غلطی نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح حیدرآباد کے قاعدوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ جب رستے پر جارہے ہیں، وہ تباہی کے غار کی طرف جاتا ہے جس سے ریاست حیدرآباد اور نظام و مکن دونوں لمبا سیٹ ہو جائینگے۔ لیکن رضوی نقار خانے میں لطیفی طوطی کی صدا کسی نے نہ سنی۔ نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے، اور اسی کی چنگوٹی انھوں نے کلیرن کے آخری شمارے کے ادارے میں کی تھی۔

حیدرآباد کے انضمام کے بعد وہ اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک لطیفہ خیزی کے نتیجے میں انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال کچھ دن سکون اور آرام کے لیے بیچ گئی چلے گئے۔ وہاں سے واپس حیدرآباد آئے، تو ان کے وطن کو زل سے ایک وفد پہنچا کہ وہ آئیں اور عثمانیہ کالج، کونول کی پرنسپل سمبال لیں۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں یہاں کا انتظام، ستر تھا اور مظہرین کو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ چشم بدور کالج بند ہو جائیگا۔ وفد کے اراکین ان کے ملنے والے تھے اور مقصد نیک، ان کے اصرار کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک دو برس اس کالج کے پرنسپل رہے۔ جب ایک معقول جانشین کا انتظام ہو گیا، تو مستعفی ہو کر حیدرآباد چلے آئے۔ ۱۹۵۳ء میں کونول سے واپسی کے بعد انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر

انسی ٹیوٹ آف انڈوٹری ایٹ کچلر اسٹڈینز اور اکاڈمی آف اسلامک سٹڈیز کی بنی رکھی۔ مولانا آزاد کی وساطت اور سفارش پر انھیں اس کام کے لیے مرکزی اور آئندہ پرورش حکومت نے مالی امداد بھی دی۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے تقریباً ۳۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد وہ مولانا آزاد کے بہت قریب آ گئے، اگرچہ وہ انھیں آزادی ملک سے بہت پہلے سے اچھی طرح جانتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے شاہکار ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں، اور اس کے لیے انھیں دعوت دی کہ وہ ان کے پاس آکر دلی میں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا بیشتر زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ جس دن مولانا کی رحلت ہوئی ہے، وہ یہیں کوٹھی میں موجود تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات مولانا آزاد ہی کے دہاں ہوئی۔ میں ۱۹۵۲ء میں مصر سے آیا، تو حسب معمول مولانا کی خدمت میں بھی سلام کو حاضر ہوا۔ مجھے اس بات کا فوجی حال ہے کہ وہ خود ہی سینے دوسرے یاد فرما سیتے تھے۔ ان کے سکریٹری محمد اہل خان مرحوم مجھے ٹیلیفون سے مطلع کر دیتے کہ کل صبح آجائے، وقت دہی فجر سے پہلے کا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا اور دو تین گھنٹے مختلف موضوعات پر خوب گپ دیتی۔ بالعموم ناشتے کے بعد میں اجازت لیتا کہ اب ان کی دوسری منصبی ضروریاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، ایک دن رخصت ہو رہا تھا، مولانا آزاد میرے ساتھ کمرے کے دروازے تک آئے۔ دروازہ کھولا، تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گزر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا۔ اس پر مولانا نے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ مالک دھام صاحب کو قہانے ہونگے! انھوں نے جواب نفی میں دیا۔ مولانا نے تعارف کرایا اور واپس کمرے میں چلے گئے، اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

ایک دن کہنے لگے: میں تو خود آپ کی تلاش میں تھا۔ بات یہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب 'عورت اور اسلامی تعلیم' کا انگریزی ترجمہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کروں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ میں نے ہامی بھری۔ اس پر انھوں نے جناب عبدالعلی سے اس کا ترجمہ کروایا اور 'دوسرا ان اسلام' کے عنوان سے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کروایا (حیدرآباد ۱۹۵۹ء)۔ ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۶۹ء کے ادائوں میں ان کے مکان پر حیدرآباد میں ہوئی۔ میں غالب صدی تقویمات میں شرکت کے لیے جناب عابد علی خان کا بلایا ہوا گیا تھا۔ اگرچہ قیام بھر مختصر صرف دو ہی دن کا تھا، لیکن ناممکن تھا کہ بن لے چلا آتا۔ چنانچہ ایک دست کے ہمراہ حاضر ہوا۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس موقع پر ایک لطیفہ ہو گیا۔ جلتے دیکھنے دکن کی تو سوں کا ذکر پھر گیا۔ میں نے کہا یہ لوگ تو اناڑی ہیں۔ وہ دراپن کے اور دریافت کیا کہ کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے، تو انھوں نے یہاں کی غیر آریہ اقوام کو ان - آریہ، کہنا شروع کیا جس سے رفتہ رفتہ لفظ ناپراد نیرہنے۔ اور دونوں نے ابھی کو جھاڑ کو اناڑی بنایا اور معنی اس کے ہوئے، وہ شخص جو کسی خاص فن میں طاق نہ ہو۔ منہس پڑے اور کہا آپ کی آج کی داد دیتا ہوں، لیکن خیال رکھیے، کوئی سن نہ لے۔

انسوس کہ مولانا آزاد کی زندگی میں وہ ترجمان القرآن کا ترجمہ مکمل نہ کر سکے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور البقرہ کے متن اور حواشی کا ترجمہ وہ کوچکے تھے کہ مولانا جیل بیسے۔ یہ حصہ انھوں نے دیکھ لیا تھا اور اس پر مدام کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کام اس کے بعد بھی جاری رکھا اور اسے ۱۹۶۱ء میں تین جلدوں میں مکمل کر لیا۔ ان میں سے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور تیسری زیر طبع ہے۔

ترجمان القرآن صرف پہلے دو جلدوں کے ترجمے اور تفسیری حواشی پر مشتمل ہے؛ مولانا سے

مکمل کو ہی نہیں سکے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب اسے انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، تو انھیں اپنا وہ وعدہ یاد آیا جو انھوں نے تعلیم کے آغاز میں اپنے والد سے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے عرض کر دیا کہ جس طرح بھی ہو پورے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر دینا چاہیے۔ ان کے ہندوستانی اور روپے دوستوں نے بھی ان سے اس کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر بقیہ ۱۲ بابوں کے متن کے ترجمے کا اسناد کیا اور اسے بھی شائع کر دیا۔ نتیجے میں ان کا اصول یہ تھا کہ اصلی متن کی روح نمایاں ہو، نہ کہ محض مرادفات الفاظ دکھ دیے جائیں۔ ان کا ترجمہ سب کے سامنے ہے اور صاحب نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔

ادرجن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مکمل فہرست درج ذیل ہے۔

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1934)
2. Ghalib - A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1937)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue - Plan of Federal Constitution of India. Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India - edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1937)
11. Prayers of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought - A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1955)
14. Basis of Islamic Culture (1959)

15. Madras University Lectures :
Principles of Islamic Culture (1961)
16. Was the Prophet of Islam Unlettered ? (1964)
17. The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)
18. The Call of the Quran (1966)
19. Faith and Action — The Quranic View (1967)
20. The Unity of Man — The Quranic View (1968)
21. Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad—a rendering into English in three volumes Vol. I (1962), Vol II (1967), Vol. III under print)
22. Al-Quran rendered into English (1969)
23. The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)

اردو دان مقلوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہ گیا، جو انھوں نے غالب کے عہد ان سے انگریزی میں لکھا تھا (حمید آباد ۱۹۲۸ء) بعد کو اس کا سید حسین الدین قریشی لکھیا جو اردو ترجمہ بھی شائع ہوا (حمید آباد ۱۹۳۲ء)۔ یہ صحیح معنی میں مطالعہ غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کوئی نکتہ چینی کی۔ اردو میں غیر جانبدارانہ اور عروصی تنقید کا یوں بھی فقدان تھا اور بد قسمتی سے اب تک ہے، اور غالب سے متعلق مبالغہ آمیز خیالات تو ہمارے ذہنوں پر بطور تسلط تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری دت (نومبر ۱۹۱۶ء) نے اس سلسلے میں کچھ ایسے بلند بانگ دعویٰ کیے تھے کہ جو بگھے وہ بھی اور جو نہ بگھے وہ بھی گنگ ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر بخوری کے مطالعے اور وسعت نظر اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی ذہانت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ”محاسن کلام غالب“ میں انھوں نے غالب سے زیادہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس مضمون پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے تھے کہ موت کا بناوا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے تو ان میں توازن آجاتا اور وہ غالب کی حقیقی عظمت پر بھرپور لکھتے اور اسے ہم سے قابض قبول

طریقے پر روشناس کراتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی مختصر کتاب 'غالب' میں اسکی افراط و تفریط میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دوسری اہم کوشش غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے سر اکبر حمیدی کی دستاویز سے نسخہ حمیدیہ کی اصل میں نسخہ بھوپال حاصل کیا اور پورے کلام کو مرتب کر کے چھاپنا شروع کر دیا۔ اس کے ۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس مطبع میں جہاں یہ چھپ رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطبوعہ کا غذات اور ان کا تیار کردہ اصل سودہ بھی جل کر رہا کھ ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس انوسانک حادثے کے بعد دوبارہ اسے مرتب کرنے کی بھروسہ سمیت نہیں تھی؛ یوں یہ سفید کام ادھورہ رہ گیا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ تھتے کے فرے کئی طرح حکیمین کاظمی مرحوم (د ف ۱۹۶۱ء) کے ہاتھ لگ گئے تھے جو انھوں نے مولانا تھتہ علی خان عری کی بھیج دیے اور انھوں نے دیا ان کا نسخہ عری مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہر حال الفضل للستقدم کے اصول کے مطابق ڈاکٹر لطیف ہمارے شکریتے کے مستحق ہیں کہ وہ ان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول مرتب کر دیے جس سے ان کے پسروں کو روشنی ملی اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی ان ہی علمی خدمات کے اعتراف میں ابھی پارسال یوم جمہوریہ (۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء) کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔

پانچ چار سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ پہلے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ باتیں آنکھ پر مل جراحی کوایا جو بد قسمتی سے ناکام رہا اور آنکھ بالکل بیکار ہو کدہ گئی۔ دوسری کی بینائی بھی بہت کم تھی اور وہ مدد کے بغیر چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔ قرآن کا ترجمہ انھوں نے اسی زمانے میں

کمل کیا۔ پہلے افتخارہ پاروں کے متن کا ترجمہ تو ترجمان القرآن کے ساتھ پورا ہو چکا تھا، اب تکمیل کے لیے باقی بارہ پاروں کا ترجمہ درکار تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے اگرچہ اس کے حوت خناس مزدور تھے۔ انھوں نے طریقہ کاریہ اختیار کیا کہ تین چار معادین ساتھ لیے۔ ایک قرآن کی آیت پڑھتا، دوسرا اس کے مختلف ترجمے (اردو۔ فارسی۔ انگریزی) پڑھتا، کبھی کبھی وضاحت کے لیے بعض اہم تفسیروں کا متعلقہ حصہ بھی پڑھا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا ترجمہ نکھوادیے، جو ان کے نزدیک اصل کی روح کے قریب ترین تھا۔ وہ ترجمے سے زیادہ ترجمانی کے قائل تھے۔ ان کو کوئی موجودہ ترجمہ یا ترکیب ان کے معیار پر پوری اترتی تو انھیں ان معنوں کو لفظ بلفظ اپنے ہاں لے لینے میں بھی عار نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اصل مقصود یہ تھا کہ ایک اوسط درجے کے قاری کی سمجھ میں آجائے کہ قرآن کیا کہتا چاہتا ہے۔

پچھلے سال ڈیڑھ سالہ انھیں حلق کے کینسر کی شکایت تھی۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن بیہودہ؛ اب غوراک تک گلے سے تھیں اترتی تھیں۔ سیال چیزوں پر کوئی کہاں تک جی سکتا ہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب آخری مرحلہ بہت دور نہیں ہے، تو پھر راہ قبل انھوں نے گزول میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت سید عبداللطیف یا ہو پادشاہ کے مزار کے جوار میں اپنی قبر کھدوائی۔ گس نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی ساری عمر حیدرآباد میں بسر ہوئی، یہاں کے سب آپ پر حقوق ہیں، آپ نے گزول کو حیدرآباد پر ترجیح کیوں دی، تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

ایٹک مانند ایم، یار ملک بودہ ایم
باد آبخا میردیم خواجہ کو آں شہر است

اپنی بیماری کے آخری ایام میں وفات سے کوئی ایک مہینہ پہلے انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللطیف قرآنک اینڈ آؤڈ کلچرل اسٹڈیز ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم

کیا، جس میں صرف یہ تین چار سطریں ہیں،

ملکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف ولد حضرت سید شاہ حسین صاحب مرحوم، عمر ۷۰ سال، پیشہ وظیفہ یاب پر و قہیر چاند عثمانیہ ساکن ۷۴ آغا پورہ، سعید آباد بہ نسبت ہوش دہواس، اُس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر مجھے قرآنی اوروں پر مگر مذہبی اصد سے ہے، ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کوتاہوں اور اپنی تمام کتابوں کے حق تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالہ کیا ہوں۔

اس کے اخراجات کے لیے ہمیں ہزاروں روپیہ کا عطیہ بھی اپنی جیب سے دیا اور اپنی جملہ تصنیفات کا حق اشاعت بھی ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کس زمانے میں ایک ادارہ اسلامیات کے لیے قائم کرنا چاہتے تھے، اور جیسا کہ چودھری محمد شفیع (دم ش) نے ڈاکٹر سید عبداللطیف کو ایک خط میں لکھا تھا، اقبال مرحوم اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دینے والے تھے۔ ادارے کی تاسیس سے قبل اقبال دہلی فرما گئے۔ بہر حال ان کے کام کی تکمیل ڈاکٹر عبداللطیف نے کر دی، اپنی زندگی میں بھی ادارہ کے ذریعے سے اور مرنے کے بعد کے لیے یہ 'قرآنی ٹرسٹ' قائم کر کے، خدا کو سہ، اس کے کارکنوں کو اسی خلوص اور تندہی سے کام کی توفیق ملے، جو ان دونوں مرحوموں کی خواہش تھی۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ۳ نومبر ۱۹۶۹ء ۱۳۲۸ھ ساڑھے پانچ بجے صبح (جنی قیام گاہ پر جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخری لمحے تک بجا رہے، بلکہ ان کے ارادہ گرد لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے؛ انہوں نے خود کہا کہ اب کوئی سورۃ یٰسین کی تلاوت کرے؛ اور اس کے بعد پورے سکون سے اپنے مولا حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

لادلفوت ہے۔ لیکن ان کی اولاد معنوی اتنی ہے، بالخصوص ان کا انگریزی ترجمہ قرآن

- مذکورہ مولوی

کہ اس سے مستفیض ہونے والے ہمیشہ انہیں دعا سے خیر سے یاد رکھیں گے۔ اسی دن یحییٰ مومنین
سے پہرہ کو سب سے بڑا مقرر کیا گیا، اگر کیٹ کی مسجد الاکنٹہ میں نماز جنازہ ہوئی، جس کی امامت
مولانا ابوالوفاء کی۔ اس کے بعد میت کو نوں گئی، جہاں ان کی وصیت کے مطابق اگلے
دن ۱۷ نومبر بعد نماز جمعہ تدفین حل میں آئی۔ یہ محمد امجد علی

مہر، مولانا غلام رسول

۱۹ نومبر، ۱۹۰۷ء کو مولانا غلام رسول ہر کا حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

نئی نسل کے، خصوصاً وہ لوگ جو آج بچپن کے پٹے میں ہیں، انھوں نے یہ ایک سطری جبرِ برہمنی یا سن ہوگی۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول ہر کون تھے اور انھوں نے اردو صحافت کی خصوصاً اور علم و ادب کی عوامی خدمت کی!

مولانا غلام رسول ہر ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء کو جالندھر سے کوئی چارہ سال دور، ایک چھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک اور گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلے کیا یہاں انھوں نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اب وہ لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کیا۔ وہ اسی انٹر کے درجے میں تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۳ء میں اپنا شہرہ آفاق ہفتہ وار اہلالِ کلکتہ سے جاری کیا۔ ہر صاحب اس سے پہلے شعر کہنے لگے تھے اور مذہبی اور سیاسی مطالبے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اہلال کے خریدار

بن گئے اندر پرچہ مسلسل ان کے مطالعے میں رہنے لگا۔

مولانا آزاد نے اہلال کے ذریعے سے ملک کی عام سیاسی بیداری میں عموماً اور مسلمانان ہند کی تاریخ میں خصوصاً جو اہم رد و اد کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختراً اتنا کہنا کافی ہو گا کہ مرید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی کا جو سہ دیا تھا، وہ اس وقت تک اس ملک میں اسلامی سیاست کا اصل اصول بنا ہوا تھا۔

کے خلاف پہلی آواز مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند کی۔ ان کا اسلوب تحریر اور اپنے نظریات کی تائید میں قدم قدم پر نصیحت و نصیحت سے استدلال ایسا برجستہ اور بدیع تھا کہ اس نے گویا ایک لگاؤ سی۔ نوجوان طبقہ اہلال پر دیوانہ وار فریفتہ ہو گیا۔ غلام رسول بھی اہلال اور صاحب اہلال کے والد و شہید بن گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی تنظیم کے لیے ایک جماعت 'حزب اشتر بنائی تھی اور اس کے اراکین کی تربیت کے لیے 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ غلام رسول بھی 'حزب' اور 'دارالارشاد' کے رکن بن گئے۔ ان تمام اراکین کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ ہر صاحب نے مولانا آزاد سے جو تعلق اپنی نوجوانی میں قائم کیا تھا، اسے اپنے آخری دم تک نباہا۔ اس دوران میں کیسے کیسے سیاسی زلزلے اور انقلابات ہنگامے نہیں ہوئے لیکن ان کے پاسے اراکت کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ مولانا کے عاشق تھے اور کبھی ان کا نام حضرت اور دمتہ اشتر علیہ کے اضافے کے بغیر نہیں لیتے تھے۔

ہر صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کر لیا، تو انھیں حیدرآباد (دکن) میں ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں پایگاہ وقار الامر میں انسپکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اتحادی قوتوں کا ترکی کے خلاف رویہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت تشویش کا باعث رہا تھا۔ ہر صاحب نے حیدرآباد کے بعض دوستوں کے مشورے سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، یہ 'سلطنت' اس کا نام تجویز ہوا اور انھوں

نے اجراء کے لیے درخواست دے دی۔

اوپر مارچ ۱۹۱۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ چنانچہ بہار کے علاوہ بیشتر دوسری صوبائی حکومتیں پہلے سے ان کے اپنے ہاں داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں۔ اور سب راستے مسدود یا گھروہ راہی چلے گئے اور تین چار جیسے عہدید ہیں ان کی نظر بندی کا حکم صادر ہو گیا۔ ان کے کلکتے سے نکلنے پر حکومت نے ان کے گھر اور دفتر کی کاشی ملی، بالہ ان کے تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ انھیں میں صاحب اشرف کے اراکین کا رجسٹر بھی تھا، جس میں سن جملہ اور اصحاب کے ہر صاحب کا نام بھی درج تھا۔ یہ سب لوگ حکومت کی نظر میں مشتبہ اور خطرناک قرار پائے اور ان سے متعلق پوچھ گچھ ہونے لگی۔ خدو خدو ہر صاحب کا کھوج بھی نکلا، اور رپوٹ ملی کہ ان دونوں یہ حیدر آباد میں ہیں اور ایک اخبار سلطنت نکالنے کے لیے ان کی دہلی رہن کی درخواست زیر غور ہے۔ حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار الملل ہی کے اخراجات سے جز بہرہ ور ہی تھی، بھلا ان کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی چنانچہ ان کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس سے تھوڑے دن بعد ہی ۱۹۲۰ء میں ہر صاحب حیدر آباد سے وطن واپس آئے۔

مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کو اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار سے روزانہ بنایا تھا۔ ظفر علی خان اردو صحافت کا ایک اور دہخشاہ نام ہے۔ ان کا اخبار زمیندار گویا اردو صحافت کی درگاہ تھا۔ بھلا جس اخبار میں مختلف اوقات میں عبدالرشید العادوی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول، ہر، عبد الحمید مالک، جواغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکش، نصر اللہ خان عزیز نے کام کیا، ہوا وہاں سے الگ ہونے کے بعد زندگی بھر کامیاب صحافتی تحریکی ہو، اس اخبار کو صحافت کی درگاہ کے سواے اور کس نام سے یاد کیا جائیگا؟ اور ان اصحاب میں سے کس کا نام اردو صحافت میں فراموش کیا جاسکتا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ غلام علی خاں بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ وہ انگریز سیاست کے خاڑا
میں نہیں بچس گئے ہوتے، اور کجیوی سے علم و ادب اور مصافحت ہی کو اپنا اڈھنا بھونا
بنائے رہتے، تو آج اردو کا دامن کیسے کیسے گلہاے رنگ رنگ سے منظر اور مشکبو
ہوتا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حسرت موہانی اور مولانا محمد
علی پڑ اور شاہد کھی حد تک مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہو کہ
ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر!
۱۹۲۰ء میں مولانا ظفر علی خان نے اہرار کو کے عبدالغیر سالک کو زمیندار میں آنے کی
دعوت دی۔ سالک صاحب اس وقت مولوی سید محمد اعلیٰ (مقتیا علی تاج کے والد)
کے رسالوں تہذیبِ فہوان اور پھول کے ایڈیٹر تھے۔ سالک کو انکار کرتے دینی؟
اور وہ زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد ان کا نام سر روق پر ایڈیٹر کی
بیٹیت سے پھینک دیا اور وہ اس کے ادارے لکھنے لگے۔ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کا زمانہ ہماری
تحریک آزادی کے آغاز کا زمانہ تھا اور شباب کا بھی۔ عدم تعاون کی تحریک پورے
نور خور سے چل رہی تھی۔ حکومت بھی اپنے پورے لاد فکرو سے اس کے مقابلے پر کھڑی
ہو گئی تھی۔ اور کسی نے حکومت کے خلاف کوئی بات کہی یا لکھی، اور وہ گرفتار کر دیا گیا۔
پنجاب میں روزنامہ زمیندار خواہر طور پر حکومت کی نظروں میں کٹ گیا تھا۔ غلام علی خان
گرفتار ہوئے، ان کے بیٹے اختر علی خان گرفتار ہوئے، یہی اب سالک صاحب کے
ساتھ جیل میں آئے۔ انھوں نے ایک ادارہ کھلا، جو حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔
چنانچہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے جیل خانے بھیج دیے گئے۔

جہر صاحب حیدر آباد سے واپس آکر خلافت تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ تھے
اور اس کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نکالنے کی بھی فکر میں تھے۔ سالک کے جیل چلے جانے کے
بعد زمیندار کے منبر جو جہر صاحب کے دست تھے، ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آئیے اور

زمیندار کی باگ ڈور منجھالیے۔ انہوں نے بھی خیال کیا کہ اگر ذاتی اخبار نکالنے سے پہلے
 مگس ”دوسرے پرچے میں کچھ حجرہ حاصل ہو جائے“ تو یہ مفید رہیگا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء
 میں ہر صاحب زمیندار کے ایڈیٹر بن گئے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے۔
 پکڑ چکے تھے، کا زلزلہ تھا، اور زمیندار تو خاص طور پر محتوب سرکار تھا۔ ممکن ہے حکومت
 نے اپنے کل پرزوں کے ذریعے سے بھی دباؤ ڈالا ہو۔ بہر حال ہر صاحب کے خاندان
 کے بزرگ لاہور آئے اور انہوں نے امرار کیا کہ وہ زمیندار کی ملازمت سے استعفیائے
 دیں اور واپس اپنے وطن چلیں۔ ہر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد ہی حکومت نے زمیندار کی مالی ضمانت منسوخ کر لی، جس پر دعاوی
 طور پر، اس کی اشاعت بالکل بند ہو گئی۔

تین چار مہینے بعد زمیندار پھر جاری ہو گیا۔ اب کے اخبار کے کو تادمہ صاحب کے
 گاؤں پہنچے اور ان کے خاندان والوں کو قائل معقول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس
 پر ہر صاحب دوبارہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سالک صاحب
 بھی ٹیڈ کاٹ کور ہا ہوئے اور آکوان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ
 ہر سالک کا یہ قرآن العبدین روزنامہ زمیندار کا آخری ہے ہی، اور مصافحت کا
 بھی لزب دوز ثابت ہوا۔ ہر کے بخیہ، تین، مدلل، اداریوں کی اور سالک کے
 افکار و حوادث میں ہمارے تمام قومی مسائل پر طنز و مزاح کے انداز میں متحرک کی
 دھوم مچ گئی۔ بہت لوگوں نے ان کی نقل کی۔ مگر وہ بات کہاں پر لوی مدن کی سی!

مارچ ۱۹۲۳ء کے آخر میں ہر سالک نے بوجہ زمیندار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔
 اخبار کے بیشتر حصے نے بھی ان کا ساتھ دیا؛ ان میں ادارتی شعبے اور کاتب تک سب
 شامل تھے۔ شروع میں ان کا اپنا نیا اخبار جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن
 علے کے آجانے سے وہ مجبور ہو گئے کہ ان کے روزنامہ کا مسئلہ تھا۔ اب ان کے لیے اخبار

نکلانے کے سوائے کوئی چارہ کار درہم چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو روزنامہ انقلاب جاری ہوا۔ جن صاحب کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اعتراف کر چکے کہ انقلابی صوفستی معیار سے کمتر کبھی کوئی ثابت نہیں کی۔

تہرے یورپ اور مغربی ایشیا کے مشترک ممالک کے سفر کیے تھے۔ اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی جو ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں آداوی آئی۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ ایک کی جگہ دودھ ملک وجود میں آئے۔ ہر دو ممالک نے دیکھا کہ تبدیل شدہ حالات آزاد صحافت کے لیے سازگار نہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اپنی آزادی برائے بھی قائم رکھیں اور حکومت بھی ہم سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔ چونکہ آزادی ضمیر ان کے نزدیک خوشنودی حکومت سے عزیز تر تھی، انھوں نے انقلاب کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے منجمد ہو گیا۔ ایک کامیاب، باخبر و دسوخ، نفع مند اخبار کو اصول کی خاطر منجمد کر دینے کی ایسی اور مثال شاید ہی کہیں مل سکے!

اس کے بعد ہر صاحب نے براہ راست سیاست سے ہٹ کم تعلق رکھا۔ ان کی کتاب غالب پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کے اقتباسات کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ اس سے کم بیش غالب کی پوری سوانحی سامنے آگئی ہے۔ یہ کتاب ان کے غالب سے متعلق ایک بڑے پروگرام کا حصہ تھی، جو ان کی اور اور سرگزیموں کے باعث ادھورا رہ گیا۔ لیکن اہل نظر مجھ سے اتفاق کر چکے کہ جو کچھ ہو گیا وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ پچھلے ۲۵ برس میں غالب پر بہت کام ہوا ہے اور اس کی بعض اچھی سوانحیاں وجود میں آئی ہیں۔ اس کے باوجود دھر کی 'غالب' کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی اور غالب کا

کوئی سنجیدہ طالب علم اس کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔
اس سلسلے میں بہت بعد کو انھوں نے اردو خطوط غالب بھی دو جلدوں میں مرتب کیے تھے
ان کے ساتھ مکتوب الہیہم کے حالات اور مفید حواشی کا اضافہ کیا جس سے ان کا افادہ
دسجہ تر ہو گیا۔

صحافت سے دستکش ہو کر انھوں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر لیا تھا۔
انھوں نے ۱۹۳۶ء میں حضرت سید احمد شہید راسے بریلوی کے حالات جمع کرنا شروع کیے
تھے۔ اب فرصت ہوتا ہوئی، تو انھوں نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی۔ ۱۸ سال کی محنت
شاقہ اور تلاش و تحقیق کے بعد اسے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے انھوں
نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کون کون سے کنوئیں نہیں جھانکی۔ حضرت
شہید احمد شہید کی تحریک کے بقیۃ السیف افراد کو ریاست ٹونک میں پناہ ملی تھی۔ ان
صحاب کے باعث تحریک سے متعلق بہت قلمی لٹریچر ٹونک کے سرکاری کتب خانے میں جمع
ہو گیا تھا۔ ہر صاحب اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے مولانا آزاد نے دہلی سے منگووا کر
اٹھیں دیا تھا۔

بعد کو انھوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی جمع کر کے 'سرگزشت مجاہدین'
کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ۱۸۵۴ء کے مشہور ہنگامے کے کوائف، انقلاب، ۱۹۵۵ء
کے نام سے شائع کیے۔

غالب کے بعد ان کا دوسرا پسند موضوع اقبال تھا۔ ان کے اقبال کے ساتھ بہت زمانہ
کے تعلقات تھے، بلکہ ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع بھی ملے تھے جب ۱۹۳۱ء میں اقبال
دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے ہیں، تو ہر بھی ان کے ساتھ
تھے۔ اسی پر بھی دونوں یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ایک ساتھ مؤثر
اسلامی، یروشلم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہر صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال کا ہر

نصف یا ایک تہائی کلام شائع ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی تخلیق یا شعروں پر شائع نہیں کیے یا بھی مجموعے میں شامل نہیں کیے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے معیار سے فروتر تھے یا ان کے عام طرز فکر سے میل نہیں کھاتے تھے چونکہ مہر تو ان کے ساتھ رہے تھے، اس لیے اس طرح کا دافرا کلام ان کے پاس جمع تھا۔ وہ اسے توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم اب اس ذخیرے کا کیا حشر ہوتا ہے! انھوں نے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم مجموعوں کے مطابق د معانی سے متعلق مستقل مصنفات چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کی سوانح سے متعلق بھی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے تجویز کے ادب پر خاصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا جھوٹا دبلوئے، کوئٹہ پاس کتابیں ہونگی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخ اسلام پر دی۔ عجیب بہرہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کر تالیف، سوانح ہو کر تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر۔ غرض کوئی میدان ہو، وہ کسی قسم کی گھیبابت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو کچھ کہیں اور جب بھی نہی، ایسی کوسنے والے کو اس سے شرم محسوس ہوتی، نہ خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث ندامت۔

صحت کی طرف سے کبھی شکایت نہیں کی۔ سرخ و سفید رنگ، بلند بالا اور زشی و نساب جسم۔ وہ اپنی عادات میں بہت باقاعدہ تھے۔ مسلم ناؤی میں ان کا اپنا مکان تھا۔ ہنر یہاں سے بہت قریب ہی۔ گری سردی ہر موسم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد نکل پڑتے۔ نہر کے کنارے کنارے کوئی دو میل چلے جاتے۔ اس طرح روزانہ کم از کم چار میل کا اوسط تھا۔ واپس آکر ناشتہ کرتے اور اس کے بعد کام کی میز پر بیٹھ جاتے۔ بارہ بجے تک ناشتہ دھواں کا شعلہ رہتا۔ یہاں سے اٹھتے تو وہ پہر کا کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر

قبیلہ کرتے۔ تین بیچے دوبارہ مطالعے کی میز پر پہنچ جاتے اور چھریچے تک مشغول رہتے۔ پھر شام کی سیر اور اس سے واپس کے بعد کا وقت احباب کے لیے وقف تھا۔ یادہ ان کے وہاں آجاتے یا یہ کسی کے وہاں چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کر جلد سو جاتے کے عادی تھے۔

ایسی منظم زندگی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ موت اچانک ہوئی۔ منگل کے دن ۱۷ نومبر ۱۹۶۹ء (۲۶ رمضان ۱۳۹۱ھ) کو علی الصبح حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن سپر کومسلم ٹاؤن ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ راجب مراد آباد کے قطبہ تاریخ کے آخری مصرعے سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ہے:

نثر اود قدس و وقار و وطن غلام رسول

وہ ہنوز کالج کے طالب علم تھے کہ ۱۹۱۴ء میں ان کی شادی ہوئی۔ لیکن چار پانچ سال بعد یہ بیگم دوسرے سال بچے اپنی یادگار چھوڑ کر انھیں راجہ غارت لے گئیں۔ دوسرے کالج انھوں نے نہایت دن بعد ۱۹۲۹ء میں کیا۔ اس خاتون سے ان کے دس بچے پیدا ہوئے۔ دنا سچے وقت ان کے گیارہ بچے

موجود تھے۔ پھر بیٹے عبدالسلام اسلم نادر قی شاہین، اکرم، جاوید سلطان، طاہق، امجد سلیم) اور پانچ بیٹیاں۔ پانچ بڑے بیٹے برسرِ پردہ گذارہیں؛ سب سے چھوٹے امجد سلیم بی اے کے طالب علم ہیں تین بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر بلا کی ہیں؛ دوسرے دو ناگتھد ہیں۔

میرے ان کے ۱۹۳۶ء سے دو تاد تعلقات تھے۔ ۴۵ برس تھوڑی مدت جنہیں ہوتی غائب نے بوس کے انتقال پر کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ۴۰ برس سے جانتے تھے، حضرت ۴۰ برس کا تو دشمن بھی نہیں ملتا، دوست کا کیا ذکر! میں ہر کے لیے کیا کہوں۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا۔ نیکی اور شرافت کا نمونہ، دوست پروری اور وضع داری کی مثال:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

سیدین، خواجہ غلام السیدین

ان کا سلسلہ نسب حضرت رسول کریم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابوالقاسم انصاری تک پہنچتا ہے۔ یہ اور اردو شاعری کے مجدد و خواجہ الطاف حسین حالی (دسمبر ۱۸۹۱ء) کے بھائی تھے۔ مولانا حالی نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی ہروی مجدد فحیات الدین طبعی (۱۲۶۶-۱۲۸۷ء) ہیں ہندوستان آئے۔ حکومتِ وقت نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ جاگیر اور پانی پت کی قضاۃ کے علاوہ انھیں منڈی میں مختلف اجناس کی قیمت متقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ سارا جاہ و مال بہت مدت سے ختم ہو چکا تھا اور سیدین کے باپ دلاو ایک خاندانی نیکنامی اور عزت و شرف کے سوا اس میں سے کچھ نہ پہنچا۔

سیدین کے دادا خواجہ غلام عباس کا نکاح مولانا حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے غلام محسن، غلام انجلیس، غلام استبطن؛ سب سے بڑے غلام محسن قابل گو عالم دین اور مصنف تھے۔ انھوں نے ہر برہنہ اسپنسر کی مشہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ "فلسفہ تعلیم" کے عنوان سے اردو میں کیا تھا۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کے

بعض مذہبی رسالے اور ایک آدھ منظرے کی کتاب دیکھی تھی۔ ان کا ۱۹۳۸ء میں لاہور انتقال ہوا۔

مجھے چھوٹے خواجہ غلام البطین تجارت اور ملازمت کرتے رہے۔ سہادی زبان کے نامور افسانہ نگار اور ناول نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انھیں کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں رملت کی۔

خواجہ غلام اقسطین صحیح معنوں میں فخر خاندان تھے۔ ۱۸۷۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم سہی وہیں ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں وہ حالی کے ساتھ دلی آئے۔ پانچ برس بعد یہاں گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ یہی زیاد تھا جب انھوں نے انظر فی الآثار کے عنوان سے کوئی ۲۰ صفحات کا مضمون حیدرآباد کے مشہور دانش کے حسن میں چھپنے کو بھیجا۔ یہ مضمون حسن کے میاں کے مطابق قابل انعام ٹھہرا اور انھیں ایک شرفی انعام میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۹۶ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا، اور چار سال بعد ۱۸۹۳ء میں (بعض ۲ برس) بی اے اور پھر ۱۸۹۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۸۹۶ء کے شروع میں وہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ وہاں وہ پانچ برس سے کچھ زیادہ رہے۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے اور میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ شاہ ایڈورڈ مہتمم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر دہلی ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہنرانی مس سرگندھ کی زیر صدارت دلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ غلام اقسطین نے "اصلاح تمدن" (سوشل ریفارم) سے تعلق ایک تقریر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے اپنی سرگرمیوں میں اس موضوع کا اضافہ کر دیا، اور اس کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے خواجہ غلام اقسطین ہی کو اس کا سکریٹری بنا دیا۔ انھوں نے پورے غلوں سے اس شعبے کا پیغام گھر گھر پہنچا

کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنا مشہور رسالہ عصر جدید جاری کیا جو پہلے ماہنامہ اور بعد کو ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مشنوں کے دورے کیے، تقریریں کیں؛ نیز اس تحریر کے مقاصد کی تشریح کے لیے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام "مضامین اصلاح و ترقی" تھا۔ یہ مشنیز مفت تقسیم کی گئی تھیں۔

وہ اعتقادِ شیعہ تھے اور شیعہ کافر نس کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں سنی شیعہ فرقوں کے اختلاف اور کشمکش سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے بساطِ بھیر دو نوں گردموں میں صلح صفائی اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ علمائے کرام نے انھیں اپنے تعاون سے محروم رکھا!

۱۹۰۹ء کے انتخاب میں وہ صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے امید دار کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان تھے، جو ان سے کہیں زیادہ با اثر و رسوخ تھے؛ لہذا وہ ہار گئے۔ لیکن وہ اس سے حوصلہ نہیں ہارے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور اب کے اپنے مقابل خان بہادر سید آل نبی دیکل و ڈیس اگڑہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔ اکثر ان کے نام کے ساتھ "آزہیل" لکھا جاتا ہے؛ یہ اس انتخابی کامیابی کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن افسوس! ان کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اگر وہ احتیاط کرتے اور مناسب طریقے پر علاج ہوتا، تو شاید تندرستی بحال ہو جاتی۔ لیکن ایمان کی حرارت اور قوم کی ذہول حالی کی اصلاح کا جذبہ انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کثرتِ کار لیے لیے اندرونِ دیہیوں ملکِ سفروں کی کوفت اور ذہنی تشویش نے انھیں قبل از وقت موت کے منہ میں ڈھکیں دیا۔ جسم ان کی روح کا ساتھ نہ دے سکا اور تندی صہبائے یاکینہ نگل گیا۔ بروز جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء رات کے دس بجے اس مجاہدِ قوم کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اٹھا، اور عید گاہ کے متصل درگاہِ میر تقی میں سپرد خاک ہوئے۔ صرف ۴۳ برس کی عمر پائی۔

بجلا یہ کوئی مرنے کی عمر تھی !

ان کا کاح مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین (ف ۱۹۲۲ء) کی صاحبزادی مشتاق خاٹم سے ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے، مختار خاٹم، غلام السیدین، سیدہ خاتون، انظر عباس، مصداق خاٹم۔ مختار خاٹم کا کاح سید حسن ریدی سے ہوا تھا۔ سیدہ خاتون کا عین عتزال شباب میں ۱۹۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ حالی کے مختصر مجموعہ سخن جو اس ہراتِ حالی میں ایک چھوٹی سی مثنوی ان سے متعلق ملتی ہے۔ سیدین کی کتاب اُردو میں چراغ میں بھی ایک مضمون ان سے متعلق موجود ہے۔ خواجہ انظر عباس ابھی چار برس ہوئے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ مصداق خاٹم ہمیشہ ادیب و مصنف صاحبِ عابد حسین کے نام سے مشہور و معروف ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

خواجہ غلام السیدین جنھیں ان کے سب احباب سیدین کے نام سے جانتے ہیں، مرحوم خواجہ غلام السیدین کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے دن پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تربیت اپنے والد اور نانائو اور حالی کی نگرانی میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید ختم کیا، اس کے ساتھ علمِ تجوید و قرأت کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ اس سال اپنی یونیورسٹی سے بی اے کے داخلا لیا۔ علم تھے، اس امتحان میں وہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر مسٹر میکسزلی تھے، وہ ان کے شیخے اور خاص طور پر انگریزی میں غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سفارش پر حکومت نے انھیں وظیفہ عطا کیا اور یہ ولایت چلے گئے۔ وہاں لیٹریٹری بورڈ سے پہلے تعلیم و تدریس کی سند (ڈپلوما) اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ ان

سال کے آخر میں وہ ہندوستان واپس آئے۔

والہی پراول علی گڑھ ٹریننگ کالج میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تھوڈے دن بعد حبیب الرحمن صاحب صدر شعبہ کہیں باہر گئے اور یہاں کی جگہ پر لگ گئے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں انھیں کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ترقی کر کے پرنسپل ہو گئے۔ اتنی کم عمر میں شاید ہی کوئی اور پرنسپل بنا ہو۔ وہ اس کالج میں ۱۹۳۸ء تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست کشمیر کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ مدیر محکمہ تعلیم کے عہدے پر دہاں چلے گئے۔ کشمیر میں وہ ۱۹۴۵ء تک رہے۔ اب ان کی ماہر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں شہرت ہو چلی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست راجپور نے انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ وہ دو برس تک راجپور میں میٹر تعلیم رہے۔ آزادی ملک پر جب ریاست جمہوریہ ہند میں شامل ہونے والے تھے، تو ان کا عہدہ بھی تحقیق میں آ گیا۔ جب مئی ۱۹۴۷ء میں وہ یہاں سے سبکدوش ہوئے، تو حکومت کشمیر نے اسی عہدے پر انھیں اپنے ہاں مقرر کر دیا۔ انھوں نے صوبہ کشمیر کے تعلیمی نظم و نسق میں ایسی خوشگوار اصلاحات کیں کہ شدہ شدہ حکومت ہند تک ان کی خبر نہ پہنچی۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں بلاکر مرکزی وزارت تعلیم میں میٹر اور جوائنٹ سکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس زمانے میں سکٹر ڈاکٹر نارائن چند تھے ۱۹۵۴ء میں ان کے بعد پرنسپل ہائیو کبیر راف ۸ اگست ۱۹۶۶ء سکٹر چوگر آئے، تو سیدین ایدیشنل سکٹر مقرر ہوئے اور تین سال بعد ان کے استعفیٰ ہونے پر ۱۹۵۷ء میں سکٹر بن گئے۔ یہیں سے ۱۹۶۱ء میں نیشنل پرنسپل ہائیو کبیر راف سے سبکدوش ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی، تو حکومت کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے ہاں دوبارہ بلا لیا۔ لیکن اب ماحول دوسرا تھا۔ حکومت کے کل پرزے انھیں اپنے مصالحت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جمیدین کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ سال بھر سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۳ء کے شروع میں استعفیٰ ہو گئے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں (۱۹۵۶ء) وہ دعوتی پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک گئے تھے۔ اب جولا دمت کا جو اگلے سے اترا تو بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ دسکالمن یونیورسٹی (امریکا) گئے (۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء)۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء کا ایک سال ہوائی یونیورسٹی میں گزرا۔ یہاں وہ مرکز برائے شرق و غرب میں سینئر اسکالرس کر گئے تھے۔ ہوائی ہی سے ۱۹۶۴ء میں وہ شان فورڈ یونیورسٹی گئے اور اسی سال کے آخر میں وہاں سے واپس آئے، تو یہاں حکومت ہند ایک تعلیمی کمیشن کی تشکیل کا منصوبہ مکمل کر چکی تھی؛ انھیں بھی اس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ وہ اس عہدے پر دو برس (۱۹۶۶ء تک) رہے۔ کمیشن کا کام ختم ہوا، تو یہاں دہلی میں ایک سرکاری تعلیمی اور انتظامی معاملات کے ادارے کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۶۹ء میں الگ ہو گئے۔

۱۹۵۰ء میں شکاگو یونیورسٹی نے دنیا بھر سے آٹھ ماہرین تعلیم کا انتخاب کر کے انھیں (مقامی خدمات کا نمونہ یا تھاہر ہندستان کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ان آٹھ میں سے ایک ذات سیدین صاحب کی تھی۔ وہ شکاگو سے جون ۱۹۷۰ء میں وطن لوٹے تھے۔ اگر ہم گنوائیں کہ وہ جہاں ہندستان میں اور بیرونی ممالک میں کون کونسی یونیورسٹیوں اور اداروں کی منتظر یا عاملہ کے رکن رہے، تو یہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں سیدین صاحب کا ہاتھ رہا ہو۔ انھوں نے پس پردہ مگر خاموشی سے اس میدان میں جو خدمات سر انجام دی ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ملک سے باہر جب ادارے سے وہ بہت دن تک وابستہ رہے، وہ یونسکو ہے۔ وہ اس کی مرکزی سرگرمیوں کے مختلف سطح پر منسلک رہے اور اس کی طرف سے انھوں نے بعض ممالک کا دورہ بھی کیا۔

شیدین صاحب کو اردو ادب انگریزی - دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔
 (لوں وہ فارسی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے تھے) ان کی اردو میں بڑی جادہ
 اور شگفتہ ہر بظاہر ایسی ہل متغ کفار خیال کرے کہ رسی شکر لکھ لکھا کیا مشکل
 ہے؛ لیکن کھنے بیٹے، نو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام۔
 سحر کے علاوہ وہ تقریر کے بھی مرد میدان تھے، اور ان کی یہ صلاحیت کا ملا خدا داد
 تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ ان کی ۱۹۱۶ء کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جو
 انھوں نے آل انڈیا انجینئرنگ کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ کے موقع پر اسٹریٹس ہال
 میں کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی اور اس کمسنی کے زمانے میں یہ تقریر انھوں
 نے اس اطمینان اور وقار سے کی تھی کہ سننے والے بہت دن تک اس کا جرجر کرتے
 رہے خوش قسمتی سے مجھے اپنی زندگی میں بعض بڑے بلند پایہ اور طلیق اللسان مقبول
 کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں بلا خوف تردید، پورے وقار سے کہہ سکتا ہوں کہ ذرا
 زبان، لہجے کی صافست۔ انداز و اسلوب خطاب اور صغیر کے مال اور اعلیٰ سے پوری
 واقفیت، دلائل کی قوت، اپنے نقطہ نظر کی وضاحت، سامع کی تشریف اور اطمینان۔
 غرض ان تمام باتوں میں جو کسی اچھی اور کامیاب تقریر کا مابہ الامتیا ہیں، شیدین
 کسی سے کم نہیں تھے۔ گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا جگہ جگہ ہلکا سا مزاح کا
 چلہ سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کسی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے
 نرم لہجے میں، اور ذوق سے، اپنا عندیہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔
 لکھنے پڑھنے کا شوق انھوں نے درشتی میں پایا۔ ان کے خاندان نے علم و ادب کی ترقی
 و ترویج اور قوم کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت میں جو نمایاں خدمات سر انجام
 دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، اور یہاں ان سے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت
 بھی نہیں رہے یہ ممکن ہی ہے۔ شیدین نہ صرف ان اقدارِ عالیہ کے وارث تھے بلکہ

تذکرہ معاصرین

انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے گفتار و کردار کو ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے معصروں کے سامنے عمل نمونہ پیش کیا۔ ان کا موضوع سخن تعلیم تھا۔ وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزِ مرہ کی گفتگو کے ذریعے سے اپنے عہد کے زجوانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کتا، دھرتا بننے والے تھے سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا مستحق کون ہے اور کسی شخص کو اس لفظ "اچھا" کا مصداق بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ سیدین کا مطلع نظر بھی ساری عمر یہی رہا۔

وہ اقبال کے عاشق تھے۔ ہر اقبال کا بشیرِ کلام انہیں یاد تھا۔ وہ تحریروں و تقریریں بلکہ عام گفتگو میں بھی عموماً اقبال کے اشعار استدلال یا موضوع کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اقبال کا تعلیمی فلسفہ کے عنوان سے ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی تھی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ اس موضوع پر آج تک بہت اچھا کتاب ہو۔

ان کی بیشتر کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ اردو میں مندرجہ ذیل عنوانات ہیں :

روحِ تہذیب (دلی ۱۹۳۲ء)؛ اصولِ تعلیم (سندھستانی اکادمی، الہ آباد ۱۹۴۹ء)؛ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (۱۹۳۵ء)؛ قری سیرت کی تشکیل (۱۹۳۸ء)؛ شہیدِ وفا (بلاؤں ۱۹۳۴ء)؛ آئینہ میں چراغ (دلی ۱۹۶۲ء)؛ ذہنِ انسانی کا ارتقاء (نظامِ بک، دلی ۱۹۶۶ء)؛ زبانِ زندگی اور تعلیم (انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۷۱ء)؛

آئینہ میں چراغ پر انہیں ۱۹۶۶ء میں سائبیتہ اکادمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ آخری کتاب (زبان، زندگی اور تعلیم) زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ ان کی وفات کے کوئی ہفتہ بعد شائع ہوئی۔ انگریزی کی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں کی تعداد ۲۸ ہے۔

تذکرہ معاصرین

ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ماہِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ڈاکٹریٹ ڈگری کی اعزاز کی ڈگری پیش کی تھی۔ ان کے احباب نے ایک مجموعہ تصانیف بعنوان اذقانِ الفت ان کی ساتھویں سالگرہ پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ان کی نذر کیا تھا، اس کے مرتب ڈاکٹر سید عابد حسین ہیں اور یہ کتاب صدر جمہوریہ منہ ڈاکٹر سر وپلی دادو حاکم شنن کے ہتھوں پیش کی گئی تھی۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۶۶ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی نوازا کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب چلی آ رہی تھی۔ وہ ہنوز مسلکِ ملازمت پہنچے تھے کہ انھیں دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہیں ۱۹۵۰ء میں پہلا دورہ پڑا۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں کی۔ حسبِ معمول اپنے کام کاج میں لگے رہے۔ بے لے بے بڑی اور جوانی سفر بھی کرتے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں وہ ریٹنسکو کے کسی کام سے عراق گئے۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ یہاں آیا م میں بغداد میں مقیم تھا۔ بری ان سے پہلی ملاقات وہیں بغداد میں ہوئی۔ ان گزشتہ میں بائیس برس میں چارے تعلقات میں بہت گہرائی آ گئی تھی۔ ان کی وفات سے میں ایک مہرمان دوست سے محروم ہو گیا۔ رحمتہ تعالیٰ۔ جیسا کہ کچھ چکا ہوں ۱۹۶۳ء میں وہ دس کھن میں تھے۔ وہاں ان کی رہتی حیات کا انتقال ہو گیا (۲ جنوری ۱۹۶۳ء)۔ اس کا ان کی صحت پر بھیدناخوشگوار اثر پڑا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ وہ اپنی خوشامدادی سے مردادوار کام میں جھٹے رہے۔ لیکن یہ امر واقع ہو کہ اس حادثے سے ان کا دل بچ گیا تھا۔ دل کا دوسرا شدید حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ میں ہوا، جہاں وہ مسلم یونیورسٹی کے جلیلِ تقسیم اسناد میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد سوارِ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ٹکے ٹکے چلے ہوتے رہے۔ تیسرا شدید حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو سینے میں درد کی شکایت کی۔ حسبِ دستور ان کے معالج انھیں اپنے ساتھ اسپتال لے گئے۔ اگلے دن (۱۹ دسمبر) کو فی سواتین بجے اللہ کا یہ نیک بندہ

مذکرہ معاصرین

اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گیا۔ ہوش و حواس اکثر تک قائم رہے، بلکہ تین بجے تک وہ حاضر سے بائیں کہتے اور انہیں مختلف باتیں دیتے رہے تھے۔ تجہیز و تکفین ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہوئی۔ نماذ جنازہ مولانا سید علی صاحب (پیش امام مسجد پنجہ شریف، کشمیری گیٹ) نے پڑھائی، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

آسمان تربت پر تیری عنبر افشانی کرے!

نواب کلب علی خان (ف ۱۸۸۷ء) والی راہپور کے ایک بیٹے شبیر علی خان تھے۔ سیدین کی شادی انہیں کی صاحبزادی عروج جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں (دہرو، بلقیس، سیدہ، ذکیہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔

اِشَارِیہ

۱۔ اشخاص

کسی ہند سے کیے گئے پیر سے مراد ہے کہ اس شخص کا نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے،

ابراہیم علی عیش کھنوی، میرزا ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰

ابراہیم علی خان (والی قونگ)، ۵۳

راہین ہڑک، ۱۸۹

ابوالحسن ۸۵

ابوالحسن ناطق گلاؤنٹھری ۱۱۷

ابراہیم انصاری، ۳۰۷

ابوالوفا (مولانا)، ۲۹۷

ابوسعید خدیجی، ۱۳۷

اثر صبا، عبدالمصیب پال، ۸۰

اثر کھنوی، جعفر علی خان، ۲۷۷

اجمل خان، حکیم ۳۰۱-۳۰۲-۳۲۸

احسن ماسر وی، علی امین، ۲۳

احسن مراد آبادی، ۱۷۲

احمد ابراہیم طوی، ۱۲۲

احمد اسلم (شاہ احمد)، ۲۷

احمد حسن دیکھ پڈک، ۱۱۷

احمد حسین (سید)، ۹۲

احمد خان (مسعود)، دیکھ مسعود

آبرہی، ولیم، ۱۶۳

آزاد، احمد حسین، ۲۳۱، ۲۳

آزاد، ابوالکلام ۱۰۷-۱۰۸، ۱۰۹-۱۱۰، ۱۹۳، ۱۹۸

۳۸۹، ۳۸۸، ۳۳۹، ۳۳۳، ۱۹۹

۳۰۴، ۳۰۱، ۲۹۹، ۲۹۸، ۲۹۰

۲۱۱

آزاد، محمد حسین، ۳۸۹

آسکر فاکس، ۱۹۹

آس الدینی، ۲۷۹

آشفہ کھنوی، ۳۵

آغا ستر کاشمیری، محمد شاہ ۱۹۳

آفتاب احمد خان، صاحبزادہ ۳۰۹

آفتاب اختر، ۲۲۶

آلی رضا (سید)، ۲۳۰، ۲۳۱

آلی نبی (سید)، ۳۰۹

۱

آبید خان (دیباں پٹیر احمد)، ۳۱۱

ابراہیم رحمت اللہ سرا، ۲۸۲

۱۱۷	بٹن، حکیم احمد حسن	۳۷۵۰۳۷۳	اکرام علی بھٹل (یتیم)
۱۱۸	براؤن، ایڈورڈ جان	۳۰۹	اکرم ابن ہر
۱۱۹	براؤن، ولیم	۱۲۵	الطاف شہیدی
۱۲۰	برنی، ضیاء الدین	۹۰	انزاقی
۱۲۱	بھٹل، خیر آبادی، احمد حسین	۲۹۲۰، ۱۹۳، ۱۹۴	انتیاز علی صاحب
۱۲۲	بھٹل، سید اکرام علی	۲۹۳	انتیاز علی خان مرثی
۱۲۳	بشیر الدین	۲۲۸	اصغر علی شاہ دادوہ
۱۲۴	بشیر الدین (مولوی)	۳۰۹	ابو مسلم ابن ہر
۱۲۵	بشیر الدین احمد دہلوی	۱۷۱	ادوارڈ مہاجرین
۱۲۶	بھٹن، (بگم صاحب)	۳۷۶	امید ایشوری، ابوالکمال
۱۲۷	بھٹن، (بنت سیدین)	۱۳۱	امیر محمد طوی
۱۲۸	بھٹن، چند پتر	۲۸۳	امین الدین
۱۲۹	بھٹن، ذکر یاد	۷۱	امین چند
۱۳۰	بھٹن، گھنوی	۱۹۷	اما (دختر آبروی)
۱۳۱	بھٹن، سرین شون	۹۰	اندلس مراد آبادی
۱۳۲	بیان یزدانی، غلام مرتضیٰ	۲۶	انصار نامری
۱۳۳	بھٹن، برج کشن کول	۱۰۳	انصاری، مختار احمد ڈاکٹر
۱۳۴	بھٹن، عباس علی خان	۲۸۹	انور دہلوی، امرا ویرزا
۱۳۵	بھٹن، محمد احمد	۵۹، ۳۰	انیس، میر پری
۱۳۶	بھٹن، دید الدین	۱۳۷	اودنگ زب (مالکیر)
۱۳۷	بیدل، عبد الستار	۱۳۳	اولاد حسین شانان بگلری
۱۳۸	پ	۲۸۲	ایلیش، شمس الدین
۱۳۹	پرویز شاہکی، محمد اکرام الدین	۱۹۶	ایلیٹ، فی مائیں
۱۴۰	پرمجاری، (مندیب شانانی)	پ	پ
۱۴۱	پطرس بخاری، سید احمد شاہ	۳۳۲	بارکر، سرائیٹ

۹۳ شہر، بین الہدیٰ
۲۵۷ شماراٹھ کا پوری

ج

۱۹۹ جارتہ ہزارو شا
۳۷۹ جالب دہلوی، سید بشارت علی
۲۳۸ بجائی، خود شیدا احمد
۲۰۳ جاوید (پسر شکیل)
۳۰۹ جاوید سلطان
۸۷ جدو زاتہ سرکار دسر
۲۶۷ جگر بریلوی، شام مہربن لال
۲۰۲، ۲۰۱ جگر مراد آبادی، علی سکندر
۲۰۳، ۲۰۲

جگن ناتھ

۴۰ جلال لکھنوی، خاص علی
۳۷۸، ۱۱۸ جلال الدین، جہانیاں جہانگشت
۳۸۲، ۳۸۱ جلال الدین سرخ بخاری
۳۸۲، ۳۸۱ جلیل انجوری (فصاحت جنگ)
۱۸۲
۲۱۵، ۲۱۴

۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۱، ۱۹۹ جمیل احمد قادری
۱۳۲، ۵۲ جمیل منطری
۳۸۸ جناح، محمد علی
۲۵۸، ۱۸۲ جوش ملیح آبادی، شبیر من خان
۱۱۷ جوش مسیانی، بصورام
۲۱۲ بہان آکا (بگیم خانہ خواں)
۱۰۰، ۹۹ جمن خان

۱۹۹ پیر، ایڈگر الین
۲۹۲ پیرالوتی

د

۲۹۱ داجوہ نجیب آبادی
۳۱۱ داتا چنہ (ڈاکٹر)
۲۵۹ تسلیم، اساس الدین
۳۷۹، ۳۷۸ تسلیم، دایمیراٹھ
۲۸۳ تسلیم، محمد شاکر
۲۹ تفضل حسین خان (ظاہر)
۱۰۲ تقی زادہ ایرانی
۳۹۹ تلجا پرشاو
۳۹۳ تھکین کاظمی
۳۱۰، ۳۰۹ ترنا لکھنوی، رام سہاسے
۲۵۸، ۲۱۱

۳۵۹ حیرتہ رام فیروز پوری
۲۶۰، ۲۵۸ تیغ الہ آبادی، مصطفیٰ حسینی

ڈ

۱۵۵ ڈالستانی
۱۹۲ ڈائن بی، آرنلڈ
۳۵۷ ڈاکٹر پرشاو کول
۱۹۸ ڈیگور، راجند ناتھ

ڈ

۳۸ ثروت آکا بیگم
۳۱۳ ثروت جہان
۱۴۲ ثمر بسوانی

۲۵۷	حسین احمد لدنی (مولانا)	۱۹۹	میروم کے میروم
۱۲۳	حسین خان	۲۵	مین آسٹن
۳۲۳، ۳۲۴	حسین، علی عباس		ج
۲۰۳	حضور احمد	۳۰۰	چراغ حسن حسرت
۲۹۳	حفظ الرحمن (مولانا)	۲۸	چکبست، برج نرائن
۳۰۰، ۲۹۳، ۲۰۰	حفیظ جالندھری، ابوالاثر	۲۱۲	چند کلاویں مشہور
۱۷۱	حفیظ اللہ	۱۹۹	چیک کیرن
۱۹۳	حمید علی	۱۳۸	حیونوف
۱۹۲	حمیدہ بیگم		ح
۱۷۱	حمید حسن خان (مولانا)	۳۱۰، ۳۰۷، ۳۱۵	حالی، لطافت حسین
۲۵۸	حمید رضا	۱۷۲، ۱۰۳	حامد علی خان
۳۱۸	حمید علی خان (نواب)	۳۱۱	حبیب الرحمن، پردہ فیسر
	خ	۱۹۷	حجاب اطمین
۱۲۳	خان الایا شاہ	۳۰۰	حسرت، چراغ حسن
۳۱۸	خستہ، ہرگوپال	۳۳۹، ۱۸۹	حسرت موہانی، فضل الحسن
۹۱	خضر داہیر	۳۰۱، ۳۷۹	
۳۱۲	خضر حیات خان ٹوانہ	۱۷۱	حسن بن حسن یافعی
۳۲۲	خلیق احمد نظامی	۲۹۰، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸	حسن شاہ (پیر)
۵۵	خلیل، ابراہیم علی خان (ٹوٹک)	۳۳۹	حسن قلعی، شفق مراد پوری
۳۲۹	خلیل جبران	۲۰۵	حسن بریلوی، حسن رضا خان
۲۲۲	خوار ابو بنگوی	۱۹۹	حسن نظامی
۳۰۷	خواجہ احمد عباس	۳۸۲	حسن الحسینی (شاہ)
۱۸۹	خواجہ احمد فاروقی	۲۸۳	حسین الدین
۲۰۸	خیال کھنوی، آغا پرشاد	۲۲۸	حسین (پیر ارب)
		۹۵	حسین، امام

۳۱۵	راغب اکشتی، مروی	د	
۲۹۹	راشد بن م (تقدیم)	دانش دلوی، قواب مرزاخان	۱۹۰۲۳
۳۰۶	راغب مرزا آبادی		۲۶۶، ۲۵۳، ۱۱۸۰، ۹۱۵
۲۵۷	راگونہ کول	دیر کھنوی	۵۹
۲۸۹	رجب علی شاہ (اصطرباہ)	درویش محمد	۲۸۳
۳۱۳	رشید احمد صدیقی	دگیر اکبر آبادی	۱۹۳
۲۲۸	رضا علی، میرزا (اورم)	دلیل خان	۹۰
۲۸۸	رضوان اللہ	دیا نرائن سنگھ	۱۵۳
۲۲۷	رفعت اللہ	دیری، راجہ ناتھ کول مرض یگی	۲۵۹
۳۱۲	رفعت جہان (بخت شیر احمد)	دیوہ کول	۲۵۷
۲۷۵	رنگبر دیال	دیوی پرشاد	۲۷۰
۳۵۵	رمز نگری، دھابھت حسین	ذ	
۳۲۸	رنج میرٹھی، فصیح الدین	ڈوبدان، دل	۲۹۲
۳۵۵	ریاض الحسن بگڑی	ذ	
من		ذکر حسین (ڈاکٹر)	۱۹۹۰، ۹۸۸، ۸۹۰، ۳۹
۳۱۵	زمینہ کشنوم		۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶
۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱	زور، محی الدین قادری		۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰
۳۱۷، ۳۱۵			
۳۱۶	زہرہ (بخت سیدین)	فردہ کھنوی، پورتن چند	۲۰۸
من		فردہ، محمد حسین	۲۸
۹۵	ساحرہ احمد شجاع (حکیم)	فک داری	۷۳
۲۱۱	ساحرہ امرا ناتھ (پنڈت)	فکیتہ (بخت سیدین)	۳۱۶
۳۱۸	ساک، ساک رام	فوالفقار علی (سید)	۱۹۲
۳۰۲، ۳۰۱، ۳۰۰	ساک، جہاںگیر	فوالقدربنگ	۹۱
۲۵۲	سائل دلوی، سراج الدین سرفازان	ر	
		راجہ ناتھ کول مرض یگی دیری	۲۵۹

۲۳۹	مندیال (پنڈت)	۳۰۷	سبحان خاں
۲۷۹ + ۲۷۵	سوزن بریلوی، لہور پشاور	۳۱۸	سبقت، مہتاب راسے
۳۳	سہگل، گندک لال، گلگت	۳۲۷	سفاوت حسین
۳۴۰	سید احمد بخاری	۱۹۶	سرشار، رتن ناتھ (پنڈت)
	سید احمد بریلوی	۳۱۵	سرولی، ماروا کرشن
۹۳	سید احمد دلوی	۳۸۸	سرورجی ٹائیڈ
۹۱	سید حسین بگرامی (عماد الملک)	۱۸۹ + ۱۰۶ + ۹۱	سرسید احمد خان
۳۱۱	سید سجاد (ڈاکٹر)	۲۹۹، ۱۹۲	
۸۷، ۸۹، ۸۵	سید سلیمان ندوی	۳۸	سرور، دنگا سہیلے
۳۱۵	سید طاہر حسین	۹۱	سروا الملک سرور جنگ
۳۱۶	سید علی (مولانا)	۳۳۹	سردش عظیم آبادی
۱۷۱	سید علی زینبی	۵۲	سری کرشن سنہا
۳۱۶	سیدہ (ہنس سیدین)	۱۹۷	سرتا (جگم آبروی)
۳۱۰	سیدہ خاتون	۱۰۳	سعید انصاری
۳۳۹ + ۳۳۸	سیف الدین احمد (حکیم)	۲۹۷	سعیدہ (جگم روش)
۲۶۳، ۳۴۰		۲۳۳	سگار کھنوی
۲۵۷	سیف الدین کچلو (ڈاکٹر)	۳۰	سگنڈ کرانکی
۷۳	سیاہ اکبر آبادی (مشتوق حسین)	۲۷۹	سلام سندیلوی
۳۶۸ + ۳۶۷ + ۳۵۸ + ۱۵۳ + ۱۲۵		۲۲۸	سلطان جان گیم، بھوپال
مش		۲۰۳	سلطان (جگم شکیل)
۱۹۶	شاہ جادو بنارڈ	۹۱، ۳۸	سلیم پانی پتی، وحید الدین
۳۵۵	شاہ عظیم آبادی، علی محمد	۳۰۰، ۳۱۹، ۳۱۳	
۲۵۵ + ۱۲۳	شاہان بگرامی، اولاد حسین	۲۳۸	سلیمان (بن عبدالرزاق)
۳۵۰	شاہا پشاور	۹۱	سلیمان (سر شاہ محمد)
۲۹۷	شاہ پھیل احمد	۹۱	سلیمان اشرف

۳۱۸	صمد الدین شاہ	۹۳	شاہ حسین (سید)
	صمد یار جنگ (حبیب الرحمن خان شروانی)	۳۱۰	شاہین جہانپور (میان)
	۹۳	۳۱۹	شاہ مرزا گل سوئی
۵۲	صمدی حبیب	۹۱	شاہ محمد سلیمان (سر)
۱۲۵	صفدر اسید صفدر حسین	۸۹	شبلی (مولانا)
۱۲۳	صفدر علی اہلانی	۱۵۱	شبلی (فتیہ اول)
۹۳	صفیر بگرامی، فرزند احمد	۳۱۶	شبیر علی خان
۲۰۳	صفیر (جنت لکھیل)	۲۸	شجاع الدولہ
۲۳۸	صفیر (بیگم اریب)	۲۱۲	شرم، چند کلا دیوئی
۲۲۰	صوفی، شاہ مرزا لال	۲۰۸	شعاعی گھنوی، ایشور پرشار
۲۸۲	صبا قریشی	۳۳۹	شفیق عمار پردی، حسن منٹھی
	حق	۳۸۲	شمس الدین المیتش
۹۳	ضو اسید احمد حسین	۲۵۷	شنکار چاریہ (سوی کوشن ترکت)
۱۰۱	ضیا الدین (ڈاکٹر)	۳۵۹	شوق، بگوس دینہ
۳۷۵	ضیا الدین قادری	۲۸۵	شوکت، محو تشام الدین
۲۵۰	ضیا القادری بدلولی، محمد یعقوب	۲۳۲	شوکت، حقانوی، محمد عمر
	۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۰۱	۱۷۳، ۱۷۲، ۱۰۱	شوکت علی (مولانا)
	ط	۱۰۳	شیدا، اجمل خان (حکیم)
۲۰۳	طارق (پیر لکھیل)	۱۲۵	شیدا، راجندر ناتھ
۳۰۹	طارق (پیر مہرا)	۱۱۸	شیل (پرسی بسن)
۹۸	طالب حسین فرخ آبادی (پیر)	۲۱۰	شیخ فرزانہ بٹناگر
۱۷۰	طغیل احمد مستی		ص
۲۹۷	طغیل احمد شاہ	۲۱۲	صابر براری
	طیب جہ، بددا الدین فیض حسن بددا الدین	۳۱	صابر نادر حسین
	۳۳۳	۲۰۸	صمد گھنوی، لکھن پرشار

۱۸۹۰-۱۸۸۸	عبد الشکور (پرویسر)
۳۷۵	عبد العزیز حکیم
۳۹۱	عبد العلی، سید
۳۵۳	عبد الغفار (کاشی)
۳۱۱	عبد القادر شیخ، سر
۲۲۰-۲۱۹-۲۱۸	عبد القادر الہوی (لقا)
۲۱۹	عبد القادر الہوی (سلاط)
۳۱۷	عبد القدیر صدیقی
۱۸۹۰-۱۸۸۸	عبد الطیف (ٹپٹی)
۳۸۳	عبد الطیف قادری (بابا پرادشاہ)
۳۰۲، ۳۰۱، ۳۰۰	عبد الحمید سالک
۳۱۷	عبد الحمید صدیقی
۲۱۹	عبد القدر قادری
۳۰۰	عبد اللہ انصاری
۲۱۹-۲۱۸	عبد اللہ الہوی (شیخ)
۲۹۲	عبد اللہ ابن عباس
۵۳	عبد اللہ خان (ٹونک)
۳۸۸	عبد اللہ باریک
۱۷۱	عبد الوہد جیرا چوہدری
۳۳۲	عبد اللہ سندھی
۲۸۴	عبد اللہ غلیف سوم
۱۹۱	عبد اللہ علی خان (نظام دکن)
۲۸۷-۱۹۲	
۹۳	عراقی، نوری الدین
۳۹۳	عزیز الدین، اشیاء علی خان

۳۰۱، ۳۰۰	ظفر علی خان
۱۱۸	ظہور الدین (سید)
۵۵	ظہیر دہلوی
	ع
۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱	عبد حسین (سید)
۳۸۸	عابد ربا
۳۹۱	عابد علی خان
۵۵	عاشق محمد سید خان (ٹونک)
۳۰۷	عباس نواب احمد
۳۲۳	عبد الحسین منطقی (سید)
۳۳۹	عبد الحی (محدث دہلوی)
۳۱۵، ۳۱۳	عبد الحی (مولوی، ڈاکٹر)
۲۵۲، ۲۱۷	
۳۸۳، ۱۷۳	عبد الحکیم (خلیفہ)
۳۷۳	عبد الحکیم شاہ (دادا میاں)
۱۷۱	عبد الحکیم صدیقی
۲۵۲	عبد الحمید لاہوری
۱۰۳	عبد الحی (نواب)
۱۷۱	عبد الحی قرنی علی
۲۹۳	عبد الرحمن بھٹوی
۱۷۱	عبد الرحمن ٹکرائی
۳۰۶	عبد السلام سلم
۱۷۳	عبد السلام قدوائی ندوی
۲۹۹	عبد المتین بیدل

غ	مرفان حبیب
۲۱۹۰۱۱۸	میرزا کسنوی، محمد بادی ۲۹ ۲۵۰
۱۹۹	۲۳۲۰ ۲۳۹
غلام اشقلین ۳۱۰۰ ۳۰۹۰ ۳۰۸۰ ۳۰۷	عزیز، نعرشد خان ۳۰۰
غلام الحسنین ۳۰۷	عزیز احمد ۳۱۶
غلام السبطین ۳۰۸ ۳۰۷	عشرت کسنوی، عبدالرؤف (خواجہ) ۲۱
غلام حسین خان ۹۹	عصمت، دشت مطلق (زیدی) ۲۶۰
غلام رسول، مہر ۳۰۰ ۲۸۸	عطا محمد (شیخ) ۸۱
غلام عباس صفر ۲۹۰	خلعت علی (میر) ۸۵
غلام علی پیرزادہ (میاں جی) ۳۷۳	عقیل احمد جعفری ۱۷۱
غلام غوث (سید) ۱۱۷	علی احمد جلیپوری ۳۷۲
غلام مجدد (سندھی پیر) ۳۵۷	علی اختر حیدر آبادی ۱۸۲
غلام محمد خان ۲۸۰	علی اشرف (سید) ۵۷
غوث علی الدین ۱۴۷	علی المؤید ۳۸۲
ف	علی بوزدان (شوکت علی محمدی) ۲۵۷
فاروق شاہین ۳۰۶	علیم اختر منظر نگری ۱۲۵
فتح البیار ۳۳۸	علی محمد راشدی ۳۸۸
فخر الدین عراقی ۹۳	علی نقی کوٹاہ مدیم، ۳۸۲
فدا حسین (قاضی) ۲۲۱	عماد الملک (سید حسین بگلراجی) ۹۲۰۹۱
فدا حسین خان ۹۸۰۹۷	حنایت اللہ ستیہ ۱۱۸
فراق گوردھپوری، گھوڑی سہاسے ۲۵۸۰۱۸۲	حنایت رسول چریا کوٹی ۹۱
فراقی دیوبادی، راے سدھ ناتھ جی ۲۱۱	حوض علی (ستید) ۷۲
فرحت، گنگا دھن ناتھ ۲۶۷	عیش کسنوی، میرزا ابراہیم علی ۲۲۸
فرخندہ محنت (میرزا) ۲۲۸	۲۳۰ ۲۲۹
فضل حسین خان (میرزا) ۲۹	

۱۸۱	سلیم الشہرچی	۲۲۱۰۲۰۹	فضل رسول بالوئی
۳۳۹	کمال حبیب	۲۳	فضیلت النساءیم
۳۵۸	کیفی، برمجوبن و قاریہ	۷۰	فقیر عزیز الدین
	گ	۷۱	فقیر نور الدین
۳۸۸، ۳۸۰، ۱۸۹	گلاندی (مہاتما) ۳۲	۱۸۱	فہیم، صدیق احمد تانوی
۱۶۶	گجبار مصری شاہ	۱۷۰	فیاض احمد
۳۳۷	علی حسین	۱۸۲	فیض، فیض احمد
۳۱۹	گنپت سہاسے (نظری)	۳۱۶	فیض محمد
۲۵۲	گنگا سنگھ (مہاراجا)		ق
۲۰۳	گوپال ریڈی و بی	۳۱۰	قادر بخش مولوی
۲۱۰	گوردی سہاسے (ڈاکٹر)	۳۸۹	قاسم رضوی
۲۹۹	گوکرن پرشاہ	۲۵	قائم علی (خان بہادر، سید)
۳۱۲	گھنیر آزاد (بگم بشیر احمد)	۳۸	قرۃ العین حیدر
	ل	۲۹۹	قمر سنبھلی
۲۵۳	لاری، متبول احمد	۳۳۰	قیس، شمس الدین
۲۲۰	لال بہادر شاستری	۲۰۸	قیصر کھنوی، جگدہا پرشاہ
۱۱۸	لاگ فیلو	۷۳	قیصر بھوپالی، محمد یوسف
۳۸۹	لائق علی (میر)	۲۰۴، ۲۰۰	قیصر حسین قادری
۱۹۶	لشن، لارڈ		ک
۲۵۸، ۲۵۷	لخت سنہین (سید)	۲۰۲	کاردار (سٹر)
۳۵۹	لہ مارڈ	۲۶۶	کاکا پرشاہ
۲۹۳	لیاقت علی خان (مہاراجا)	۶۰۵۵۹	کامل نظامی
	م	۲۵۷	کوشن برحق، سوامی (شکر آچاریہ)
۱۹۰، ۱۹۳	مالک رام	۲۹۹	کلب علی (حکیم)
۱۸۹	مائل و لہوی، مرزا محمد تقی بیگ	۳۱۶	کلب علی خان (نواب)

۲۳۸	محمد شریف	۱۹۹	بابک علی سوز
۲۸	محمد شفیق (میرزا)	۲۵۹	جنتی (پسر مصطفی نوری)
۳۱۲	محمد شفیق (سزاییان)	۲۵۸	جنتی احسن
۱۲۰	محمد عبدالعظیم	۲۲۵	مجنون گورکسوری، احمد صدیق
۲۵۲	محمد عثمان عارف	۲۸۲	محبوب (بیگم عابد)
۳۰۱، ۲۵۴، ۱۴۲، ۱۰۱	محمد علی (سولانی)	۹۰	محبوب عالم (نشی)
۲۲۸	محمد علی شاه (اودره)	۹۱	محبوب علی خان (نظام دکن)
۳۴۳	محمد گیسو دواز	۳۴۹	مشر سوبانی
۳۱۸	محمد فضل الرحمن	۱۲۹	مضبوط الحق
۱۹۲	محمد قاسم نالوتوی	۵۲	مضبوط الحق (جامعی)
۸۹، ۱۵۵	محمد سعید (دکتر)	۳۰۱، ۲۱۹، ۱۲۵، ۹۱	محمد رسول الله
۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴	محمد حبیب (پرویس)	۱۸۹	محمد ابرار حسین غاروتی
۳۳۹، ۳۳۱		۳۹۰	محمد اجل خان
۳۳۹	محمد مضبوط	۲۸۵	محمد اشقام الدین
۹۰	محمد تنجیب الله خان مقبول	۱۴۳	محمد اکرام، بشیخ
۱۱۱، ۹۰، ۸۹	محمد حیدر علی خان شروانی	۲۹۶	محمد اکرم نعمت کجیانی
۹۲، ۹۲		۲۸۹	محمد باقر
۲۴۲، ۲۴۱	محمد نذر	۱۲۵	محمد فضل الله خان
۳۳۱	محمد نسیم	۳۱۳	محمد جعفر
۳۳۱	محمد نسیم	۱۵۳	محمد جعفر حانقل
۱۹۲	محمد یعقوب	۳۴۹، ۳۴۵	محمد حسین، نشی
۱۸۱	محمد یعقوب	۳۲۹	محمد حسین بیکل
۲۱۹، ۲۱۸	محمد یعقوب	۳۱۳	محمد سرور (حاجی)
۱۹۸، ۱۹۳	محمد بیگم	۱۴۱	محمد سلیم کشتوری
۱۹۹	محمد (میش تید)	۳۳۳	محمد سلیمان (سر شاه)
		۳۹۲	محمد سلیمان عباسی (قاضی)

۳۳۲، ۱۹۹	مولیٰ لال ہیرو	۱۱۷	عمود الحسنی (مکملات)
۲۵۱	مولانا بخش (شیخ)	۳۸۹	عمود الدین عثمانی، ابوالفضل
۳۷۸، ۱۲۵	مولوی	۲۹۳	عمودہ
۵۹	مولوی لال بھونک		عمی الدین قادری زور... دیکھیے زور
۲۲۹، ۲۲۸	مہدی حسین میرزا	۳۱۰	فخار خاں
۲۱۸	مہتاب علیہ بخت	۲۲۸	مقدم علی الدین
۳۰۰، ۳۸۸	مہر، غلام رسول	۹۱	میرزا الشرفان (غواب)
۲۷۹	مہر بریلوی، گوشتیور زائی مہرا	۳۱۰	مستحسن زیدی
۲۱	میر، میر تقی	۳۱۰	مصداق خاں (سالار علی حسین)
۸۰	میر حسن استیاد	۲۵۸	مصطفیٰ حسین
۸۵	میر محمدی (حکیم)	۲۷۱، ۱۵۵	مضطر غیاثی
۳۰	میکش، مرتضیٰ احمد خان	۲۰۸	مطلق الحسنوی، اوڑھے راج
۳۱۰	میکنزی (مستر)	۲۷۱، ۲۵	منظہ علی (میر)
۲۹۳	مینو میر	۱۲۳	منظہ علی شاہ ایرانی
	ن	۷۲	منظہ علی (شاہ گویا داری)
۲۵۸	ناصر رضا	۲۳۱	مستور، میرزا محمد مرزا
۳۰۵، ۱۷۰	ناظر حسین	۲۵	مقصوم علی (میر)
۸۹، ۱۵۵	نجیب اشرف ندوی	۳۰۷	گلک علی (خواجہ)
۲۰۳	نجمہ (بنت گلعلی)	۱۹۳، ۱۹۲، ۳۹	منازل علی (مستید)
۳۹، ۲۵	نذرا باقر (میر)	۲۸۳	منظر (فائز، شہید الدین قادری)
۲۵	نذر زہرا بیگم	۲۷۱	منشور، سادات حسن
۳۸۱، ۳۷۱، ۳۹	نذر تجاویز	۱۹۹	منظر علی سوز
۲۹، ۲۵	ذیر احمد (شخص العلماء)	۱۷۲، ۱۷۳	منظر علی، جلیل الطیفی
۳۷۵	نسیم باسفر علی خان (غواب)	۲۰۸، ۵۹	منور الحسنوی، بشیش پور شاہ
۳۰۰	نصیر احمد خان عزیز	۳۵۸، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹	

۲۴۸	واحد خاتون	۵۳	نصیر الدولہ (ٹونک)
۳۷۷	وارث علی شاہ (دیوبند)	۳۷۳	نصیر الدین، چراغ دہلی
۱۴۳	وحشت گلگتوی، رضا علی	۳۱۷	نصیر الدین ہاشمی
۲۳۶	وحید الحق حق	۲۱۸	نظام الدین (خواجہ)
۳۱۳، ۹۱، ۴۸	وحید الدین سلیم پانی پتی	۳۱۰	نظام الدین (مولوی)
۳۰۰، ۳۱۶		۳۷۴، ۳۳۲	نظام الدین اولیا
۳۸۳	وحید الرحمن (پرویسر)	۲۱۱	نظر، فوتہ رائے
۳۵۵	وہل بگراہی، مقبول حسین	۲۳۶	نعمان احمد (قاضی)
۵۹	وفا، دھرم پال گپتا	۲۹۳	نفیس کھنوی
۲۳۰	وقار، اوشن صاحب	۳۸۳	نواب علی، تیرا چورسری
۸۱	وقار الملک، مشتاق حسین (نواب)	۲۲۲	نور، یوسف سن
۲۵۹	ویرا ناہن ہل (بگیم سعلانی زیدی)	۲۶۳	نور احمد
ک		۵۲	نور احمد
۸۵	باشم شیر	۳۳	نور الحسن (شیخ)
۱۹۹	ہدایت اللہ سونہ	۱۸۳	نورانی بگیم
۳۱۱، ۳۱۰	ہمایوں، میاں شاہدین	۸۱، ۳۷	نور محمد (عرفت میاں حق)
۳۱۱	ہمایوں بکیر	۳۳۲، ۳۱۵، ۲۷۲	نوری، نور اللہ
۱۹۹	ہیوگو، دکر	۲۰۲	نوشاد علی (ستید)
ی		۲۵۲	نہال سنگہ (رائے بہادر)
۲۱۸	یاد حسین (شیخ)	۳۰۰	نیاز فقیری
۳۵	یاس یگانہ، واجد حسین	۳۰۵، ۲۷۰	نیاز احمد
۲۹	یلدرم، بجاوید	۲۰۸	نیماں، مانا پرشار
۲۲۲	یوسف حسن نور	و	
۸۹	یوسف خان	۲۴۸	واحد علی شاہ (ادب)

۲ مطبوعات (کتب، رسائل)

۲۸۱	اجالا (ہندی)	۳۳۰	آتش محل (بکر)
۳۰۰، ۳۶	اختر النایم (نذر جہاں)	۲۶۷	آجکل (ماہنامہ دلی)
	ادبِ اردو میں مختصر پوں کا حصہ	۱۹۵	آرام کے ڈرائے (تاج)
۳۵۹	(طالب)	۱۹۹	آرمینڈوی مین (شا)
۲۱۲	اداسے کفر (منقہ)	۵۲	آزاد (روزنامہ)
۳۱۷	اردو (تجاری)	۲۸۱	آسان ہندی (باسط)
	اردو غزل گوئی اور اردو حاضر	۱۳۱	آشفہ سری سری (ناظر)
۱۳۷	(عذلیہ)	۳۸	آفتاب وطن (آفتاب)
۳۱۸	اردو کی ادبی تاریخ (سردی)	۳۱۳، ۳۱۰	آندھی میں چراغ (تیدیہ)
۱۳۳	اردو کے ہندو ادیب (ناظر)	۱۱۰	آواز غالب (شاو)
۳۱۸	اردو شعری کا ارتقا (سردی)	۳۷	آؤ مظلوماں (نذر جہاں)
۱۰۳	اردو سے ملی	۱۱۰	آجئیں (شاو)
۵۲	استقلال (پٹنہ)	۳۲۵	آئیڈیل کنگ (اختر تلہری)
۲۳	اسلام اور نظریہ شرافت (رفیق)	۱۶۳	آئی سی ایس (حصینی)
۳۳۳	اسلامی تصوف کا آغاز (حبیب)	۱۱۰	آیات جنوں (شاو)
۳۲۹	اشک و شبنم (اشعر)		۱
۳۱۳	اصولِ تعلیم (ستیدیہ)	۳۲۵	اجلاسِ عظیم (اختر تلہری)
۲۱۳	افکار بلند و منور	۷۸	ابوحنان کی بکری (ذاکر حسین)
۷۰	اقبال الی بکیر (انگریزی)	۳۰	اتحاد و ہمنہ (انری)
	اقبال کا تعلیمی فلسفہ (انگریزی، ستیدیہ)	۳۰	اثرستان (اثر)
۳۱۳		۳۰	اثر کے تئیدی مہا مین (اثر)

۲۱۲	المیزان روز و لیٹ (منوی)	۲۲۱، ۲۰۱	اکمل القاری (منیا)
	ب	۹۳	البشر (آوارہ)
۲۵۳	بادشاہ نامہ (عبد الحمید لاہوری)	۲۶۳	البعیثہ و مدنیاس
۲۸۲	باسط کے سوشلزم	۲۶۳	البحر (ماہانہ)
۱۶۳	باسی پھول (حسین)	۹۲	المبین (سلیمان اشرف)
۲۵۴	باغ فردوس (بیدل)	۲۱۳	الہامات ایرانی (منوی)
۳۰۵	بال جبریل (اقبال)	۲۱۳	الہامات مغرب (منوی)
۳۰۵	بانگ درا (اقبال)	۳۹۹، ۳۹۸	الہلال (ہفتہ وار، کلکتہ)
۱۱۰	بانگ درا (شار)	۱۴۲	الی اکواخ الفقرا (منظوم)
۱۸۲	بارگ آوارہ (جامی)	۱۶۳	امیر خسرو کی کہانی (حسین)
۲۶۳	برہان (دہن نامہ دلی)	۱۹۳	انارکلی (تاج)
۲۳	بزم داغ (رفیق)	۷۱	انجن (فیروز حید الدین)
۱۳۸	بساط رقص (مخدوم)	۱۱۰	انڈیا گلاب (شار)
۲۹۳	بشر ہے کیا کہیے (ماہد)	۳۲۱	انڈی پینڈنٹ (روزنامہ کنش)
۹۲	بشری (چریاکوٹ)	۱۳۷	انٹائی ابوالفضل
	بہی میں اردو کا پہلا ڈرامہ - خورشید	۳۰۳	انقلاب (روزنامہ لاہور)
۱۹۵	(۵۷)		انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر
۲۴۹	بنفشہ کا پھول	۳۶۵	(لطیف)
۳۰	بہاراں (اثر)	۳۱۹	انگریزی ناول
۲۱۰	بہارت (ہفتہ وار)	۲۰۹	اودھ اخبار
۳۰	بہارستان (اثر)	۲۱۳	اودھ صوت کا تراش (منوی)
۳۹۰، ۳۵۹	بہار گلشن کشمیر (تذکرہ)	۳۰۷	ایجوکیشن (اسپنسر)
۳۰۰، ۲۰	بھگوت گیتا (کی شرح)	۳۶۸	ایشیا (ہفتہ وار)
۳۳	بیگناہ مجرم (سدرشن)	۲۹۲	ایفرو ڈائنٹ (انگریزی) - پیرالونی
		۱۶۳	ایک موت ہزار بلوے (حسین)

ت	ف
۳۱۲	اثاثات شوق (مستوفی)
۳۶۸	تاج (دہانہ نامہ گروہ)
۳۲۹	تاج (اشعر)
۳۹	تاج (جیلپور)
۳۲۱	تاج مضامین (غیا)
۳۵۶	تاج پنج بگلام (داز)
۳۳۲	تاج پنج بند (ہد ملکت)
۳۳۲	تاج پنج فیروز شاہی (برنی)
۳۴	تاجیانے (صد شش)
۹۵	تخلیفات جات (پرویر)
۱۴۷	تحقیقی مضامین (مذلیب)
۳۷	تخیلات (افضل علی)
۳۱۱، ۳۹۰	ترجمان القرآن (آثار)
۸۷	ترکب مولات (ندوی)
۳۰	ترکب زیبائی (علی بہادر خاں)
	تذکرہ جواہر زہیر و محمد ابراہیم خاں (دلی)
۱۸۹	تذکرہ شعراء صیغہ (شانی)
۲۸۶	تفسیر منظوم (مستوفی)
۲۱۳	تعلیمی خطبات (ذکر حسین)
۱۰۸	تقریرات (ہفتہ وار)
۱۰۹	تقریرات (ہفتہ وار)
	تفصیل البیان فی مقامہ القرآن
۱۹۳	(منازل علی)
۳۳۸	تلاذذ غائب (نائب نام)

پ	ف
۱۲۸	پاس گریبان (اریب)
	پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری
۱۱۰	(شاد)
	پانچ مقبول طنز و مزاح نگار
۱۱۰	(شاد)
۱۹۰	پرانیہ ایضہ پرچہ جوس
۳۵۹	پریشوی دلی چوبان (تبریز نام)
۳۶۸	پریم (دہانہ گروہ)
۴۰	پردہ اور اسلام (علی بہادر خاں)
۳۲۹	پکار (اشعر)
۲۸۱	پکار (ہفتہ وار)
	پھول (ہفتہ وار، لاہور) ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵
۳۰۱، ۱۹۳	
۶۱۰	پھوار (شاد)
۳۱۸	پھولین (ایمن ناشانی)
۱۳۸	پھولین (مخدوم)
۱۶۳	پھولوں کی چھتری (حسین)
۱۴۷	پیام اقبال (مذلیب)
۱۸	پیام تلک (تلک)
۱۹۹	پیام شرق و اقبال
۵۲	پیام وطن (روزنامہ)
۹۰، ۲۸۰	پیام یاد دہانہ لکھنؤ
۱۱۹، ۹۱	پیماخبار (لاہور)

۳۱۰	جذباتِ جلیوں (شایدین)	۱۹۰	تقیدِ سراپہ (عبداشکور)
۳۱۲	جگر بے لخت لخت (منور)	۳۲۵	تقیدِ شعور (اختر گلبرگی)
۳۸	جلوۂ آفتاب و آفتاب	۱۳۳	تقیدِ شعور (ناظر)
۲۲	جلوۂ احسن و رفیق	۳۰۱، ۱۹۳، ۱۹۲	تہذیبِ نسواں (لاہور)
۱۱۹	جلوۂ یار (ماہنامہ گلشن)	۲۱۰	تک (روزنامہ دلی)
۱۶۹	جوابِ شکوہ و اقبال	_____	ٹ
۲۲۱	جوارِ غوثِ الوری (منیا)	۳۲۹	ٹوٹے ہوئے پردا (شر)
۳۱۰	جواہراتِ عالی (عالی)	_____	ث
۳۰۹	جوش و ہوش (میتل)	۳۹۸	ثریا (ماہنامہ، آگرہ)
۱۷۲	جوشِ ہفتہ وار (بھی)	_____	ج
۳۵۹	جوہرِ آمینہ (طالب)	۱۳۳	جامِ بخود (بخود)
۲۸۲	جیون رکھا (باسط)	۳۷۱	جامِ جہاں نما (ماہنامہ گلشن)
_____	ج	۱۸	جامِ نلک (نلک)
۲۱۳	چارودت (منور)	۱۰۸	جامِ نکیا ہے (ذاکر حسین)
۱۹۶	چاچکین (تاج)	۳۷	جانباز (مذہباز)
۲۱۲	چراغِ دیو (منور)	۱۱۰	جانِ پیمان (شاد)
۲۹۵	چنار (ماہنامہ سرگلر)	۱۳۳	جانزے (ناظر)
۱۳۳	چند کلا (ناظر)	۱۹۹	جپ جی (ترجمہ محمد اہل خانہ)
۴۳	چندل (انٹائی)	۲۱۶	جدید اردو شاعری (مسوری)
۴۲	چندل (ماہنامہ)	_____	جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات
۱۳۷	چند مقالہ (مروانی سرمدی)	۲۶۳	(آزاد)
۳۰	چان بین (افسر)	۲۶۳	جدید سیاسی معلومات (آزاد)
۱۳۷	چھوٹا خدا (مندیب)	۳۷۱	جذباتِ سامی (سامی)
۱۳۸	چیری آدرچہ (مکتوف)	۳۸	جذباتِ کی دنیا (آفتاب)
۳۱۶	چینی اور جاپانی افسانے	۳۸	جذباتِ وطن (آفتاب)

د	پہلی جیل (شاد)
۴۱۲	ح
۲۹۲	حالی: حب وطن (ذاکر حسین)
۱۵۴	حالی کا نظریہ شاعری (ناظر)
۳۰۸	جباب کے ڈرامے (ناج)
۴۱۰	حب وطن (آفتاب)
۲۱	حریف راز (راز چانہ پوری)
۹۴	حدیقۃ المذاہب (تسلیم)
۴۱۳	حمران نصیب (نذر سجاد)
۱۱۰	حسرت موہانی (عبد الشکور)
۳۲۹	حسن (ماہنامہ حیدرآباد)
۳۲۳	حضرت امیر خسرو (حبیب)
۲۶۴	حکومت الہیہ (علی بہادر خان)
۴۱۹	حکیم بابا (حسین)
۱۵۴	حیدرآباد کے شاعر
۱۳۷	حیدرآباد لاہ پورٹر (انگریزی)
۱۱۰	خ
۳۰	خاوند (ماہنامہ ڈھاکہ)
	خروش اور گہوا (ذاکر حسین)
۱۹۰	خطوط غالب (مہر)
۲۶۵	خلافت (روزنامہ بنگلہ)
۳۵۶	ختم خسروی
۲۴۱	خورشید (روزنامہ کراچی)
۱۰۸	خون کے آنسو (منقوی)
۳۹۵، ۳۹۳	

۲۷۹	رسائل تصوف (افتقر)	۲۸۹	دیوان شائل
۲۵۹	رسمات التعمیل (طالب)	۱۰۲	دیوان شیراز (اجمل خان)
۲۰۳	رغزیاں (کلیل)	۱۰۲	دیوان غالب (اردو)
۱۶۳	رفیقہ تہلہ و مسینہ	۱۳۶، ۱۳۵	دیوان غالب (فارسی)
۶۵	رقص حیات (پرویز)		ڈ
۸۷	رہات عالمگیر (نجیب اشرف)	۱۱۰	ڈارلنگ (شار)
۷۲	رگ حیات (شفا)	۱۶۰	فلانزداد (ابسن)
۲۱۳	رگسودن (سنو)		ڈفرنٹ کچرل زونز ان انٹرا
۱۹۹	رموزہ بخود (اقبال)	۳۸۷	(لطیف)
۳۰	رنگ بست (امیر)	۱۹۳	رنگون کا پاشا (مسینہ)
۲۰۳	رنگیناں (کلیل)		ڈ
۳۱۳	روچہ تہذیب (سیدین)	۲۱۳	نقشے سے آفتاب (سنو)
۲۱۳	روحانی مطالعہ (سنو)	۱۰۷	وکر حسین (ذاکر حسین)
۷۰	روزگار فقیر (فقیر و حیدر علی)	۳۱۳	زمین انسانی کا ارتقاء (سیدین)
۲۹۰	روشنی (مصطفیٰ زیدی)		ر
۱۹۰	روزنامہ الرضوان (میداشکوہ)	۱۹۳	راجہ ہٹ (مسینہ)
۱۹۹	رونی کے خدا سے (راج)		رات کا بھولا اور دوسرے افسانے
۲۷۹	رہنمائے شاعری (افتقر)	۳۱۸	(سرور کی)
۸۷	رہنمائے صحت (نجیب اشرف)	۳۲۹	راز و نیاز (اشعر)
۱۰۷	ریاست (ذاکر حسین)	۵۰	راکھ تلے (شار)
۱۷۳	ریاض (اپنا، کراچی)	۲۱۲	رائس وایلی شتر (سنو)
۹۰	ریاض الاخبار	۳۱۳	رام کشاد سنو
۳۲۹	ریت اور جہاگ (اشعر)	۱۳۷	ربا حیات بابا طاہر عریان (مخلیب)
۲۹۳	ریڈ اسٹار اور جہاننا (انگریزی)	۱۷۵	رباعیات خیام (داقت)
۲۱۲	ریزہ نگ (سنو)	۳۲۹	رضانہ (اشعر)

۲۲	سدا بہار بھول (سدرشن)
۱۲۵	سندھ و طوٹ (الم)
۲۱۸	سراج ادواس کی شاعری (سردری)
۲۱۸	سراج سخن (سردری)
۲۶۵	سرخ بچے (آزاد)
۲۶۲	سرخ چین کے رہنا (آزاد)
۱۱۰	سرخ عاشقے (شاو)
۱۲۸	سرخ سویرا (مخدوم)
۱۶۳	سرتیاد احمد پاشا (حسینی)
۲۲۳	سرفراز (روزنامہ، لکھنؤ)
۱۱۰	سرقہ اور تواضع (شاو)
۲۳۲	سرائے سنگین (سنگین)
۲۶۶	سرد سردی (ناشاد)
۲۱۲	سری روپ کا دستور
۲۶۹	سری محل (افقر)
۷۱	سفرنامہ منشی امین چند
۱۲۵	سلسبیل (الم)
۲۸۵	سلسلۃ الذہب (شوکت)
۲۳۲	سلطان محمود غزنوی (حبیب)
۲۹۹	سلطنت (حیدر آباد)
	سمند کی جہان اور دوسرے افانے
۲۱۲	(منقود)
۱۱۰	سمندری شہزادی (شار)
۱۱۰	سنگم (شاو)
۱۳۲	سہرا حلقہ (ناظر)

۲۱۸	زبان اور علم زبان (سردری)
۲۲	زبان داغ (رفیق)
۲۱۲	زبان، زندگی اور تعلیم (سیدین)
۱۶۶	زبور ہم (اقبال)
۷۲	زخم محل (شفا)
۱۵۲	زفرین افانے (بان)
۲۱۲	زفری ناز (منقود)
۲۶۷، ۱۵۳	زبان (ماہنامہ، کراچی)
۲۱۰، ۲۰۹	زمیندار (روزنامہ، لاہور)
۲۶۰، ۲۵۸	زمینداری (تبیخ و تعلق، دیوبند)
۲۰	زنگاری بیگم (اخر)
۲۲	زہر بلا آب حیات (سدرشن)
	ص
۲۶۵	صاف ستارے (آزاد)
۵۹	صاف حیات (فرحت)
۲۶۷، ۱۲۷	صافی (ماہنامہ، دہلی و کراچی)
۶۰	صافی نامہ (فرحت)
۲۱۳	صاگر سنگیت (منقود)
۱۱۹	صید تیارہ (ناظم)
۲۶۵	پچ جھوٹ (آزاد)
۱۳۷	پچی کہانیاں (مخدوم)
۱۳۲	صاروں سے آگے (ناظر)
۲۶۱	صارہ چشت (منیا)
۲۷۲	صارہ بھری (دلی احمد علی پوری)

۲۱۳	شکشا (منقول)	۸۷	سوراج (نجیب اثرت)
۱۶۹	شکوہ (اقبال)	۲۱۲	سوز اقبال (منقول)
۱۰۸	شکشا (ذکر حسین)	۲۱۲	سوز وطن (منقول)
۴۸	شمشیر وطن (آفتاب)	۳۲	سوز سنگار (سدرشن)
۳۲۵	شعارات عظمیٰ (اختر تلمیہ)	۱۶۹	سیرۃ محمد رسول اللہؐ (محمداہل خان)
۲۹۰	شہر آئند (مصطفیٰ زیدی)	۱۷۲	سیرۃ محمد علی (دیس احمد حفیظ)
۳۲۹	شہناز (اشعر)		سیرۃ الحمید فی احوال سعید
۴۱۴	شہید وفا (تجدید)	۲۲۱	(فدائین)
۳۲۹	شیطان (اشعر)	۳۹۵	سیرۃ صواب (آزاد)
	ص	۱۵۲	سیاہ انجمن آبادی (ران)
۳۲۲	صافقت اسعد (تکین)		ش
۲۹۲	صحیفہ (تجاری، لاہور)	۷۳	شاعر زخون (شفا)
۲۸۹	صحیفہ خوشنویسان (شاعلی)	۳۹۸	شاعر راہنما (اگرہ و مکتی)
۱۵۵	صحیفہ مراز (ران)	۲۷۹	شام بہاریں (دیا)
۲۱۲	صنعت (منقول)	۱۱۰	شام گلشن سینا آیا (شاہ)
۲۰۴	صنم و صم (تکلیف)		شاہ انگین حفیظ جی اور ان کا کلام
۲۱۳	صیبا کے عالم (منقول)	۱۹۰	(عبدالشکور)
	ض	۲۰۰	شاہنشاہ اسلام (حفیظ)
۳۰۵	ضرب کلیم (اقبال)	۱۶۳	شاہدیکہ بہار آئی (حسین)
۱۹۰	ضروری باتیں (عبدالشکور)	۲۰۴	شبستان (تکلیف)
	ط	۱۸۲	شرارے (جامی)
۲۱۸	طبقات اکبری (نظام الدین)	۳۹	شروعی انجمن دیوبند (آفتاب)
۴۱۲	طلسم زندگی (بشیر احمد)	۳۲۵	شعر و ادب (اختر تلمیہ)
۲۱۲، ۲۱۱	طوائف نجم (منقول)	۲۱۲	شعری نکلے (منقول)
۳۱۷	طیلسانی (حیدر آباد)	۳۵	شعلہ آواد (سراج)

۳۰	فرنگ (خرد اثر)	ظ	ظریف کے ٹولے (۱۳۵)
۱۱۰	فریاد (شار)	۱۹۹	
۱۸۰	فضل الرحمن اسلامیہ کالج بریلی میگزین	ع	
۳۰۶	فلسفہ تعلیم (غلام الحسین)	۹۳	مثنیٰ نامہ (عراق)
ق		۳۰۹	حصہ دیدہ (ماہنامہ، میرٹھ)
۱۱۰	قاسمیں (شار)	۳۱۵	طوبی تصورات (اختر تلمیذی)
۳۹۰	قبائے ساز و مصطفیٰ (زیدی)	۹۱	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
۳۱۶	قدیم افسانے	۳۱۳	علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (سید بی)
۱۹۲، ۹۵، ۱۲۵	قرآن	۱۹۰	علی گڑھ میگزین
۱۳۵	قصائد قافانی	۳۲۹	عمر فاروق اعظم (اشعر)
۳۱۸	قصہ بشیر (منقح)	۳۲	عورت کی نسبت (سدا شن)
۳۱۳	قوی سیرت کی تشکیل (سید بی)	خ	
۲۹۳	قیامت کی بات (عابد)	۳۹۳، ۳۹۴	غالب (عبد اللطیف)
ک		۳۰۳	غالب (مہر)
۳۰۲	کارنامہ اسلام (بشیر احمد)	۳۵۲	غالب (اسٹیکلو پیڈیا، اخیر سروری)
۹۱	کارنامہ سروری، سرور الملک	۱۰	غالب اور اس کی شاعری (شار)
۳۰۰	کاروان: روش صدیقی	۳۹۳	غالب، دیوان (نسخہ، سید بی)
۵۲	کاروان ہند و ہند وار	۳۹۳	غالب، دیوان (نسخہ، عرش)
۱۹۳	کائناتوں میں پہل (حمین)	۱۰۱	غریب خانے تک (دعیم احمد جعفری)
۲۱۲	کائناتِ دل (منقح)	ف	
۱۹۳	کچھ جی نہیں (حمین)	۱۹۰	قافی: مبداءشکوں
۳۱۶	کرور و افسانہ (سروری)	۲۱۳	فادوس (منقح)
۲۵۹	کرن (اچانار، اتر آباد)	۳۱۶	فرانسیسی افسانے (عزیز احمد)
۳۵۹	کشیک کا فارسی ادب (طالب)	۳۰۹	فرویں معانی (افقر)
۳۱۸	کشیک کے دو ادیب (سروری)	۹۲	فرنگ آصفیہ (سید احمد)

۱۳	گیتا نجل منظوم (منقذ)	کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (سرودی)
۲۱۳	گیتا نجل نثر (منقذ)	۳۱۸
۲۱۳	گیت گودند (منقذ)	۱۸
	ل	کلام ملک (ملک)
۸۸	لغات گجری (ذیب اشرف)	۳۱۸
۱۱۰	لکار (شار)	کلیات سراج (سرودی)
۹۳	لغات (مراق)	۳۸۹
۲۱۳	لکھن کے کہا (منقذ)	کلیں (ہفتہ وار، حیدرآباد)
۱۹۹	لیا یا عاصمہ فرناط (تاج)	۱۱۹
۱۶۵	لیلی جمنوی شغری	کمال میں نلیل (ناطق)
	م	۲۱۳
۱۰۷	اڑکی ماسیات (خاکر حسین)	کنز الطالب، شرح دیوان غالب
	اوشل شیواور جہوری یوگرسا	۱۱۹
۲۹۳	آذان	(ناطق)
۱۵۵	اٹا (داز)	۱۲۵
۲۱۳	القی مارحو (منقذ)	کوثر و تسنیم (الم)
۲۱۶	الویکا گنی ستر (منقذ)	۱۶۳
۳۴۲، ۳۴۰	سابع تسکین (تسکین)	کوفہ (مصلح زیدی)
۳۵۰، ۳۴۹	سابع شوق (شافل)	۲۹۷
۳۹۳	عاس کلام غالب (بجنوری)	کیف سرودی (اشار)
۱۱۰	عادات غالب (شار)	م
۳۰۶، ۳۰۷	عرب فرل (دوش)	کھاسے امان (سین)
۷	حسن عظم (فیروز و حیدر علی)	۱۶۳
۳۰	مہود فرنی (علی بیاد خان)	۲۱۳
۳۷۹	نقیر سرختری حاجی دارت علی شاہ (نقیر)	۱۹۰
		گرام سدھار (عبد الشکور)
		۸۱
		علی گات (امین حنیف)
		۱۳۸
		گل تر (منقذ)
		۲۱۹
		مہستان (سندھ)
		۳۳۲
		عکودہ (تسکین)
		۳۸
		گودڑ کال (اکبری بیگم)
		۳۷۹
		گونڈہ و مرغ کزٹ
		۱۶۹
		گیتا (ترجمہ اہل خانہ)
		۱۲۵
		گیتا منظوم (الم)

معاشیات، مقصد و منہاج	۳۱۱، ۱۱۹	مفتی، امانت، لاہور
۱۰۷ (ذاکر حسین)	۲۱۲	مداد لکھنؤ، ملتان
۱۰۸ معاشیات قومی (ابن حسین)	۴۹	دریہ، لاہور
۱۲۵ معرکہ ننگر (الم)	۱۹۹	ڈیسمبر ۱۹۱۱، لاہور
۲۱۲ معروضات (مختار)	۲۷	نورجی، اور مشرق (نورجی)
۳۰ معین انسان (امانیت، لاہور)	۳۲۵	نورجی، لاہور (نورجی)
۳۷۹، ۳۷۵ مفید و کار (ہفتہ وار، لاہور)	۳۱۸	مراقب الاموال (شاہ عبداللہ)
۳۲۵ مقالات تلہری (نورجی)	۳۹۰، ۳۵۹	مراقب انکار، طالب
۸۷ مقدور و قدامت، عالمگیر (نجیب، لاہور)	۲۲۱	مراقب شہادت، لاہور
۲۱۹ مقدور و شعرو شاعری (حالی)	۲۵۳	مراقب غالب، لاہور
۲۲۲ کتابت بکر (تکین)	۳۰	مزایر، لاہور
۳۰۹ نکالات، اہل الکلام، عقلی (جعفری)	مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل	
۳۱۹ کتبہ، امانیت، لاہور	۲۱۲	(پیشہ ور)
۳۲۲ مکتوبات مرزا (تکین)	۳۸۷	مسلم لیگ، لاہور (لطیف)
۴۲۱ مناقب اولیائے قادریہ (حیات)	۱۳۷	مشرق پاکستان، لاہور، لاہور
۱۸۲ منزل کی طرف (جانی)	۳۶۸	مشورہ (آگرو)
۴۸ من مہینہ (آفتاب)	۲۷۲، ۲۷۱	مفتی، امانیت، لاہور
۱۹۹، ۱۹۳ موت کا رنگ (ناج)	۳۰۸	مفتی، اصلاح و ترقی (نورجی)
موت کی بیری، موت صدف	۱۳۴	مطالبہ انیس، لاہور
۲۹۰ (مصلحتی، لاہور)	۱۳۲	مطالبہ حالی، لاہور
۳۲۲ مولانا ابوالکلام آزاد (حبیب)	۱۳۳	مطالبہ شبلی، لاہور
۳۷۹ مولانا بیچ (ہفتہ وار، لاہور)	۳۰	مطالبہ غالب، لاہور
مولانا سوری کی اسلامی نظریہ سیاست	۱۳۲	مطالبہ وحدت، لاہور
۲۲۵ (نورجی)	۱۱۰	مطالبہ (شاہ)
۱۸ مہاجرات (ننگ)	۹	مصلح الاموال، لاہور

۲۷۹	نظر گاہ (افقر)	۲۱۸	مہتاب سخن (مردی)
۲۳۲	نظم و سخن ایران (حبیب)	۲۱۲	مہر مژدہ (منو)
۳۰	نغمہ سحرآلودی (اثر)	۲۴۲	مہات طار الدین غلی (حبیب)
۲۲۱	نغمہ ربانی (ضیا)	۱۱۰	میراکام نوینا (شاد)
۲۰۴	نغمہ فردوس (شکیل)	۱۱۰	میراقتب کلام (شاد)
۱۹۳	نقاد (ماہنامہ، آگرہ)	۲۱۲	میری یادداشتیں (منو)
۲۸۲	نقش آئندہ (باسط)	۱۹۳	میدگونی (مبین)
۱۳۷	نقش بدیع (مندیب)	<hr/>	
۲۵۵	نگار (ماہنامہ، کھنشو)	۲۸۱	نغمہ (ہفتہ وار)
۲۵۹	نوائے ادب (تماہی، بمبئی)	۲۱۲	نالا بیکس (منو)
۱۵۵	نوائے راز (راز)	۱۹۲	نادل کی تاریخ و تنقید (مبین)
۲۱۲	نوائے کفر (منو)	۷۲	نہج حیات (شفا)
۳۰	نوبادوں (اثر)	۲۰۹	نثر و نثر خیرآبادی (میل جعفری)
۱۹۳	نورتنہ (مبین)	۲۷	نجمہ (نذر تبار)
۲۸۱	نیا قدم (ہندی)	۱۹۳	نمایا کمارے (مبین)
۲۹۷	نیرنگ عشق (نہشت)	۲۸۱	نہیم (روزانہ)
۲۸۷	نیو ایر (ہفتہ وار، جید آباد)	۲۱۲	نقد ادب (منو)
<hr/>		۱۹۹	نقد و فکر (الک رام)
و		۱۶۶	نقد مرثیہ (الک و شاد)
واقعات و ادارہ حکومت دہلی		۲۲۰	نہیم سحر (جلیوں)
۲۵	(بشیر الدین احمد)	۲۱۲	نہیم مرثیہ (منو)
۱۹۲	والدین (تھو)	۱۳۷	نشا و رفته (مندیب)
۱۱۰	وجدان (شاد)	۱۸۲	نشا پ داہ (جامی)
۲۱۳	وجدان حافظ (منو)	۲۹	نصرت (بمبئی)
۲۱۲	وشتو ویتا (منو)	۱۱۹	نظریہ ناظم (ناظم)
۲۱۰	وطن (روزنامہ، دہلی)		

تذکرہ معاصرین

۳۴۴	ہندوستان اقبل تاریخ (حبیب)	۱۴۴	دلی القہر تحریک (آٹل)
	ہندوستان میں تعلیم کی اسیس نو تنظیم	۳۹	دیر چترانی (آفتاب)
۱۰۸	(ڈاکٹر حسین)	۵	
۳۹	ہندوستان سورما (آفتاب)	۹۵	ہزار داستان (ماہنامہ لاہور)
۲۴	ہندوؤں میں گورو (رفیق)	۲۹۲	پیشی آف فلاسفی
	می	۲۴۱	ہفت احمد (ضیا)
۱۸۲	یاد کی خوشبو (جامی)	۳۰	ہلاک قریب (اثر)
۱۰۳	یادگار غالب (مال)	۳۰	ہلال (روزنامہ بمبئی)
۱۹۰	یادانی میگدہ (جیدلشکور)	۱۹۴	ہمارا گائون (حسینی)
۲۱۳	یوگ سار (منو)	۱۹۴	ہماری اردو شاعری (حسینی)
		۳۱۲۰	ہمایوں (ماہنامہ لاہور)

پروسی کے خطوط



مصنف: میرزا اسد اللہ خاں

صفحات: 216

قیمت: 85 روپے

تعلیم و تربیت اور والدین



مصنف: میرزا اسد اللہ خاں

صفحات: 176

قیمت: 68 روپے

راجگ نبر



مصنف: شیخ فرحت

صفحات: 96

قیمت: 43 روپے

گودا بن



مصنف: پریم چند

صفحات: 464

قیمت: 110 روپے

غالب اردو کا نام کا انتخاب



مصنف: محمد حبیب

صفحات: 132

قیمت: 59 روپے

مسلمان اور عصری مسائل



مصنف: سید عابد حسین

صفحات: 168

قیمت: 67 روپے

اپنے دکھ بھگتے دو



مصنف: راجندر سنگھ پدی

صفحات: 240

قیمت: 70 روپے

معمارانِ جامعہ



مصنف: ظفر احمد لطافتی

صفحات: 288

قیمت: 95 روپے

₹ 136/-

ISBN : 978-81-7587-658-3

